تاریخ نظم و نثر اردو

مؤلف
آغا محمد باقر

تاریخ نظم و نثر اردو

مؤلفہ

آغا محمد باقر ایم۔ اے، ایم او ایل، بی۔ ٹی

بفرمایش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ

لاہور

سنہ ۱۹۳۸ء

برانچ کوآپریٹیو کیپیٹل پریس لاہور میں باہتمام شیخ ظہور الدین منیجر طبع ہوئی

A91 ط 319
ب 11 ط
7645

عنونہ

مَیں اس ادبی خدمت کو اپنے قابلِ فخر اُستاد زبان اُردو کے مایۂ ناز محقّق اور پنجاب یونیورسٹی کے لائق پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے نام نامی سے نہایت ادب کے ساتھ معنون کرتا ہوں!

محمد باقر

فہرست مضامین ـــــ نظم اردو

مضمون	صفحہ

باب (۸)

اساتذۂ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

باب (۹)

دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا

واجد علیشاہ اختر کا زمانہ

باب (۱۰)

اردو مرثیہ اور مرثیہ گویان لکھنؤ

مقدّمہ

عرضِ حال میرے محترم شیخ مبارک علی صاحب شمالی ہندوستان میں علوم مشرقی کی کتابوں کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے تاجر ہیں۔ وہ کتابوں کی تجارت محض تجارت کی غرض سے نہیں کرتے۔ بلکہ ان کو اچھی اچھی اور مفید کتابیں تصنیف و تالیف کرانے اور چھپوانے کا دلی شوق ہے۔ اور یقیناً ان کی تجارتی کامیابی کا راز اسی نیک نیتی میں مضمر ہے۔ ان کا خاص احسان ادب اردو پر یہ بھی ہے کہ انہوں نے خوبصورت لکھائی اور چھپائی کا عام مذاق پیدا کر دیا ہے۔

جب سے تاریخ ادب اُردو علوم مشرقیہ کے امتحانات کے نصاب میں داخل ہوئی تھی۔ شیخ صاحب اِس فکر میں تھے۔ کہ اس گراں قیمت اور ضخیم کتاب کی تلخیص کا کام کسی کے سُپرد کر دیں۔ اِتفاق سے اِنہی دنوں میں تعلیم سے فارغ ہُوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کام میرے سُپرد کر دیا۔ شیخ صاحب موصوف کے احسانات مُجھ پر اس قدر ہیں۔ کہ مَیں ان کے احکام کو بجا لانا باعث سعادت سمجھتا ہوں۔ ورنہ شاید مَیں اتنی ضخیم تاریخ کو اختصار[1] سے لکھنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتا۔ پھر انہوں نے یہ سمجھا کر میری اور بھی ہمّت بندھائی۔ کہ یہ کام کوئی ادنیٰ درجے کا کام نہیں ہے۔

[1] اس کتاب کے تنقید و تبصرہ کو ذاتی واقفیت اور مختلف کتب پر مبنی سمجھئے ۱۲

بلکہ دُنیا کی مشہور اور ضخیم کتابوں کو بڑے بڑے مصنفین نے اختصار سے لکھا ہے۔ پھر ایک مُدت سے مجھے یہ بھی خیال تھا۔ کہ آبحیات پر جس بیدردی سے اعتراضات کئے جا رہے ہیں۔ ان کا تسلی بخش جواب دینا مجھ پر فرض ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کام میں مجھے ایک حد تک ان اعتراضات کے جواب دینے کا نہایت عمدہ موقع مل جائیگا۔ بہرحال میں نے شیخ صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کام کو جلد کر دونگا۔

اتنی بڑی تاریخ کو تقریباً ایک چوتھائی حصے میں اس طرح قلمبند کرنا کہ کوئی ضروری تو کیا غیر ضروری چیز بھی چھوٹنے نہ پائے اور انداز بیان بھی اس قدر آسان رہے کہ ہر مشکل مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لئے اس کی تکمیل میں اندازے سے زیادہ تاخیر ہو گئی۔ میری لگاتار کوششوں سے آج یہ کتاب ختم ہو گئی ہے۔ اور اب میں بلاخوف تردید کہ سکتا ہوں کہ جس ارادے سے میں نے اس کام کو شروع کیا تھا وہ اس سے بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا ہے بہرحال سطور ذیل میں ہم تاریخ ادب اُردو کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ہسٹری آف اُردو لٹریچر یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ رام بابو سکسینا صاحب نے اسکو تصنیف کیا ہے۔ سکسینا صاحب ایم۔ اے ایل۔ ایل بی ہیں اور یوپی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر سرفراز ہیں۔ سب سے پہلے تو یہی تعجب کی بات ہے کہ سکسینا صاحب کو اپنے منصبی فرائض کی بجاآوری اور دُنیا داری کے دھندوں سے اتنی فُرصت کس طرح مل گئی کہ انہوں نے ایسی معرکتہ الآرا کتاب لکھنے کو قلم اُٹھایا۔ ان کی یہ تصنیف صاف ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ ادب اُردو کے سچے دلدادہ تھے اور اب اس کے حقیقی محسن کہلانے کے مستحق ہیں۔ تاریخ اُردو انگریزی میں نہ ہونے سے اُردو زبان کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ اگرچہ ساری دُنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ کہ ہندوستان میں اُردو ایک ایسی زبان ہے۔ جس سے ہندوستان کے ہر گوشے میں کام چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن اُردو زبان کی تاریخ انگریزی میں نہ ہونے سے

انگریزی جاننے والوں میں یہ خیال کسی قدر مستحکم ہو چلا تھا کہ اُردو کی کوئی خاص تاریخ نہیں ہے اور نہ وہ کوئی علمی ادبی زبان ہے۔ الحمدللہ سکسینا صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اس کمی کو پُورا کیا اور اُردو کے دامن پر سے یہ دھبہ دھو ڈالا کہ اس کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں ہے۔ ایک ہندو بھائی کے اُردو کی تاریخ لکھنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو سے ہندوؤں کو بھی اُسقدر محبت ہے جس قدر مسلمانوں کو ہے۔ اس کتاب کو انگریزی میں لکھنے سے زیادہ تر مدعا یہ بھی تھا کہ آئی۔ سی۔ ایس وغیرہ کے طلباء کی یہ شکایت دُور ہو جائے کہ زبان اُردو کی تاریخ انگریزی میں انگریزی اُصولوں کے مطابق لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اب اُردو زبان کے جاننے والوں کو سیکسینا صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ باوجود عدیم الفرصتی کے انہوں نے اس ضرورت کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کر دیا۔

سیکسینا کی تاریخ اُردو اور دوسرے تذکرے

(۱) قدیم تذکروں میں محض انہی شعرا کے حالات ملتے ہیں۔ جو مصنفین کو آسانی سے میسر آ گئے تھے۔ ان میں کچھ زیادہ تحقیق سے بھی کام نہیں لیا گیا۔ مختصر حالات قلمبند کرنے کے بعد اکثر کلام کا نمونہ لکھ کر ان پر سطحی طور پر رائے زنی بھی کی گئی ہے۔

(۲) دوسرے دور کے تذکرہ نویسوں میں سب سے پہلے مولانا آزاد نے زبان اُردو کی عہد بعہد کی ترقیوں اور تبدیلیوں کو آبحیات میں زمانہ حال کی طرز پر لکھا۔ اور گہری نظروں سے شاعروں کے کلام پر تنقیدیں کیں۔ مرزا محمد عسکری کے خیال کے مطابق مولانا کی رنگین عبارت سے کتاب تو ایسی دلچسپ ہو گئی کہ ایک دفعہ شروع کر کے بند کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن اس اندازِ بیان سے کتاب کی مورخانہ حیثیت میں فرق آ گیا۔ بالفعل آبحیات پر بڑی بیدردی سے اعتراضات کئے جا رہے ہیں جو لازمی نتیجہ یا خمیازہ اس غلطی کا ہے۔ جو مصنف مبرور نے رنگین عبارت اختیار کرنے میں کی تھی۔

الحمدللہ کہ پنجاب یونیورسٹی نے تذکرہ میر قاسم مولانا آزاد کی لائبریری سے نکال کر میرے قابل فخر اُستاد پروفیسر شیرانی صاحب کی زیرِ نگرانی طبع کرا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مہتم بالشان

تذکرہ ایسے فاسد خیالات کو حرف غلط کی طرح محو کر دیگا۔ اور ایک دفعہ پھر آبحیات پہلی سی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی بلکہ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے مولانا مرحوم کی صناعت کی اور بھی داد دینگے کہ باوجود اتنی رنگین عبارت کے تاریخی واقعات میں کسی قسم کی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی۔

آبحیات کے بعد عام طور پر جس قدر بھی تذکرے لکھے گئے ہیں ان کا مدعا اصل میں آبحیات کی مخالفت تھا۔ اس کی وجہ چاہے کچھ ہی ہو۔ لیکن باوجود اس قدر مخالفت کے آبِ حیات کا ہر شخص مداح رہا ہے۔ ہم مختصراً ان اعتراضات کا سطور ذیل میں اعادہ کرتے ہیں۔ جو عام طور پر آبحیات پر کئے جاتے ہیں۔

(۱) نظم و نثر اُردو کی ابتدا بجائے دکن کے پنجاب میں ہوئی۔ لیکن سیکسینا صاحب مولانا آزاد کے ہم خیال ہیں۔

(۲) میر تقی پر غیر معمولی طور پر بد دماغی کا الزام لگایا گیا ہے۔ اور ان کے تذکرۃ الشعراء پر بہت سخت تنقید کی ہے۔

(۳) انشا کی آخری تین حالتوں کا جو نقشہ مولانا نے کھینچا ہے۔ اس سے جزوی طور پر اختلاف ہے۔

(۴) اپنے اُستاد ذوق کو مرزا غالب سے بہت بڑھایا ہے۔

(۵) عبارت کو رنگین اور دلچسپ بنانے کے لئے واقعات میں بہت کچھ رنگ آمیزی کی گئی ہے۔

(۳) تذکرہ نویسوں کے تیسرے دور میں لالہ سری رام دہلوی کا خمخانۂ جاوید۔ چار ضخیم جلدوں میں محض شین منقوطہ تک پہنچا ہے۔ فاضل مصنّف نے اس میں یہ التزام رکھا ہے۔ کہ ادنے سے ادنے شاعر کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور کسی کے کلام پر گہری نظروں سے تنقید بھی نہیں کی۔ بلکہ اچھے تو اچھے ہی ہیں انہوں نے بُروں کو بھی بُرا نہیں کہا۔ بہر حال بعد کے تذکرہ نویس اس سے

بہت کچھ حاصل کر چکے ہیں۔ اور کرتے رہینگے۔ اس تذکرہ کو اگر شعرا کا قاموس اعظم یعنی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

خمخانۂ جاوید کے ساتھ ہی تذکرہ گل رعنا، شعر الہند اور سیر المصنّفین بھی قابل ذکر ہیں۔ گل رعنا میں مولٰنا آزاد کی غلط بیانیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن آبحیات کا ماخذ دریافت ہونے سے اس کی حیثیت معاندانہ رہ گئی ہے۔ اسی طرح شعر الہند کی ژولیدہ بیانی نے اس کو حدود معیّنہ سے نکال دیا ہے۔ سیر المصنّفین میں محض نثاروں کے حالات ہیں یہ سب تذکرے ایک نہ ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن کسی حد تک مفید ضرور ہیں۔

سکسینا صاحب کی تصنیف کی بڑی تخگی یہی ہے کہ وہ انفرادی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ ادب اُردو کے پُورے موضوع پر حاوی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ مصنّف موصوف نے بڑے وسیع مطالعہ کے بعد اس کتاب پر قلم اُٹھایا ہے۔ اور ان تمام ضرورتوں کو بہت کامرانی کے ساتھ ایک کتاب میں پُورا کر دیا ہے۔ جو پہلے مختلف تذکرے الگ الگ پُوری کرتے ہیں۔ سکسینا صاحب نے اکثر خود بھی اپنی منصفانہ رائے کا نہایت بے باکانہ اظہار کیا ہے! ور ہر فیصلہ طلب بات کو گہری نظروں سے جانچا ہے۔

خمخانۂ جاوید کے بعد غالباً یہ دوسرا تذکرۃ الشعرا ہے جو ایک ہندو بھائی کے قلم سے نکلا ہے۔ علاوہ اور ضرورتوں کو پُورا کرنے کے یہ تصنیف انگریزی داں دُنیا پر یہ بھی ثابت کر دے گی۔ کہ ہندوستان کی زندہ زبانوں میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندو مسلمانوں کو یکساں محبُوب و مرغوب ہے۔ یہ کتاب بالکل انگریزی ادبی تاریخوں کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ ہر مضمون کو مختلف پیراگرافوں میں الگ الگ بیان کیا ہے۔ اور حاشیہ پر ان کے موضوع کے عنوانات بھی قائم کر دیئے ہیں۔ تاکہ ڈھونڈھنے والے کو ہر مبحث بہ آسانی مل جائے۔ میں نے بھی اس اُصول کو اپنی کتاب میں قائم رکھا ہے۔ تاکہ ناظرین کو کسی قسم کی دقت نہ اُٹھانی پڑے۔

سکیسینا صاحب کی تاریخ انگریزی دان طبقے میں بیحد مقبول ہوئی۔ لیکن وہ اُردو خوان جو انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی قابل شخص اس کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرے تاکہ وہ بھی اس جامع اور مانع کتاب سے مستفید ہوں۔ آخر کار مرزا محمد عسکری صاحب سابق ہیڈ مترجم گورنمنٹ آف انڈیا نے اس مشکل اور اہم کام کا بیڑا اُٹھایا اور حق یہ ہے کہ انہوں نے قابل مبارکباد کامیابی کے ساتھ یہ کام اختتام کو پہنچایا۔ واقعی یہ کام ان جیسے تجربہ کار مترجم اور ادب اُردو سے کماحقہ واقف شخص کا تھا۔ اس کتاب کو ترجمہ کرنے میں انہیں بہت سی دقتوں کا سامنا ہوا جن کا مختصراً ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) اُردو کے قدیم تذکرے فارسی میں ہیں۔ بعد کے تذکرہ نویسوں نے ان کو اُردو میں لیا اب سکیسینا صاحب نے اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس تغیّر و تبدل میں اصل میں اور آخری ترجمے میں کسی قدر اختلاف ہوگیا تھا۔ لیکن فاضل مترجّم نے ترجمہ کرتے وقت ایسے مشکوک بیانات کو اصل تذکروں سے مقابلہ کرکے درست کردیا۔

(۲) جہاں کہیں ایک مضمون کا بار بار حوالہ آیا ہے فاضل مترجم نے ہر بار اس کو نئے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ تاکہ کتاب کی دلچسپی میں فرق نہ آئے۔

(۳) جن حوالوں کو انگریزی میں کنایتاً بیان کیا گیا ہے۔ ترجمہ میں اس کو پوری وضاحت سے بیان کردیا ہے تاکہ پڑھنے والا تشنہ نہ رہے۔

(۴) انگریزی کتاب میں نمونۂ کلام کو نظر انداز کردیا گیا تھا۔ لیکن اُردو میں اس کمی کو پورا کردیا گیا ہے جس سے کتاب کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے۔

(۵) اگر کسی اور زبان میں تنقید و تبصرہ میں مسامحت اور ملائمت کی ضرورت نہ بھی ہو تب بھی اُردو میں اس کی بہت ضرورت ہے اس لئے اکثر اس ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

(۶) بعض جگہ مترجم اور مصنف میں اختلاف الرائے تھا۔ مترجم نے اس کو کتاب کے حاشیہ پر نہایت آزادی سے ظاہر کر دیا ہے۔

(۷) عبارت اس قدر سادہ اور سلیس رکھی گئی ہے کہ معمولی استعداد کا طالب علم بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ انداز بیان سے کوئی شخص یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ میں کسی کتاب کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔ پھر اس پر طرّہ یہ ہے مترجم موصوف نے بول بول کر مولانا عبدالباری آسی سے ترجمہ لکھوایا ہے۔

(۸) آخر میں انگریزی کتابوں کی طرح انڈکس بھی شامل ہے۔ جس کی مدد سے مذکورات کا آسانی سے پتہ چل سکتا ہے۔ اور یہ اردو کی تاریخ کے لئے نئی چیز ہے۔

(۹) شعرا اور نثاروں کی تصویریں بھی فراہم کر کے شامل کر دی گئی ہیں جن سے کتاب پڑھنے والے کی دلچسپی اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے۔

اصل اور ترجمہ پر اعتراضات (۱) واقعات اور حادثات کے سنین کہیں ہجری ہیں کہیں عیسوی ہیں اور ایک آدھ جگہ سمت کا سن بھی ملتا ہے۔ اس سے پڑھنے والا وقت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ افسوس ہے کہ فاضل مترجم نے بھی اس کمی کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔

(۲) بعض جگہ سکسینا صاحب کے بیانات میں اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی اور سرشار کے حالات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

(۳) اصل مصنّف نے خود زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا۔ اکثر دوسروں کے بیانات اپنی طرف سے نقل کر دیئے ہیں اور جہاں کہیں خود دست اندازی کی ہے اکثر وہاں ٹھوکر بھی کھائی ہے۔ میں نے قابل اعتراضات بیانات خاص طور پر سکسینا صاحب کا نام لے کر نقل کئے ہیں۔ اور اگر ضرورت سمجھی ہے۔ تو ان کے جوابات بھی ساتھ ہی لکھ دیئے ہیں۔

(۴) رطب و یابس اور واقعات کا اعادہ بہت کثرت سے ہے۔ یہ عیوب[1] زیادہ تر

---

[1] ہماری تاریخ اس عیب سے پاک ہے ۱۲

ترجمے میں آگر بڑھے ہیں۔

(۵) مصنف نے ثابت کیا ہے۔ کہ اُردو کا اصل گہوارہ دکن ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے ۹۵ھ تک کی دکنی تصانیف کا حوالہ دیا ہے۔ شاید مترجم اور مصنف صاحبان کی نظر سے پروفیسر شیرانی صاحب کی معرکتہ آلآرا تصنیف "پنجاب میں اُردو" نہیں گذری جس میں پروفیسر صاحب نے سنہ تک کی تصانیف اُردو دریافت کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ اُردو کا اصلی مرکز پنجاب تھا۔

(۶) بعض بیانات کے بار بار اعادہ اور آزادانہ ترجمہ سے کتاب بے حد ضخیم ہو گئی ہے۔

فراشخانہ دہلی

۹ر فروری ۱۹۳۲ء

محمد باقر

باب ۱

اُردو اور اس کی اصل

اُردو | اُردو کو فارسی کی شاخ اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد فارسی داں حملہ آوروں کے لشکروں اور دارالخلافوں میں پڑی ہے۔ نیز اس میں فارسی الفاظ بکثرت ہیں۔ اور اس کی شاعری کی بحریں اور رسم الخط بھی فارسی ہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبان اُردو اس بھاشا کی شاخ ہے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اور اس کا تعلق براہ راست شورسینی پراکرت سے تھا۔ گویا یہی بھاشا اُردو کا اصلی ماخذ سمجھی جاسکتی ہے۔

زبان اُردو کی صرف و نحو۔ محاورات اور بکثرت ہندی الفاظ اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ یہ زبان ہندی سے بنی ہے۔ پس میر امن اور قدیم اُردو نثاروں کی طرح یہ سمجھنا کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دارالسلطنت اور اُردوے بادشاہ سے زبان اُردو کے نشوونما کو بس اسی قدر تعلق تھا کہ اس کا نام اُردو ہو گیا۔

چونکہ اُردو میں ہنوز پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی اس لئے اور زبانوں کی طرح اجنبی الفاظ و محاورات کو قبول کر لینے کا مادہ اسمیں بھی موجود تھا اسی لئے فارسی کے نرم و ملائم الفاظ کو اس نے جذب کر لیا۔

ہندوستانی | انگریزی تقلید میں اُردو کو ہندوستانی کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس لفظ میں مشرقی اور مغربی ہندی اور راجستانی وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح برج بھاشا کو مولانا آزاد[1] کے خیال کے مطابق اُردو کا ماخذ قرار دینا بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ برج بھاشا مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ جو متھرا کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اتفاق سے وہ دہلی کی بھاشا سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔

[1] مولانا آزاد کا نظریہ قدیم زمانہ کی تحقیق پر مبنی ہے اور سکسینا بابو کی قیاس آرائی ہے ۱۲

اُردو ہندی کا تعلق اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دلّی کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی شاخ سمجھنا چاہئے اور مغربی ہندی شور سینی پراکرت سے پیدا ہوئی ہے اور دیگر شاخیں برج بھاشا، قنوجی، اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں رائج تھی۔ اسکی شاخیں ہیں مگر زمانہ حال کی اعلیٰ ہندی اُردو سے اس طرح پیدا ہوئی کہ فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیئے گئے۔ گویا اُردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں۔ ان دونوں میں اگر کچھ فرق ہے تو نشو ونما کے طریقہ میں ہے۔ یعنی اُردو کو مسلمانوں نے پرورش کیا ہے۔ اس لئے اس میں فارسی عربی الفاظ کی کثرت ہے اور ہندی ہندوؤں کے ہاتھوں میں پلی بڑھی ہے اس لئے اس میں سنسکرت الفاظ بکثرت ہیں۔

زبان وادب اُردو پر فارسی کا احسان جوں جوں اُردو ادبی زبان بنتی گئی اس میں فارسی عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ فارسی الفاظ کو ان کی شیرینی کی وجہ سے مصنفین نے اختیار کیا۔ اور اپنی کتابوں کو اسکی آمیزش سے جدت بخشی۔ اس کے ساتھ ہی فارسی رسم الخط بھی رائج ہو گیا۔ کیونکہ فارسی الفاظ ہندی خط میں آسانی اور صحت کیساتھ نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ ادھر اُردو شاعری بھی فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔ فارسی بحریں۔ مضامین۔ طرز بیان۔ تخیلات۔ تلمیحات۔ محاورات اور تمثیلات فارسی سے لے لی گئیں۔ اُردو کا عروض بھی فارسی کے زیر اثر آگیا۔ ادھر نثر پر بھی انقلاب گزرا۔ فارسی نثر جیسی عبارت کی رنگینی۔ الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی کی اُردو نثر میں بھی نقل ہونے لگی۔ الغرض فارسی زبان اُردو پر اس قدر غالب آئی کہ اُردو کی ابتدائی شان کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اُردو کی صرف ونحو تک فارسی کی طرز پر لکھی جانے لگیں۔

اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی کثرت کے اسباب چونکہ مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے تھے اس لئے ان کی فارسی شاہی زبان بن گئی۔ اور دیسی زبان خادمہ کی طرح اس کے محاورات اور طرز ادا کا تتبع کرنے لگی۔ فارسی کو جدید چیز سمجھ کر لوگوں نے نہایت شوق سے اس کے جدید الفاظ اور محاورات سیکھنے شروع کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان محض دیہات میں باقی رہ گئی۔ اسی لئے

قدیم ہندی شاعروں کے کلام میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ نیز دیسی زبان کی کم وسعتی بھی اُردو کی ترقی کا باعث ہوئی۔ غرض ہندی کو نئے الفاظ اور خیالات کو لفظ بہ لفظ قبول کرنا پڑا۔ کیونکہ اب مسلمان برخلاف سابق ہندوستان پر مستقل طور پر حکومت کرنے کے لئے آئے اور مالِ غنیمت لے کر واپس نہیں گئے۔

جب دہلی پایۂ تخت قرار پایا تو اصل باشندوں اور نو وارد سپاہیوں میں میل جول پیدا ہوا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ سیکھے۔ ظاہر ہے کہ فاتح کا مفتوح پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس لئے دیسی زبان میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں۔ مسلمانوں کے اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ دیسی زبان پر فارسی کا اثر بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اکبر کے عہد میں ایک[1] ہندو وزیر مال کی تجویز سے حکم ہوا کہ سرکاری ملازم کو فارسی جاننا ضروری ہے۔ اس سے فارسی کا اثر اور بھی بڑھ گیا۔ لوگ فارسی عربی اور ترکی الفاظ شوق سے بولنے لگے۔ کیونکہ وہ خوش آہنگ اور زوردار ہوتے تھے۔ نیز اُن سے بولنے والے کی علمیت ظاہر ہوتی تھی۔ پھر فارسی دانی سے سرکاری ملازمتیں بھی آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اور تقرب شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔

فارسی الفاظ کی کثرت کے اسباب

(۱) فاتح مسلمان اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے لئے سنسکرت اور دیسی زبان کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس لئے بجنسہٖ ہی لفظ دیسی زبان میں داخل ہو گئے۔

(۲) فارسی فاتح قوم کی زبان ہونے کی وجہ سے دیسی زبان پر غالب آ گئی۔

(۳) فارسی شاندار اور شیریں الفاظ کی وجہ سے رزم بزم اور حسن و عشق کے افسانوں کے لئے قدرتاً زیادہ موزوں تھی اس لئے دیسی زبان خود بخود پیچھے ہٹ گئی۔

(۴) فاتح اور مفتوح کا میل جول بڑھنے سے ایک ایسی مخلوط زبان وجود میں آ گئی جس میں فاتح قوم کی زبان کے الفاظ زیادہ تھے۔ کیونکہ مفتوح فاتح قوم کے الفاظ بول کر ان کو خوش کرنا

[1] راجہ ٹوڈرمل

چاہتے تھے۔

(۵) اظہار قابلیت کے لئے بھی فارسی الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔

(۶) اُردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی دانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے اُردو ادب کی نشوونما بالکل فارسی کی روش پر ہوئی۔ اور فارسی الفاظ محاورات اور ترکیبوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اُردو میں آگیا۔ ان اثرات سے اگرچہ اُردو ایک مستقل زبان بن گئی لیکن وہ خوبیاں جن سے اس کی ابتدا ہوئی تھی تقریباً فنا ہو گئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اُردو پر اثر

فارسی کی طرح یورپ کی زبانیں بھی اُردو پر خوب اثر انداز ہوئیں۔ پُرتگالی اور انگریزی کا اثر بہت کافی پڑا۔ البتہ ڈچ اور فرانسیسی کے اثرات بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ ۱۵۴۸ء میں ہندوستان کی مشہور بندرگاہوں پر پُرتگالی قابض تھے۔ وہ اندرون ہند میں تجارت اور تبلیغ بھی کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی زبان اہل یورپ اور ہندوستانیوں کے درمیان گفتگو کا ذریعہ بن گئی تھی۔ چنانچہ بنگلہ، مرہٹی، اسامی، اڑیا اور اُردو پر بھی ان کا خوب اثر پڑا۔ پُرتگالی الفاظ اپنے مُشکل تلفظ کی وجہ سے دیسی زبانوں میں اپنی اصلی حالت میں نہیں رہے۔ لیکن ویسے بکثرت ملیں گے۔ مثلاً بسکٹ۔ پپیتا۔ تمباکو۔ ترنج۔ چائے۔ گوبھی۔ الماری۔ ارغنون۔ بالٹی۔ بوتل۔ میز۔ تولیہ۔ پستول۔ پادری۔ گرجا۔ قمیص۔ سایہ۔ کاج۔ آیا۔ چھاپہ۔ نیلام۔ کمرہ۔ روپیہ۔ مستری وغیرہ۔

زبان انگریزی نے بھی بہت سے ایسے الفاظ کا اُردو میں اضافہ کیا جن کے لئے کوئی دوسرا لفظ اُردو کے پاس نہیں تھا۔

نکتہ

حق یہ ہے کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل اور خارج کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اُردو میں وہ الفاظ ضرور داخل کرنے چاہئیں جن کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکتا لیکن یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ اس سے میل کھائیں۔ اسی طرح اُردو ہندوستان کی واحد زبان بن سکتی ہے۔

نثر اور نظم کی زبان

ہر زبان کی نظم و نثر کی زبان میں فرق ہُوا کرتا ہے۔ نظم میں متانت شان اور

سنجیدگی پیدا کرنے کے لئے عام طور پر ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے جو بول چال میں آیا کرتے ہیں۔ اسی لئے فارسی الفاظ اُردو نظم میں بکثرت شامل کر دیئے گئے۔ اسی طرح نثر بھی مقفیٰ پسند کی جاتی تھی۔ جس میں بیحد تصنع ہوتا تھا۔ لیکن غالب اور سرسیّد کے زمانے سے اس طرز نے پلٹا کھایا۔ مغربی تعلیم کے اثر سے پُرانا رنگ بدل گیا۔ اور بجائے رنگین اور مقفیٰ عبارت کے سادہ نثر پسند کی جانے لگی۔ کیونکہ عملی دُنیا میں سادے اور زوردار الفاظ کی ضرورت تھی۔ آجکل اگرچہ لوگ پیچیدہ فارسی بندشوں سے گریز کرتے ہیں لیکن پھر بھی فارسی الفاظ بکثرت استعمال میں آتے ہیں۔ نظم میں اب بھی فارسی کا عمل دخل بہت وسیع ہے۔ پھر بھی شعرا آجکل نظم میں ہندی الفاظ شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ مگر اسی حد تک۔ کہ وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

نظم میں عام طور پر لفاظی کی جگہ سادگی بے تکلفی اور صفائی پسند کی جاتی ہے۔ سکینا صاحب کے خیال کے مطابق اہل ادب کو فارسی ترکیبوں اور بندشوں کی آمیزش کو کم کرنا چاہیئے۔ نیز ان کے نزدیک نظم و نثر کی عبارت میں کوئی اُصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے[1]۔

ادبی اُردو تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے جدّت اور شان دکھانے کے لئے لکھتے وقت سادہ فقرے فارسی ترکیبوں سے بدل جاتے ہیں۔ قاعدہ ہے زبان کی ابتدا کے وقت دوسری زبانوں کے الفاظ اور بندشوں کو جذب کر لینے کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ یہی حالت اُردو کی تھی۔ اس نے ہر زبان کے الفاظ اپنے میں جذب کر لئے۔ دور اوّل کے شعرا کا کلام دیکھئے آدھی اُردو اور آدھی فارسی ہے۔ آہستہ آہستہ غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اُردو میں اس طرح مل گئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو ہیں۔ اور اب ان کو نکالنا ایک عبث کوشش ہے۔

زبان اُردو کے قدیم نام قدیم انگریز مورخوں نے اُردو کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کیا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے لاطینی زبان میں اس کو "لنگوا اندوستانی کا" لکھا ہے۔ اس سے پہلے انگریز مورّخ اس کو "مورز" کہتے تھے۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں اُردو کو سب سے پہلے ہندوستانی کہا ہے۔ اور اس وقت سے یہ لفظ رائج ہے۔ اگرچہ اس کا پتہ بعض

[1] سکینہ کا یہ نظریہ قابل تسلیم نہیں ۱۲

قدیم کتابوں میں ۱۶۱۶ء تک ملتا ہے۔ شاہجہان نے اس کو "اُردوئے معلیٰ" کا خطاب اُسوقت دیا تھا۔ جب وہ ادبی خدمات اچھی طرح انجام دے سکتی تھی۔ اس کو "ریختہ" جس میں فارسی الفاظ بکثرت ہوں، بعد کے مصنّفین نے کہا کہ ادبی زبان اور عام زبان میں امتیاز ہو سکے۔ ابتدا میں نظم کے متعلق یہی لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مگر میر اور مصحفی کے زمانہ سے اُردو کو ہندی کہنے لگے۔

اُردو کا رسم الخط اُردو کے حروف تہجّی فارسی اور عربی کی طرح ہیں۔ البتہ ہندوستان کی مخصوص آوازوں کا ان میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ٹھ۔ ڈھ۔ ڑھ۔ ٹ۔ ڑ۔ ڈ۔

نظم اُردو نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی عروض کے تابع ہے۔ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروف علّت کی آوازیں کھینچ کر پڑھی جاتی ہیں۔ اور اشباع کہلاتی ہیں۔ نظم میں ردیف اور قافیہ لازمی ہے۔ اُنیس بحریں مروج ہیں جن میں سے بعض میں ایسی ترمیم ہوئی ہے کہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لئے جو خاص ارکان قدما نے مقرر کئے تھے ان کے تغیر و تبدل سے مختلف بحریں بنتی ہیں۔ تقطیع کے خاص قاعدے ہیں۔ جو حروف تحریر میں آتے ہیں لیکن پڑھے نہیں جاتے۔ وہ تقطیع میں شمار نہیں ہوتے۔ الف ممدودہ جب لفظ کے شروع میں آتا ہے تو دو حروف کے برابر ہوتا ہے۔ اور اضافت جب کھینچ کے پڑھی جاتی ہے تو ایک حرف کے برابر ہوتی ہے۔ جن الفاظ سے تقطیع کی جاتی ہے۔ رکن کہلاتے ہیں۔ نیز پورے شعر کو بیت اور نصف کو مصرعہ کہتے ہیں۔

نظم کی قسمیں (۱ و ۲) **غزل اور قصیدہ**۔ ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہے بحور اور قافیہ ردیف کی پابندی دونوں میں یکساں ہے۔ غزل کا رنگ عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اور تعداد اشعار پانچ سے بارہ تک ہوتی ہے۔ قصیدہ میں عام طور پر مدح کا مضمون ہوتا ہے۔ کبھی نصیحت آمیز اور فلسفیانہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ تعداد اشعار کم از کم پچیس اور زیادہ سے زیادہ ایکسو ستر ہے لیکن اس کی پابندی کوئی نہیں کرتا۔ قصیدے اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر

جس میں شاعر تخلص نظم کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔

(۳) **قطعہ**۔ اس کے لغوی معنی ٹکڑا ہیں۔ اس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصہ سمجھنا چاہیئے تعداد اشعار کم از کم دو۔ اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ پہلے دو مصرعے ہم قافیہ ہونے ضروری نہیں لیکن قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔ اس میں اکثر پند و نصائح کے مضمون مسلسل باندھتے ہیں۔ اور مطلب پورا ختم کرتے ہیں۔

(۴) **رُباعی**۔ اس میں دو شعر یا دو بیتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے دو بیتی کہلاتی ہے۔ پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس کے ۲۲ وزن ہیں۔ مضمون کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ لیکن چوتھا مصرعہ مؤثر اور زوردار ہونا چاہیئے۔

(۵) **مثنوی**۔ رزم و بزم اور حسن و عشق کی داستانیں بیان کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ ردیف ہو یا نہ ہو ہر شعر کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ اشعار کی تعداد محدود نہیں۔ اس کے لئے پانچ یا سات بحریں مخصوص ہیں۔

(۶) **مستزاد**۔ ہر مصرعہ کے بعد کچھ زاید الفاظ بڑھا دیتے ہیں لیکن وہ اصلی مصرعہ کے آخری دو رکنوں کے ہم وزن ہوتے ہیں۔ زاید الفاظ کا قافیہ مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

(۷و۸) **ترجیع بند و ترکیب بند**۔ ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں۔ اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ہم قافیہ اشعار کی ہوتی ہے۔ ہر بند کے آخر میں ایک شعر ہوتا ہے جو اوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جدا کرتا ہے۔ اور اس کا قافیہ بھی ان سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ہر بند کے بعد ایک ہی شعر بار بار آئے تو ترجیع بند کہلاتا ہے اور اگر یہ شعر بدلتا جائے تو ترکیب بند بن جاتا ہے ان دونوں قسموں میں تمام اشعار ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔

(۹) مربع۔ چو مصری نظم کو کہتے ہیں۔ اس میں سب مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

(۱۰) مخمس۔ بجائے چار کے پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔ اور پانچویں مصرعہ کا قافیہ بدل جاتا ہے۔

(۱۱) مسدّس۔ پہلے چار مصرعے ہم قافیہ۔ باقی دو مصرعہ علیحدہ۔ ان کے علاوہ مسبع وغیرہ

بھی اسی طرز کے ہوتے ہیں۔

(۱۲) **واسوخت**۔ اس میں عاشق اپنے معشوق کی بیوفائی۔ ظلم وستم۔ رقیب کے ساتھ بیجا التفات۔ اور فراق کی مشکلیں بیان کرتا ہے۔ اور جتلاتا ہے کہ اس طرز تغافل سے وہ علیحدگی اختیار کرے گا۔

(۱۳) **تاریخ**۔ اس میں کسی واقعہ کے اعداد سنہ حروف ابجد کے حساب سے نکالتے ہیں۔

(۱۴) **فرد**۔ کسی تمام یا ناتمام غزل کے کسی شعر کو کہہ سکتے ہیں۔ جو کبھی مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔

(۱۵) **کلیات**۔ مجموعہ نظم کو کہتے ہیں۔ اس میں قصاید۔ غزلیات۔ قطعات۔ رُباعیات۔ مثنویات وغیرہ بالترتیب درج ہوتے ہیں۔

(۱۶) **نعت**۔ اس نظم کو کہتے ہیں۔ جس میں پیغمبرِ اسلام کی تعریف کی جائے۔ نعت گو شاعروں میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی بہت مشہور ہیں۔

نثر کی قسمیں | نثر کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) **عاری**۔ جو بالکل سادہ اور بے تکلّف ہوتی ہے۔

(۲) **مرجز**۔ جس میں بحر ہوتی ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا۔

(۳) **مسجع**۔ جس میں بحر نہیں ہوتی مگر قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔

نثر مسجع کی تین قسمیں:۔

(۱) **متوازی**۔ دو فقروں کے آخری الفاظ ہم وزن اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

(۲) **مطرف**۔ آخری الفاظ کے ہموزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۳) **متوازن**۔ الفاظ ہم وزن ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔

نوٹ۔ نثر کی یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں۔

(۴) **تذکرہ**۔ اس میں شعرا کے حالات بیان کئے جاتے ہیں۔

(۵) **گلدستہ**۔ مجموعہ نظم کو کہتے ہیں۔

(۲)

باب

ادب اُردو کی ترقّی کے ابتدائی دَور

نظم کا نثر پر تقدم۔ اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص ادب اُردو کیساتھ

تُک بندی انسان میں فطری عطیہ ہے۔ دُنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا اسی لئے شاعری سے ہوتی ہے۔ جب تک فنِ تحریر وجود میں نہیں آیا تھا۔ شعر ہی کے ذریعہ سے واقعات دماغ میں محفوظ رہتے تھے۔ چونکہ غیر زبان (فارسی) کی تقلید نثر کی نسبت نظم میں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے اس لئے نظم پر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اظہار جذبات کے لئے نظم زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے بھی نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے ۔

امیر خسرو اُردو کے پہلے شاعر ہیں

اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں امیر خسرو ایک درخشندہ ستارہ کی طرح چمکتے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اُردو الفاظ اشعار میں استعمال کئے۔ اُردو کی سب سے پہلی غزل انہیں کی طرف منسوب ہے۔ انہوں نے ان گنت پہیلیاں کہ مکرنیاں۔ اور دو سخنے کہے۔ اِن کے بعض اشعار ٹھیٹھ ہندی میں بھی ہیں۔

امیر خسرو ۶۰۵ھ میں پٹیالی ضلع ایٹہ علاقہ اودھ و آگرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ غیاث الدین بلبن۔ معز الدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں معزز عہدوں پر سرفراز رہے حضرت نظام الدین اولیا کے ایسے عقیدتمند تھے کہ ان کے مرتے ہی تارک الدنیا ہوگئے اور چند روز بعد ۱۳۲۵ء میں خود بھی چل بسے۔ خسرو فن موسیقی کے زبردست ماہر تھے۔ خالق باری ان کی مشہور اور مقبول عام درسی کتاب تھی۔

امیر خسرو اُردو زبان کے سب سے پہلے شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ موجد اور

مخترع کا درجہ بھی رکھتے ہیں ؎

اُردو کی پختگی کا زمانہ

امیر خسرو کے زمانہ میں زبان میں پختگی نہیں آئی تھی۔ لیکن واقی پیدا ہو گئی تھی۔ امیر خسرو سے لے کر شعرائے دکن تک تین صدیوں کا زمانہ ہے۔ اگرچہ زبان اُردو نے اس زمانہ میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی لیکن اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لئے اس نے فارسی الفاظ کو نہایت فراخ دلی سے جگہ دی۔ چنانچہ ملک محمدؐ جائسی کبیر اور تُلسی داس کی تصانیف میں فارسی الفاظ بکثرت ملتے ہیں ؎

زرین عہد اکبری

شہنشاہ اکبر کی دلی تمنا تھی کہ فاتح اور مفتوح شیر و شکر ہو جائیں۔ اظہار محبت کے لئے وہ اکثر ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے درباری شاعر سنسکرت کے اشعار کا فارسی میں ترجمہ کرتے تھے۔ اور فارسی کے شاعر فیضی۔ عبدالرحیم خان خانان وغیرہ اکثر ہندی میں شعر کہتے تھے۔ ان وجوہ سے ہندی اور فارسی میں اتحاد پیدا ہو گیا۔ اسی زمانہ میں راجہ ٹوڈر مل نے مسلمان افسروں کو ہندی اور ہندو حاکموں کو فارسی سیکھنے کا حکم جاری کیا تاکہ محکمانہ کارروائیاں آسانی سے انجام پا سکیں۔ آخر کار صیغۂ مال میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے تحصیل فارسی لازمی قرار دے دی گئی۔

جس چیز کی ابتدا اکبر کے عہد میں ہوئی تھی۔ وہ شاہجہان کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی گویا اس مبارک عہد میں زبان اُردو ادبی خدمات انجام دینے کے قابل ہو گئی تھی ؎

قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہان گول کنڈہ و بیجاپور

امیر خسرو کا زمانہ زبان اُردو کے لئے صبح کاذب تھا۔ جس کی صبح صادق شاہان بیجاپور گول کنڈہ کے عہد میں ہوئی۔ یہ بادشاہ خود صاحب علم و فضل تھے۔ اور اہل علم کے قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن دکھنی بھی شعر کہتے تھے۔ اسی طرح بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ اول و ثانی بھی اہل علم کے قدردان ہونے کے علاوہ خود بھی مصنف تھے۔ انکی تصانیف زبان و ادب کی تدریجی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں ؎

ولی دکھنی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۱ء

ولی کے زمانہ میں اور بھی شاعر تھے لیکن وہ ولی کے سامنے ماند پڑ گئے۔

ولی کو ریختہ کا موجد سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ولی ہی نے اُردو شاعری کا سنگِ بنیاد باقاعدہ طور پر رکھا۔ شمالی ہند کے شعرا نے ولی کے کلام کو دیکھ کر اس کا تتبع کیا۔ ولی کا کلام نہایت سادہ اور صاف ہے۔ نیز پیچیدہ استعارات اور دُور از کار تشبیہوں سے پاک ہے اس میں تصوف کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ہے۔ مگر غلبہ نہیں اور ہندی الفاظ کی ملاوٹ بھی ہے۔ جو بعد میں متروک ہو گئے۔

قدیم شعرائے دہلی
حاتم۔ آبرو۔ آرزو

چونکہ دہلی والوں کو شاعری سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس لئے مرکز شاعری دکن سے دہلی میں آ گیا۔ یہاں کے سب شعرا ولی کا تتبع کرتے تھے۔ اب اُردو شاعری فارسی شاعری کے دوش بدوش چلنے لگی۔ اگرچہ زبان میں ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں کے لئے شاعری بہترین مشغلہ بن گئی تھی۔ نیز ہمارے قدیم شعرائے اُردو فارسی کے کُہنہ مشق شاعر تھے اس لئے اُردو شاعری فارسی شاعری کے نقش قدم پر خود بخود چل رہی تھی۔

ولی کے پیرو

حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) ناجی۔ مضمون۔ آبرو وغیرہ سب اُردو کے اجداد ہیں۔ ان لوگوں کا کلام تصوّف میں ڈُوبا ہُوا۔ بہت صاف سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ نشست الفاظ میں بہت زور مارا گیا ہے۔ فارسی الفاظ اور محاورات بکثرت ہیں۔ ولی کے کلام کی نسبت ہندی الفاظ ان کے ہاں بہت کم ہیں ان کی جگہ فارسی الفاظ نے لے لی ہے۔ گویا نقش اوّل سے نقش ثانی ہر طرح بہتر ہے۔ ان میں فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دکھنی شعرا کے زیادہ ہے۔ کہیں کہیں ہندی دوہروں کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔ گویا قدیم شعرائے دہلی کا کلام اُردو شاعری کی تدریجی ترقیوں کو نمایاں طور پر دکھلاتا ہے۔

میر و سودا کا زمانہ
اس زمانہ کی ترقیاں
زبان اور شاعری میں اصلاحیں

یہ زمانہ اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقّی کا زمانہ ہے اس وقت اُردو شاعری زینت الفاظ اور جدّت خیال سے آراستہ ہو کر دُنیا کے سامنے آئی۔ میر اور سودا اُردو شاعری کے اُستاد اعظم مانے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اُستاد اپنے ہم عصروں اور ماسبق حریفوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اور انہی کے

زمانہ میں غزل اور قصیدہ عروج پر پہنچے ہیں۔

مظہر جان جاناں۔ درد۔ سوز۔ قائم۔ یقین۔ بیان۔ ہدایت۔ قدرت اور ضیا ان کے ہمعصر تھے۔ یہ لوگ فارسی نظم کے بھی اُستاد تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کو ہندی الفاظ سے پاک کیا۔ اور ان کی جگہ فارسی کے ہزاروں الفاظ اور محاورے بجنسہٖ یا ترجمہ کرکے اردو میں داخل کئے۔ اسی زمانہ میں گُل و بُلبل اور قمری و شمشاد کے افسانے اردو شاعری میں داخل ہوئے اور فن شعر میں نمایاں ترقی ہوئی۔ فارسی سے نئی بحریں۔ نئی تشبیہیں۔ استعارے اور صنائع بدائع مستعار لئے گئے۔ اسی عہد میں نئے نئے اصناف شعر مثلاً واسوخت۔ مرثیہ۔ مخمس۔ ہجو۔ مثلث۔ مربع۔ مستزاد۔ وغیرہ۔ فارسی سے لے کر اردو میں رائج کئے گئے جو اصناف سخن پہلے سے مروّج تھیں۔ ان میں بھی ترقی ہوئی۔ صنعت ایہام پہلے بہت مقبول تھی۔ لیکن میر اور اُن کے بعد کے شعرا نے اس کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ اس زمانہ کے شعرا اصناف سخن کے موجد ہونے کے علاوہ اُردو شاعری کو ترقی دینے والے تھے۔ اسی زمانہ میں زبان اُردو میں قوت اور وسعت پیدا ہوئی اور نئے الفاظ محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آیندہ ترقی کے دروازے کھُل گئے۔

انشاء اور مصحفی کا دور زبان اور شاعری پر ان کے احسان	اس دور میں اثر۔ میر حسن۔ جرات۔ انشا۔ مصحفی۔ راسخ۔ بقا۔ حسرت۔ رنگین اور فراق مشہور ہیں۔ انہوں نے بھی اُردو میں سے ہندی الفاظ کو

خارج کرنے اور فارسی عربی الفاظ کو رائج کرنے کی کوشش برابر جاری رکھی سیکسینا صاحب کے نزدیک ہندی الفاظ کو ایک دم نکال دینے سے زبان کو سخت نقصان پہنچا۔ اس عہد میں وہ ہندی الفاظ بھی نکال دیئے گئے۔ جو میر اور سودا کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے۔ ان کی جگہ خوبصورت الفاظ اور محاورے زبان میں داخل کئے گئے۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں آپس میں ملادی گئیں۔ طرز وہی رہی۔ مضامین میں کوئی جدت پیدا نہیں کی۔ بلکہ شاعری میں ابتذال اور شہوانیت کا رنگ پیدا ہوگیا۔ اس دور کی شاعری اس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی

بگڑی ہوئی سوسائٹی کا صحیح مرقع ہے۔ اسی زمانہ میں "معاملہ بندی" کو رواج ہوا۔ اور جرأت، انشا اور رنگین اس رنگ کے پیشرو بنے۔

ریختی

معاملہ بندی نے بعد میں ریختی کی صورت اختیار کرلی۔ ریختی عورتوں کی زبان کو کہتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی اُبھارنے کے لئے کہے جاتے تھے۔ اسی لئے وہ زیادہ فحش ہوتے تھے۔ ریختی کی مثالیں ولی کے ہمعصروں کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے بعد میں یہ رنگ بالکل متروک ہوگیا تھا۔ اس کو دوبارہ انشا اور انکے دوست سعادت یار خاں رنگین نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص جان صاحب سمجھے جاتے ہیں انہوں نے اس کو ایک الگ فن قرار دیا۔ اور اسی رنگ میں عمر بھر شاعری کی۔ خدا کا شکر ہے۔ یہ صنف شاعری اب بالکل متروک ہے۔

اس دور کی خصوصیات

اس دور کے شاعر غزل کے اُستاد تھے۔ اور مثنوی اور قصیدہ خوب کہتے تھے۔ مشاعرے خوب ہوا کرتے تھے۔ اکثر شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کے دربار میں چلے آئے تھے کیونکہ وہاں شعرا کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اسی عہد میں میر حسن اور میر درد کے بھائی میر اثر نے مثنویاں لکھیں جواب تک قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ بالخصوص میر حسن کی شہرہ آفاق مثنوی سحرالبیان کی روانی۔ رنگینی۔ سادگی اور شیرینی کا جواب نہیں ہوسکتا۔

غالب اور ذوق کا زمانہ اور اس کی خصوصیات

اس دور کی ابتدا شاہ نصیر۔ ذوق غالب۔ مومن۔ اور ظفر سے ہوتی ہے اس عہد میں رہے سہے ہندی الفاظ بھی زبان اُردو سے خارج کر دیئے گئے۔ اور فارسی کو خوب ترقی ہوئی۔ غالب اور مومن فارسی میں خوب شعر کہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے فارسیت کو عروج ہوا۔ شاہ نصیر کو انشاء اور ذوق کے زمانے کی درمیانی کڑی سمجھنی چاہئے۔ یہی زمانہ نظیر اکبرآبادی کا ہے جن کا رنگ سب سے الگ اور نمایاں ہے۔ غالب و مومن کے ہاں فارسی کے مشکل الفاظ اور محاوروں کی بھرمار ہے۔ زبان کے حق میں یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ اس طرز نے رواج نہیں پایا۔ ورنہ اردو اور فارسی میں بہت تھوڑا سا فرق

رہ جاتا۔ اسی فارسیت سے مومن و غالب کا کلام مشکل بن گیا ہے سکیسینا صاحب کے نزدیک ذوق ذہانت اور طباعی میں بلحاظ شاعری غالب سے کم ہیں۔ لیکن زبان محاورات اور تمثیلات میں ان کی قدرت مسلّم ہے ظفر ذوق اور غالب کے شاگرد ہیں لیکن ان کا کلام ذوق کے کلام سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسی لئے لوگ اس کو ذوق کا کلام خیال کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں غزل اور قصیدے کو بہت ترقّی ہوئی۔ ذوق و غالب کی غزلیں اور قصیدے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں اور جدید بحروں میں اشعار کہے گئے۔ اس زمانہ میں غیر مانوس ہندی الفاظ زبان سے بالکل نکال دیئے گئے۔ اور فارسی ترکیبیں داخل کر لی گئیں۔ خیالات میں جدّت اور مضامین میں ندرت پیدا ہوئی جسکا بہترین نمونہ غالب کے کلام کو سمجھنا چاہیئے،،

شعرائے لکھنؤ کا نیا دور اور اس کی خصوصیات ناسخ اور آتش کا زمانہ۔ اور انکی خدمات زبان

دہلی پر جب زوال آیا تو اکثر اہل کمال لکھنؤ چلے گئے۔ ناسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں شاعری کا ایک نیا دور شروع ہُوا۔ گویا دہلی کے شعرا سے لکھنؤ میں شعر و شاعری کو ترقّی ہوئی۔ گھر گھر مشاعرے ہوتے تھے۔ اسی سے شاعری درجہ کمال کو پہنچی۔ زبان میں جدّتیں اور رنگینیاں پیدا ہوئیں اور زبان خوب صاف ہوگئی۔ پُرانے الفاظ بندشیں اور ترکیبیں ترک کر دی گئیں۔

ناسخ اور آتش کا تعلق بالکل لکھنؤ سے تھا۔ ناسخ کو متروکات کا ناسخ کہنا بالکل بجا ہے۔ اسی کے زمانہ سے شاندار الفاظ۔ عبارت میں تعقید و تکلف۔ صنائع و بدائع اور دُور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت۔ فضول مبالغے فرسودہ تشبیہیں نیز جذبات اور اثر کے فقدان نے رواج پایا۔ باوجود اس کے اس رنگ کے اکثر اشعار مزے کے ہوتے تھے اور اس زمانہ میں خوب مقبول تھے۔ ناسخ کے علاوہ بحر۔ وزیر۔ صبا۔ سحر۔ رشک وغیرہ بھی اپنے وقت کے اُستاد تھے۔ آخر یہ رنگ بدلا اور اشعار میں بے تکلفی سادگی۔ سوز و گداز اور اصلیت پھر پسند کی جانے لگی۔

آتش کا رنگ ناسخ سے بالکل الگ تھا۔ وہ غزل کے مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی درسی تعلیم اور معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی ہیں۔ مگر ان کا کلام ناسخ سے کہیں زیادہ

شیریں اور مؤثر ہے۔ وہ اپنے خاص رنگ یعنی شستگی الفاظ۔ چُستی بندش۔ اور بلندی مضامین میں قدما کے پیرو تھے۔ ان کے اشعار اثر اور سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہیں۔ شاید کم علمی ہی نے کلام میں سوز و گداز پیدا کیا تھا۔ اگرچہ صفائی زبان پر بھی ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن ہم ناسخ کے زیادہ ممنون ہیں۔ ان دونو باکمالوں کے مقابلے زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مراثی اور ان کا تعلق زبان کیساتھ

مرثیہ قدیمی صنف سخن ہے۔ یہ صنعت عرب سے فارس میں پہنچی اور وہاں سے ہمارے ہاں آئی لیکن ہمارے قدما اس کو پسند نہیں کرتے۔ میر خلیق اور ان کے فرزند میر انیس اور میر انیس کے ہم عصر مرزا دبیر نے اس صنف کو زندہ کیا۔ اگرچہ قدیم شعرائے دکن نے بھی مرثیے لکھے ہیں۔ لیکن ان کی زبان بالکل ابتدائی ہے۔ مرثیہ گوئی کو لکھنؤ میں اس لئے عروج ہُوا کہ وہاں کے امرا اکثر شیعہ تھے۔ شہیدان کربلا پر رونا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ بلکہ خود بادشاہ بھی مرثیہ لکھتے اور مجلسوں میں سُناتے تھے۔

میر انیس اور دبیر کا کلام نہایت مؤثر اور نیچرل شاعری کا حقیقی پرتو ہے۔ ان کے کلام میں اخلاقی تعلیم ہے۔ قصائد کی طرح بیکار لفاظی اور دُور از کار مبالغے نہیں ہیں۔ ان کے ہاں صحیح مناظر اور قلبی جذبات کی سچی تصویریں ہیں۔ حقیقت میں میر انیس کے مرثیوں نے اُردو شاعری کا ایک نیا دور قائم کر دیا ہے۔

مابعد کے شعرا امیر و داغ کا زمانہ

واجد علی شاہ کی معزولی اور غدر دہلی کے بعد امیر۔ داغ۔ جلال۔ اور تسلیم جیسے نامور شعرا اپنا وطن چھوڑ کر حیدر آباد دکن رامپور اور دوسری اسلامی ریاستوں میں چلے گئے۔ یہ لوگ قدما کا تتبع کرتے تھے۔ ان کا اپنا کوئی خاص رنگ نہ تھا دربارں اور محلوں میں مشاعرے ہوتے اور یہ لوگ وہاں بلبلوں کی طرح چہچہاتے تھے۔ غزلیں۔ قصیدے اور قطعے اور رباعیاں اس زمانے میں عام طور پر کہی جاتی تھیں۔

امیر مینائی اپنے پیشروں کے مقلد تھے۔ لیکن ان کا کلام زمانہ گذشتہ کی بے اعتدالیوں سے

پاک ہے۔ داغ کا کلام بے ساختہ اور روزمرّہ کے مطابق ہے۔ لیکن متانت اور بلندئ مضامین سے محروم ہے۔ جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں وہ قدما کے پیرو ہیں۔ لیکن عروض اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

اس دَور میں اُردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی ترقّی نہیں کی

جدید رنگ
آزاد اور حالی کا زمانہ
انکی خدمات ادب زبان

زمانہ حال میں نظم اُردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ جس کے موجد آزاد ہیں۔ اور سرور اور حالی ان کے خاص مددگار ہیں۔ اسی دَور میں نئے مضامین نئی طرز سے زبان میں داخل ہوئے۔ پُرانی پابندیاں اُٹھادی گئیں۔ بے تکلفی۔ اثر اور سادگی کو اختیار کیا گیا۔ قومی۔ خیالی اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں۔ جو حُسن و عشق کی قید سے آزاد ہیں یہ طرز انگریزی ادب سے نقل کی گئی۔ غرض اس رنگ نے آئندہ ترقّی کے دروازے کھول دیئے۔

طرز جدید کے شعرا

حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔ سرور کا تخیئل نہایت پاکیزہ ہے۔ اکبر اپنے خاص رنگ کے اُستاد ہیں۔ جوانی پر ختم ہوگیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ اور نیچرل مضامین ہیں۔ اور حسرت کا کلام بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔

نثر اُردو اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ

جدید نثر اردو کا سنگ بُنیاد اُنیسویں صدی میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے کلکتہ فورٹ ولیم کالج میں رکھا۔ وہ اُس وقت وہاں افسر اعلیٰ تھے۔ اُنھوں نے شمالی ہند سے سید حیدر بخش حیدری۔ بہادر علی حسینی۔ میر امن۔ حفیظ الدین احمد۔ مظہر علی ولا اور مرزا لطف علی وغیرہ جیسے قابل آدمیوں کو بُلایا۔ کہ نو وارد انگریزوں کے لئے اُردو سیکھنے کی کتابیں لکھیں۔ اس وقت تک کتابیں یا تو مذہبی رنگ میں لکھی جاتی تھیں۔ یا قصہ کہانیوں کی طرز پر جن میں صرف و نحو کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ ان بزرگوں نے نئی طرز پر کتابیں لکھیں۔ گویا فارسی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ

نکال دیئے۔ حقیقت میں زمانۂ حال کی شستہ نثر نگاری اور سرکاری دفاتر کا کام اُردو میں ہونا ڈاکٹر صاحب موصوف کی کوششوں کا نتیجہ ہے نیز اُردو لغات اور صرف و نحو کی کتابیں بھی سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب ہی کے زمانہ میں ترتیب دی گئیں ہیں ؞

نثر مقفیٰ رجب علی بیگ سرور

نثر مقفیٰ ظہوری اور بیدل کی نثروں کی طرز پر لکھی جاتی تھی۔ اس کی عبارت مقفیٰ اور جملے بالکل نپے تُلے ہوتے تھے۔ صنائع بدائع استعارے اور تشبیہیں دل کھول کر صرف کی جاتی تھیں۔ جملے طولانی اور پیچیدہ ہوتے تھے۔ جن کا پڑھنا اور سمجھنا سخت وقت طلب ہوتا تھا۔ عرصے تک یہ طرز مطبوع خاص و عام رہی۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی مشہور تصانیف "فسانۂ عجائب" اس رنگ کی بہترین مثال ہے ؞

دریائے لطافت

انشا کی یہ تصنیف تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ صرف نحو اُردو کی پہلی کتاب ہونے کے علاوہ اس میں اس وقت کی مروجہ زبانوں کے الفاظ محاورے اور اصطلاحیں بکثرت ہیں ؞

اُردوئے معلیٰ اور عود ہندی

یہ دونو کتابیں مرزا غالب کے اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں۔ عبارت نہایت سلیس۔ سادہ۔ بے تکلف اور دلآویز ہے۔ ظرافت اور شگفتگی نے خطوط کو بیحد دلچسپ بنا دیا ہے۔ اگرچہ غالب کی طرزِ خطوط نویسی نے زمانۂ مابعد کے نثر نگاروں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پُرانے رنگ کی مقفیٰ اور مسجع عبارت سے بالکل پرہیز نہیں کر سکے ؞

عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر

عیسائی پادری جو بنگال میں مقیم تھے۔ انجیل کا ترجمہ اور تبلیغی رسایل مُلکی زبانوں میں شائع کر کے عوام میں تقسیم کرتے تھے۔ سکسینا صاحب کے نزدیک اُردو اخبار نویسی اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۶ء تک انجیل کے ترجمے زیادہ تر اُردو ہی میں شائع ہوئے ہیں ؞

سرسید اور اُن کے رفقا کا زرین عہد

اُنیسویں صدی کے نصف آخر کو نثر اُردو کی ترقی کا زرین عہد

سمجھنا چاہیئے۔ اس عہد میں سرسیدؔ اور ان کی جماعت نے ایک خاص رنگ اختیار کیا۔
اس زمانے میں عیسائیوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی مناظرے بھی اُردو کی ترقی کا باعث ہوئے۔ اور مناظرے کی کتابیں وغیرہ بھی نہایت سلیس اُردو میں لکھی گئیں۔ قرآن کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہُوا۔ سرسیدؔ خود ایک جامع طرزِ تحریر کے موجد تھے انہوں نے تعلیمی۔ اخلاقی۔ معاشرتی فلسفیانہ۔ مذہبی۔ سیاسی۔ غرض ہر قسم کے موضوع پر نہایت پاکیزہ مضامین لکھے ہیں۔

سرسیدؔ کے رفقا حالیؔ۔ شبلیؔ۔ آزادؔ۔ ذکاء اللہ۔ مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک اور نذیر احمد کی تحریروں سے اہلِ ملک اور ملکی زبان کو بیحد فائدہ پہنچا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ موجودہ زبان انہی کی زبان ہے۔ جس میں ہم دن رات گفتگو کرتے ہیں ؂

انگریزی تعلیم کا اثر اُردو پر چھاپہ کی ابتدا۔ اُردو کا سرکاری زبان ہونا	اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر اُردو پر پڑنے لگا۔ اُردو میں معتدبہ معلومات اور اصنافِ سخن کا اضافہ ہُوا۔ چھاپہ سے اشاعتِ کتب آسان ہوگئی۔ ۱۸۳۲ء میں دفاتر کی زبان انگریزی سے

اُردو ہوئی۔ جس سے اُردو زبان کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ؂

ناول نویسی کی ابتدا	افسانہ نگاری۔ تاریخی ناول۔ اور اخبار نویسی کو انگریزی تعلیم کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے ؂

اُردو ڈراما	یہ بالکل نئی چیز ہے۔ فارسی میں اس کا وجود نہیں۔ اس صنف کو ابھی کمال حاصل

نہیں ہُوا۔ ہمارے ڈرامہ نگاروں میں ابھی پختگی نہیں آئی۔ یورپ کے مشہور ڈرامے ہماری زبان میں ترجمہ ہوگئے ہیں۔ ابھی اُردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل موجود ہے ؂

باب ۳

اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اُردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے

اُردو شاعری فارسی شاعری کے قدم بقدم چلی۔ اور فارسی شاعری نے عربوں کا تتبع کیا۔ شعرائے اُردو نے فارسی تشبیہیں اور مضامین اخذ کئے۔ اس سے نقصان یہ ہُوا کہ اُردو شاعری کو مدارج ارتقا نہیں طے کرنے پڑے۔ جو ایک نئی زبان کی ترقی کے لئے بیحد ضروری ہیں۔ اس لئے اُردو میں فارسی زبان کے وہ مضامین آ گئے۔ جنکا ہمارے ملک سے کوئی تعلق نہیں نیز ہمارے شعرا فارسی اشعار کے ترجمے کرنے لگے! ور فارسی اساتذہ کی تقلید اپنے لئے فخر کا باعث سمجھتے ہیں۔

تقلید کے بُرے نتائج

(۱) اُردو شاعری سے اصلیت جاتی رہی اور ابتذال پیدا ہو گیا۔

(۲) غیر ملکی مضامین مثلاً شیریں فرہاد۔ مانی و بہزاد۔ جیحوں سیحوں۔ کوہ الوند۔ بلبل اور سنبل وغیرہ ہماری شاعری میں داخل ہو گئے۔

(۳) فارسی شعرا کے تتبع نے اُردو شاعری کو محض نقالی بنا دیا۔ غزلوں اور قصیدوں میں غیر ملکی تشبیہات اور استعارات کا استعمال ہونے لگا۔ شعرا اپنے ملک کی چیزوں اور موسموں کو بھول گئے مختصر یہ کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھیں بند کر کے جزئیات تک میں کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ ہماری شاعری حسب دلخواہ ترقی نہیں کر سکی۔

اُردو شاعری رسمی رہ گئی

اُردو شاعری میں صرف تکلفات ظاہری ہیں۔ اور وہ محض رسمی و لکیر کی فقیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقررہ حدود سے اِدھر اُدھر ہونا غیر فصیح سمجھا جاتا ہے۔ وہی پرانے استعارے اور تشبیہیں ہیں۔ مشاہدات تازہ کا کہیں نام نہیں۔ غرض اُردو شاعری تصنع اور بے مزگی سے بھری پڑی ہے۔

قافیہ پیمائی | قافیہ بھی فارسی کے تتبع میں اختیار کیا گیا۔ گو وہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اظہار خیالات میں سخت رکاوٹ کا باعث ہے۔ ہمارے شعرا کو قافیہ مدنظر رکھ کر مضمون پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ یورپ اس کو ترک کر چکا ہے! ور ہمارے شعرا کو بھی اس بدمزگی کا احساس ہوتا ہے۔

خلاف نیچر مضامین | اُردو شاعری میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرد کا مرد سے تعشق کس قدر مذموم معلوم ہوتا ہے۔ پھر جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وہ بھی تہذیب کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ اصل میں اس بدعت کا آغاز ہمارے قدیم شعرا نے کیا تھا۔ جو ابھی تک جاری ہے۔ بھاشا کی شاعری میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ حقیقی اور صحیح جذبات پر مشتمل ہے۔ لیکن اُردو شاعری میں حسینان بازاری پر مذموم اشعار لکھے جاتے ہیں۔ یہ طرز نہ تو اُردو شاعری کو ترقی کرنے دیتی ہے اور نہ مذاق صحیح پیدا ہونے دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے قدیم شعرا تفنن طبع کے لئے اُردو میں شعر کہتے تھے۔

ہمارے قدیم شعرا اصل میں فارسی کے شاعر تھے۔ وہ ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے اور اس وقت درباری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اس لئے اُردو میں سے قدرتاً ہندی اور سنسکرت کے خوبصورت الفاظ اپنی جگہ فارسی کے بھدے اور ثقیل الفاظ کو دیتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو کو بیقدری کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا۔ غالب ؎

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ   بگذار از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

وجہ تذکیر معشوق | گذشتہ زمانہ میں جب کبھی معشوقہ کا نام ظاہر ہو جاتا تو قبیلوں میں کشت و خون کی نوبت آجاتی تھی۔ کیونکہ باعصمت عورتیں اس طرح بدنام ہو جاتی تھیں۔ اس قباحت کو دُور کرنے کے لئے خیالی عورتوں کے نام تجویز کئے گئے۔ یا کسی مشہور معشوقہ سلف کے نام سے جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ یا وہ صیغۂ تذکیر کے ساتھ مذکور ہونے لگیں۔ فارسی شعرا کو یہ مصیبت پیش ہی نہیں آئی۔ کیونکہ ان کی زبان میں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ لیکن اُردو میں تذکیر و تانیث کی

تفریق موجود ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ہر ملک کا ادب اس کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے ایسی حالت میں فرقۂ ذکور سے عشق ظاہر کرنا اخلاقی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔ یہ اعتراض کہ پردہ دار عورتوں کا ذکر مناسب نہیں۔ معقول نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ پردہ دار عورتیں تو منظر عام پر آتی ہی نہیں ٭

اصناف سخن اُردو شاعری میں۔ غزل۔ قصیدہ۔ رُباعی۔ قطعہ۔ مثنوی۔ مرثیہ وغیرہ اصناف سخن میں شاعری کی جاتی ہے۔ اسلئے ہم ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ بحث کرتے ہیں ٭

غزل اور اُس کا رنگ غزل سب سے مشہور صنف سخن ہے۔ اس کا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے متقدمین کے کلام میں تصوّف کا رنگ غالب تھا۔ اور قرونِ وسطیٰ میں مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے ٭

تصوّف ہمارے قدیم شعرا صُوفی منش تھے۔ ان کے بزرگ مجاہدین اسلام کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ تصوّف کا مذاق ان میں وراثتاً چلا آتا تھا۔ ولی دکنی شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید تھے۔ آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے۔ مضمون اگرچہ سپاہی پیشہ تھے لیکن آخر میں تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ شاہ حاتم۔ مرزا مظہر۔ میر درد وغیرہ بھی مشہور صوفی بزرگ تھے میر سودا اور ان کے ہمعصروں کے کلام میں بھی تصوّف کا رنگ نمایاں ہے۔ چونکہ فارسی شاعری میں تصوّف بھرا ہوا تھا۔ اس لئے اُردو شاعری نے اس رنگ کو بھی اس کے تتبع میں اختیار کیا۔ چنانچہ ہماری شاعری میں بھی تقدس۔ ریاضت نفس ترک ماسوی اللہ۔ نمائش و ریاکاری سے نفرت۔ عیش۔ حصول دولت۔ اور اقتدار سے بیزاری وغیرہ کے مضامین بکثرت ہیں فارسی شعرائے صوفیہ حسن مجازی کی تعریف کرکے حسن حقیقی کی لذت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہی حالت ہمارے شعرا کی بھی ہے ٭

عاشقانہ رنگ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہیں۔ اس میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے غزل اُردو شاعری کی جان ہے اور اصناف شاعری میں

سب سے سہل اور زیادہ کام آنے والی چیز یہی غزل ہے۔ اس میں عاشقانہ رنگ اور تصوف اہل دربار کی عیش پرستیوں اور فارسی شاعری کے تتبع کی بدولت آیا ہے۔ عام طور پر غزلیں عاشق کی حرمان نصیبی۔ وصل کی جستجو۔ معشوق کے جور و جفا۔ گل و بلبل کے راز و نیاز۔ عاشق کی وحشت و جنون۔ معشوق کے سراپا کی تعریف۔ باغ و بہار کے مناظر۔ شراب کی تعریف و طلب۔ رقیبوں کے شکوے وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔

اہل دربار کا اثر اردو شاعری پر

اردو شاعری کی نشو و نما درباروں میں ہوئی۔ کیونکہ امرا اس کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ۔ حیدر آباد اور دہلی وغیرہ شاعری کے مرکز بنے رہے۔ درباری انعام و اکرام نے شاعروں کو پروان چڑھایا۔ لیکن اس سرپرستی نے شاعری کو درباری مذاق تک محدود کر دیا۔ عاشقانہ جذبات نے درباریوں کے مذاق کے مطابق خوب پرورش پائی۔ قصائد میں بھی عاشقانہ رنگ غالب ہوتا گیا۔ کیونکہ اس طرح شعرا کو خوب صلہ ملتا تھا۔ سر والٹر سکاٹ کے اشعار کا مندرجہ ذیل ترجمہ اس حالت کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے ؎

شاعران نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت مدام　　اپنے رنگ عیش عشرت کے لئے سب بادشاہ
لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابند دام　　تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں یہ کرتے ہیں مدح

قدرتی مناظر کی اردو شاعری میں کمی

اردو شاعری میں قدرتی مناظر بہت کم ہیں۔ اور مصنوعی مناظر کا ذکر بکثرت ہے۔ لیکن گذشتہ صدی سے انگریزی تعلیم کی بدولت نیچرل شاعری کا چرچا ہونے لگا ہے۔ ہمارے شعرا آج تک وہی پرانے قصوں کو دہراتے آئے ہیں۔ مغربی شعرا کی طرح وہ لہلہاتے ہوئے کھیت۔ گاتی ہوئی چڑیوں۔ اور حسن کی صحیح تصویروں سے متاثر ہی نہیں ہوتے۔ اس لئے فطرتی شاعری کے لئے ہمارے ہاں بڑی گنجائش ہے۔

حزن و یاس کی فراوانی

اردو تو کیا ساری مشرقی شاعری حزن و یاس کے مضامین سے پُر ہے۔ یورپین کہتے ہیں کہ حزن و یاس اہل مشرق کی طرز معاشرت کا نتیجہ ہے۔ وہ تقدیر کے قائل ہیں۔ ان

ہیں قوت عمل مفقود ہے وہ تقدیر سے مقابلہ کرنے کو حماقت خیال کرتے ہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کی شاہانہ قوتوں کو زوال ہوا اور انکی عظمت الیسی مٹی کہ اقبال کا زمانہ خواب و خیال ہوگیا۔ اس لئے حزن و ملال ان کے دلوں میں گھر بنا بیٹھا۔

مغرب کے شعرا کی طرح اُردو شعرا خوشی اور مسرت کے ترجمان نہیں ہیں۔ اس مایوسی کی وجہ سے ان کے کلام میں درد اور اثر پیدا ہوگیا ہے۔ جو ایک حد تک قابل ستائش ہے۔ لیکن اسکی بہتات ترقی میں مانع ہے +

قصائد | قصائد نویسی میں اُردو کے شعرا نے فارسی اساتذہ کی پیروی کی ہے۔ فارسی الفاظ کے بکثرت استعمال سے قصیدوں کی شان بڑھائی جاتی ہے اور ممدوح کی تعریف میں بیحد مبالغہ برتا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد مشکل قوافی عمدہ صنائع و بدائع اور شکوہ الفاظ سے قصیدہ گو کی قابلیت کی گواہی دیتے ہیں +

مثنوی | مثنوی بہت مقبول اور کار آمد صنف سخن ہے۔ اس میں بھی فارسی قواعد نظم کی پیروی کی جاتی ہے۔ ہمارے مشہور مثنوی نویس میر۔ میر حسن۔ مومن خان نسیم۔ قلق۔ نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں۔ اور سب سے مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مثنوی ڈرامہ کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے مثنوی میں نہ تو کریکٹر نویسی ہے اور نہ پلاٹ۔ ڈرامہ ہر حیثیت سے مثنوی سے بالا ہے۔ مثنوی میں عمل بالکل مفقود ہوتا ہے۔ اور وہ محض رسمی اور واقعات قدیمہ کی پابند ہوتی ہے +

مراثی | مرثیوں میں مناظر بہت عمدگی سے دکھلائے جاتے ہیں۔ پُرزور اور فصیح بیانیہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے +

قطعہ اور رُباعی | ان میں خاص نصیحت آمیز اور عمدہ خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ انیسؔ۔ دبیرؔ اور حالیؔ کی رُباعیاں خاص طور پر مشہور ہیں +

اُستاد شاگرد کا تعلق | اُستاد کا اُردو شاعری میں خاص درجہ ہے۔ پہلا کلام اُستاد کو دکھایا جاتا ہے

اور باقاعدہ اصلاح لی جاتی ہے۔ شاگرد اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں۔ اس کے خلاف چلنا عیب گنا جاتا ہے۔ گویا اُستادی شاگردی قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون کر دیتی ہے اسی لئے اُردو شاعری رسمی رہ گئی ہے۔

مشاعرے | مشاعروں میں سخن سنج اور سخن گو جمع ہوتے ہیں۔ اور کسی طرح پر طبع آزمائی کر کے دادِ سخن لیتے ہیں۔ اس سے اُردو شاعری میں ترقی ہوتی ہے۔ اہلِ یورپ اس فن سے قطعی ناواقف ہیں۔

تخلص | شعرا اپنے کلام میں اپنا ایک خاص نام استعمال کرتے ہیں۔ جس کو تخلص کہتے ہیں کبھی کبھی اپنے نام کے جزو سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کے خصوصیات | اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے۔ وہ ہمارے جذبات کو اُبھارتی ہے۔ وہ نہایت شیریں اور لطیف ہے۔ وہ عشق میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عشق کی ناکامیاں نامرادیاں اور حسرت و ارمان کے جذبات ہمارے قلب پر خاص اثر کرتے ہیں۔ یہ ایسے لطیف جذبات ہیں جن سے دوسری زبانیں محروم ہیں۔ چونکہ اُردو نظم کی پیدائش کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس لئے بہت سا کلام ناقص اور بدمزہ بھی ہے۔ موجودہ زمانہ میں شاعری نیچرل روش پر پڑ گئی ہے۔ جس سے اُردو کا مستقبل بہت شاندار بن گیا ہے۔ کیونکہ اسوقت شاعری کی طرف ان لوگوں کی توجہ منعطف ہو گئی ہے۔ جو مشرقی اور مغربی ادب سے اچھی طرح واقف ہیں۔

باب ۴

قدیم شعرائے دکن

دکھنی | اُردو شاعری کی ابتدا دکن کے مسلمان فرمانرواؤں کے درباریں دکنی زبان میں ہوئی دکھنی زبان اُردو کی ایک شاخ ہے۔ اُردو کی طرح وہ بھی فارسی خطِ نستعلیق میں لکھی جاتی ہے۔

لیکن اس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں۔ جب فوجی مسلمان دکن میں پہنچے تو اُسوقت اس میں کچھ فارسی محاورے داخل ہو گئے تھے۔ جواب اُردو میں متروک ہیں۔ جب اطراف کی زبانوں سے اس نئی زبان کا میل ہُوا تو اس کی ساخت میں بھی کسی قدر فرق آ گیا۔ مثلاً وہ لوگ "مجھ کو" کی جگہ "میرے کو" بولتے ہیں۔ یہ خرابیاں شمالی ہند میں آ کر اصلاح پا گئیں۔ اسوجہ سے دکھنی کو ایک خراب قسم کی اُردو خیال کرنا صحیح نہیں بلکہ اس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے۔ جو ولی کی کوشش سے ایک ادبی زبان بن گئی ۔

دکھنی کی ابتدا سب سے پہلے سلطان علاء الدین خلجی نے دکن کو فتح کر کے اس کو دہلی کے ماتحت کیا۔ پھر دو مرتبہ سلطان محمد تغلق دکن جا کر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دہلی برباد ہو گئی۔ علماء فضلا بھی دکن میں جمع ہو گئے۔ اور دہلی والوں کی زبان پر بھی دکن کے اثرات پڑ گئے ۔

دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے اسباب یہ بڑا اہم سوال ہے کہ اُردو کا گہوارہ دکن کیوں قرار پایا؟ اس کی تشریح یہ ہے کہ خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا چیلا تھا۔ انقلاب زمانہ سے تخت و تاج اس کے ہاتھ آیا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ اپنے گرو کا نام بھی شامل کر لیا بلکہ اس کو اپنا وزیر مال بھی بنا لیا۔ اس سے پہلے برہمن امور ملکی میں دخل نہیں دیتے تھے محض مذہبی امور سے متعلق تھے۔ لیکن گنگو کے زمانہ سے یہ رواج ہو گیا کہ وزارت مال ہمیشہ برہمنوں کو ملنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط بڑھ گیا۔ آپس میں شادیاں ہونے لگیں جس سے زبان ہندی نے خوب ترقی کی۔ ابراہیم عادل شاہ نے بھی دکھنیوں کے زیر نگرانی حساب کتاب ہندی میں رکھا۔ انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ ملکی زبان ترقی کرتے کرتے ایک ادبی زبان بن گئی۔ افسوس کہ اس زمانہ کے شعرا کے حالات نہیں ملتے۔ مگر ان کے نام اور انتخابات کلام کہیں کہیں کتابوں میں موجود ہیں ۔

شاہان بہمنی کا زمانہ ۷۴۸ھ تا ۹۳۲ھ ۷۴۸ھ سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوئی۔ گنج الاسلام شیخ عین الدین اور خواجہ گیسو دراز وغیرہ اس زمانہ کے صوفی منش شاعر ہیں۔ جنکے چند ایک

مذہبی رسائل دریافت ہوئے ہیں۔

قطب شاہیوں کا عہد ۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ

سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد بیجاپور گول کنڈہ اور احمد نگر کی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اس زمانہ میں دکھنی کو بڑی ترقّی ہوئی۔ محلوں میں ہندو رانیاں دیسی زبان بہت خوبصورتی سے بولتی تھیں۔ شاہان بیجاپور وغیرہ بہت قابل بادشاہ تھے۔ وہ فارسی اور دکھنی میں شعر کہتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔ چونکہ امرا اور وزراء زیادہ تر فارسی دان تھے۔ اس لئے اطراف کی زبانوں نے دیسی زبان پر زیادہ اثر نہیں کیا۔ جنیدی۔ طبعی۔ نوری۔ فائز۔ طالب۔ مومن وغیرہ اس زمانے کے مشہور شاعر ہیں۔ لیکن ان کے حالات نہیں ملتے۔

سلطان محمّد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء

یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور بہت جلد معراج ترقّی پر پہنچ گئی سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کے بعد ۱۵۸۱ھ میں بارہ۱۲ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ وہ اکبر اعظم اور شاہ عباس صفوی کا ہمعصر تھا۔ حیدرآباد کی اسی نے بنیاد رکھی تھی۔ وہ بہت فیاض اور علوم و فنون کا قدردان تھا۔ عرب اور ایران سے باکمال اُستاد اس کے دربار میں آتے رہتے تھے۔ وہ شیعہ تھا۔ اس لئے اس کے عہد میں مرثیے لکھے گئے وہ عمدہ خوشنویس ہونے کے علاوہ ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کا کلام دکھنی تلنگی اور فارسی میں موجود ہے۔ فارسی میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلّص کرتا تھا۔ اس نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ سادگی اور شیرینی اس کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوّف اور عاشقانہ رنگ میں اشعار کہتا تھا۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بُنیادیں اسی نے رکھی تھیں۔ جن کو سودا اور نظیر اکبرآبادی نے تکمیل کو پُہنچایا۔

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں۔ جن کا کلام مجموعی صُورت میں اٹھارہ سو صفحات پر محفوظ ہے۔ ان کے کلام میں پختگی سادگی اور ادبی شان پائی جاتی ہے۔ وہ فارسی شعرا کا تتبع کرتے ہیں۔ لیکن مقامی اثرات ان کے کلام پر بہت کافی معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر ہندی خیالات اور

ہندی الفاظ ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ پھر طرز بھی ہندی ہے۔ گویا عشق عورت کی جانب سے مرد کی طرف ظاہر کرتے ہیں۔

پہلے خیال تھا کہ ولی اُردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ لیکن اب یہ سہرا قلی قطب شاہ کے سر ہے۔

نمونۂ کلام

دل مانگ خدا کن کہ خدا کام دو بیگا ‏ تمنن کی مرادن کے بھرے جام دو بیگا

کرتے دعویٰ شعر کا سب اپنی طبع سوں ‏ بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

سلطان محمد قطب شاہ ۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۵ء

یہ سُلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے جانشین اور داماد تھے وہ نہایت متشرع اور سخی تھے۔ نظم و نثر اُردو میں خوب دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی میں ظل اللہ اور اُردو میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے۔ ان کے فارسی اور دکھنی میں دو دیوان حیدر آباد میں نواب سر سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ کلام میں شیرینی اور صفائی خوب ہے۔

نمونۂ کلام

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیض ‏ محبت پر نظر رکھ کر بسر غیض

دو لب ترے رنگیلے یاقوت کو دیئے رنگ ‏ لے بھیک رنگ عقیقاں نگین ہوئے یمن ہیں

سلطان عبداللہ قطب شاہ ۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۴ء

یہ سُلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے تھے اور سلاطین قطب شاہی میں ان کا چھٹا نمبر تھا۔ وہ ۱۶۲۵ء میں تخت پر بیٹھے۔ شاہجہان کو خراج دیتے تھے شاعری کے شوقین تھے۔ ان کا دربار علماء فضلا سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ برہان قاطع انہی کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ فارسی اور دکھنی میں شعر کہتے تھے۔ دونوں زبانوں کے دیوان موجود ہیں۔ اِن کے اشعار بھی صاف اور شیریں ہیں

نمونۂ کلام

تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا ‏ تماشا ہے اُجالے میں اُجالا

آبحیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا ‏ کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث

ابن نشاطی

یہ اس زمانے کے مشہور شاعر ہیں گول کنڈہ کے باشندے اور عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ ان کے حالات زندگی معلوم نہیں ہوئے۔ ان کی مثنوی "پھول بن" زبان

دکھنی میں ملتی ہے۔ یہ ۱۰۷۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایتیں بھی ہیں۔ اور قصہ عشق و عاشقی میں انسانوں کا جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ شاید فسانۂ عجائب اسی کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔

غواصی کا قصہ سیف الملوک غواصی نے دکھنی میں ۱۰۳۵ھ میں یہ مثنوی لکھی تھی۔ اس میں شہزادی چین اور شہزادہ مصر کے عشق کے حالات منظوم ہیں۔ یہ قصہ غالباً الف لیلیٰ سے ماخوذ ہے۔ غواصی عبداللہ قطب شاہ کا شاعر تھا۔ مثنوی طوطی نامہ بھی اسی کا لکھا ہوا ہے۔

سب رس مصنفہ مولانا وجہی مولانا وجہی عبداللہ قطب شاہ کے درباری تھے۔ سب رس انہی کے حکم سے ۱۰۴۰ھ یا ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس سے پیشتر کی نثر کے نمونے مذہبی رنگ میں ملتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک ادبی شان ہے۔ انہوں نے ظہوری کے تتبع میں مقفیٰ نثر لکھی ہے۔ زبان صاف سادہ۔ اور قطب شاہیوں کے کلیات جیسی ہے۔

تحسین الدین ان بزرگوار نے مثنوی "کام روپ کلا" لکھی ہے یہ والئ لنکا کی بیٹی اور راجہ اودھ کے لڑکے کے عشق کا قصہ ہے جرمن کے مشہور شاعر گوئٹے نے اس کو ترجمہ کرا کر سنا تھا۔ اور بہت پسند کیا تھا۔

ملا قطبی انہوں نے ۱۰۴۶ھ میں تحفۃ النصائح کا اسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا تھا۔ جو شیخ یوسف دہلوی نے ۹۵۰ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے تصنیف کی تھی۔

جنیدی ان کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔ انہوں نے ۱۰۶۴ھ میں مثنوی ماہ پیکر تصنیف کی تھی۔

طبعی یہ عبداللہ قطب شاہ کے ہمعصر اور گول کنڈہ کے باشندے ہیں انہوں نے مثنوی بہرام و گل اندام ۱۰۸۱ھ میں تصنیف کی۔ جو ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔

ابوالحسن قطب شاہ یہ گول کنڈہ کے آخری تاجدار ہیں۔ عیش پسند نازک مزاج۔ قابل حکمران تھے۔ اور قابل لوگوں کے قدردان تھے۔ ان کی آخری عمر مغلوں کی قید میں گزری۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کے

داماد تھے۔ اور تاناشاہ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے شعرا کے حالات ذیل میں درج ہیں:۔

| نوری | سید شجاع الدین نام تھا۔ گجرات کے سادات سے تھے۔ تاناشاہ کے وزیر کے بیٹے کے اتالیق

تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کو فیضی کے دوست ملا نوری سے نہیں ملانا چاہئے۔ وہ اور بزرگ تھے۔

| فائز | یہ بھی گول کنڈہ کے باشندے تھے۔ انہوں نے قصہ رضوان شاہ و روح افزا نثر فارسی سے

نظم دکھنی میں ترجمہ کیا تھا۔

| شاہی | شاہ قلی خان نام تھا۔ شاہی ملازمت کرتے تھے۔ تاناشاہ کے ندیم خاص تھے۔ انہوں نے

شمالی ہند کی سیر بھی کی تھی۔

| مرزا | ابوالقاسم نام تھا۔ تاناشاہ کے مصاحب تھے۔ ان کے زوال کے بعد فقیر ہو گئے تھے۔

| عادل شاہیوں کا زمانہ ۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ | سلطنت عادل شاہی کی بنیاد پڑنے سے مدتوں پہلے بیجاپور میں اردو زبان عام ہو گئی تھی۔ سلاطین بہمنی کے دفتروں کی بھی یہی زبان تھی۔ لیکن یوسف عادل شاہ

اور اس کے بیٹے اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے زمانہ میں دفاتر کی زبان فارسی کر دی تھی۔

| ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء | سلاطین بیجاپور بھی شاہان گول کنڈہ کی طرح تعلیم یافتہ بادشاہ تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو شعر و شاعری کا بہت شوق تھا۔ "ملا ظہوری" ان کے

دربار کے مشہور شاعر تھے۔ عادل شاہ ہندی موسیقی کا زبردست استاد تھا۔ اس نے سرود ہندی پر نورس نام ایک کتاب لکھی اور ملا ظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور آفاق ہے۔

| علی عادل شاہ ثانی | اس کے دربار میں بھی علما و ادبا کا مجمع رہتا تھا۔ وہ دکھنی شعرا کی بہت قدر

کرتا تھا۔ رستمی۔ نصرتی۔ شاہ ملک۔ امین۔ مومن۔ ہاشم۔ مرزا وغیرہ اس کے عہد کے مشہور شاعر ہیں۔ سیواجی کے حملوں نے اس کے ملک کا انتظام درہم برہم کر دیا تھا۔

| رستمی | کمال خان نام تھا۔ اس نے خاورنامہ کا شاہنامہ فردوسی کی طرز پر دکھنی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔

نصرتی شیخ نصرت نام تھا۔ اور بیجاپوری تھا۔ آبا و اجداد فوجی ملازم تھے۔ وہ محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں آیا اور علی عادل شاہ کے دور میں ملک الشعر ہو گیا۔ سنی المذہب اور بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید تھا۔

تصانیف (۱) اس نے ۱۰۷۶ھ میں مثنوی علی نامہ میں علی عادل شاہ کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ بصورت قصیدہ دکنی کی پہلی مثنوی ہے۔

(۲) مثنوی گلشن عشق عشقیہ مثنوی ہے۔ اسمیں عربی فارسی اور بھاشا کی خوب آمیزش ہے۔

(۳) گلدستہ عشق۔ بعض کا خیال ہے کہ مثنوی ہے اور بعض کے نزدیک یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔

(۴) قصایٔد کا مجموعہ اور غزلوں کا دیوان بھی ہے۔

انکی مضمون آفرینی زور طبع اور اوج تخیئل کو ابراہیم زبیری نے خاقانی کے کلام کا ہم پایہ بتایا ہے۔

ہاشمی سید میراں نام تھا اور بیجاپوری تھے۔ سید شاہ ہاشم کے مرید تھے۔ اگرچہ مادر زاد اندھے تھے لیکن نہایت ذہین اور فطین تھے۔ مثنوی یوسف زلیخا ۱۰۹۹ھ میں اپنے مرشد کی فرمائش سے دکنی میں لکھی جو دکنی ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس کا بیشتر حصہ ریختی میں ہے۔ قدیم بھاشا کا رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ وہ ہندی شاعروں کی طرح عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔

دولت انہوں نے ۱۰۴۴ھ میں قصہ بہرام شاہ و بانوئے حُسن دکنی میں تصنیف کیا تھا۔

شاہ ملک بیجاپوری ہیں اور علی عادل شاہ کے معاصر۔ انہوں نے رسالہ احکام الصلوٰۃ ۱۰۷۷ھ میں نظم دکنی میں فارسی سے تبدیل کیا تھا۔

شاہ امین ان کا نام شیخ امین الدین اعلیٰ ہے۔ وہ بیجاپور کے اولیاء میں سے ہیں۔ اکثر حالت استغراق میں اشعار کہا کرتے تھے۔ مریدوں نے ان اشعار کو ترتیب دیا ہے۔

دکن میں مرثیہ کی ابتدا سب سے پہلے مرثیہ نویس شیخ شجاع الدین نوری تھے۔ وہ اکبری دور کے

شاعر اور ابوالفضل اور فیضی کے ہمعصر تھے۔ ان کے علاوہ ہاشم علی برہان پوری۔ کاظم علی۔ رام راؤ و یسوا بھی مشہور ہیں ؛

شعرائے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں مغلوں نے گول کنڈہ بیجاپور کو فتح کرنے کے بعد شعرا کے ساتھ ایسی مراعات برتیں۔ جن سے اُردو شاعری کو فروغ ہُوا۔ اس زمانہ کے مشہور شعرا کا حال مندرجہ ذیل ہے:۔

عاجز نام محمد علی تھا۔ ان کی تصنیفات سے قصہ فیروزشاہ۔ قصۂ لال و گوہر۔ اور قصہ ملکۂ مصر بزبان دکنی مشہور ہیں ؛

بحری نام قاضی محمود تھا۔ ان کے والد صوفی مشرب بزرگ تھے۔ فارسی اور دکنی میں مثنویاں۔ غزلیں۔ رباعیاں اور قصیدے ان کی تصنیف سے ہیں۔ اشعار کی تعداد پچاس ہزار بتاتے ہیں۔ جو تلف ہو چکے ہیں "من لگن" کے نام سے دکنی میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے ؛

امین شیخ محمد امین نام تھا۔ عہد اورنگ زیب میں گذرے ہیں۔ انہوں نے یوسف زلیخا کو دکنی میں نظم کیا ہے ؛

ولی دکنی سید محمد فیض نام تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ انہوں نے رتن پدم و روضۃ الشہدا نام مثنویاں لکھیں ہیں ؛

وجدی اس تخلص کے دکن میں دو شاعر ہوئے ہیں۔ ایک سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اور دوسرے بارھویں صدی میں۔ قطب شاہی وجدی نے تحفۂ عاشقان لکھی جو فریدالدین عطار کی مثنوی گل و ہرمز کا ترجمہ ہے۔ اور دوسرے وجدی نے فریدالدین عطار کی منطق الطیر کا ترجمہ "پنچھی نامہ" کے نام سے کیا ؛

آزاد فقیراللہ نام تھا۔ حیدرآباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے ہمعصر تھے ؛

شعرائے اورنگ آباد اورنگ زیب نے حیدرآباد کو فتح کر کے "کھرکی" کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اور اورنگ آباد اس کا نام رکھا۔ جو آخرکار ایک بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں علما اور فضلا جمع ہو گئے۔ اس

دور میں بہت سے شعرا گذرے ہیں۔ جن کے حالات مختلف تذکروں میں ملتے ہیں ؛

ولی
۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء

مولانا آزاد نے لکھا تھا کہ اُردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی ہیں لیکن قطب شاہیوں کے دیوانوں نے اس کی تردید کردی ہے اسمیں کوئی شک نہیں ولی نے اُردو شاعری کی بنیادوں کو پختہ کیا ہے۔ اس لئے ان کے معاصرین اور بعد کے شعرا اُن کو اُستاد مانتے ہیں ؛

نام میں اختلاف

ولی کے نام کے متعلّق مصنّفین میں اختلاف ہے۔ اس عہد میں شمس ولی اللہ احمد آباد میں مشہور صُوفی گذرے ہیں۔ اس لئے یہ غلط فہمی واقعہ ہوگئی۔ بعض شمس الدین نام اور ولی تخلّص بتاتے ہیں بعض کے نزدیک محمّد ولی نام شمس الدین لقب اور ولی تخلّص ہے۔ میرحسن۔ مرزا لُطف علی۔ اور نساخ نے شاہ ولی اللہ نام بتایا ہے۔ نواب علی ابراہیم یوسف علی اور مولانا آزاد نے شمس ولی اللہ نام لکھا ہے ؛

مقام پیدائش اور خاندان میں اختلاف

میرحسن وغیرہ کا خیال غلط ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے میر تقی نے ان کو اورنگ آباد کا بتایا ہے۔ ان کا خاندانی تعلّق اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے نہیں تھے۔ بلکہ اس سے بیعت رکھتے تھے اس خاندان کے شجرہ میں ان کا نام کہیں نہیں ملتا۔ بعض لوگ گجرات کی مفارقت پر ان کا ایک قصیدہ پیش کرکے ان کو گجراتی بتاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک اور قصیدہ سورت کے متعلّق بھی انہوں نے لکھا ہے۔ اس لئے ان کو اورنگ آباد ہی کا سمجھنا چاہئے ؛

حالات زندگی

اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ بیس سال تحصیل علوم کرکے احمد آباد گئے۔ شاہ وجیہ الدین کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اور انہی کے مرید ہوگئے۔ کچھ مدّت بعد اپنے وطن میں واپس آگئے۔ انہوں نے تقریباً سب اصناف سخن میں شاعری کی ہے ؛

ولی کے دو سفر

ولی ایک مرتبہ اورنگ زیب (۱۷۰۰ء) کے عہد میں دلّی آئے۔ اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے۔ دوسری مرتبہ (۱۷۲۲ء) محمّد شاہ کے عہد میں سیّد ابو المعالی کے ساتھ دہلی آئے

اس مرتبہ اپنا دیوان بھی ساتھ لائے جو دلی میں بہت مقبول ہوا۔ اور اس سے شاعری کا خوب چرچا پھیلا۔

تصانیف | انہوں نے شہدائے کربلا کی شان میں دہ مجلس کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ ہندی دیوان اور رسالہ نور المعرفت تصوف میں ہے۔ لیکن ملتا نہیں۔ (اب دیوان برآمد ہو گیا ہے)۔

وفات | وہ کچھ دنوں اورنگ آباد میں رہ کر احمد آباد میں چلے گئے۔ جہاں ۱۷۴۴ء میں انتقال کیا۔ جن لوگوں سے ان کو خاص تعلق تھا۔ ان کے نام ان کے اشعار سے ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں صحابۂ کبار کی تعریف ان کو حنفی مذہب ظاہر کرتی ہے۔ لیکن وہ کسی مذہب سے تعصب نہیں رکھتے۔ بلکہ صوفی منش فقیر مشرب بزرگ ہیں۔ جہاں جہاں وہ گئے ان مقامات کی تعریف بھی ان کے اشعار میں موجود ہے۔

انتقاد | ولی نے کسی بادشاہ کی شان میں اشعار نہیں کہے۔ ہاں فخریہ اشعار جا بجا ملتے ہیں۔ ان کی تصانیف باعتبار زبان اُردو ادب میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ عبارت نہایت سہل اور آسان ہے۔ روانی سادگی سلاست ترنم ان کے کلام کا جوہر ہیں۔ صنائع بدائع بھی بکثرت نہیں بعض شعر تو بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں۔

نمونۂ کلام

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے — زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے

دشمن دین کا دین دشمن ہے — راہزن کا چراغ راہزن ہے

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے — سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

خوب رو خوب کام کرتے ہیں — اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی — دل ہوا ہے مرا کباب سخن

عرفی و انوری و خاقانی — مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

داؤد | مرزا داؤد نام۔ ولی کے معاصر اور اورنگ آبادی تھے۔ ایک چھوٹا سا دیوان ان سے یادگار ہے۔

سراج سیّد سراج الدین نام اورنگ آباد کے رہنے والے تھے - آپ نے فارسی شعرا کے کلام کا ایک ضخیم انتخاب کیا - اس کے دیباچہ میں لکھا ہے - بارہ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک برہنہ پھرتے رہے اسی حالت میں فارسی اشعار بھی کہتے تھے - جو تحریر میں نہیں آسکے - آخر شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے مرید ہوئے - تقریباً پانچ ہزار اشعار اپنے برادر طریقت عبدالرسول خاں کی خاطر سے ریختہ زبان میں کہہ کر دیوان مکمل کیا - پھر مُرشد کے حکم سے فقیری لے لی اور شاعری ترک کردی -

سیّد سراج ایک گوشہ نشین پاکباز بزرگ تھے - آپ کے ہاں اکثر محفل سماع برپا ہوتی تھی - اور عمائدین حاضر ہوا کرتے تھے - میر غلام علی آزاد - عاجز - فطرت - رسا وغیرہ آپ کے ہمعصر تھے - باوجود گوشہ نشینی کے اکثر مشاعروں میں آتے تھے - انہوں نے کسی کی شاگردی نہیں کی - میر نے ان کو سیّد حمزہ کا شاگرد لکھا ہے - لیکن اس نام کا دکن میں کوئی شاعر نہیں ہوا ۔

تصنیفات دیوان فارسی - دیوان ریختہ اور ایک "منتخب دیوانہا" مثنوی بوستان خیال و گل و بلبل ان کی تصانیف سے ہیں ۔

انتقاد ولی کی طرح آپ کا کلام ایہام اور صنایع بدایع سے پاک ہے - تکلف اور بناوٹ بالکل نہیں - اکثر اشعار تصوف کے رنگ میں ہیں - وہ ولی کے قائم مقام ہیں - اور اُستادی کا رُتبہ رکھتے ہیں ۔

نمونۂ کلام

خبر تحیّر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا - جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی - نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے ایک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زبان سیں سے بیان کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

اس دور کے دیگر شعرا اس دور میں اور بھی بہت سے شاعر ہوئے ہیں - جن کے حالات مختلف تذکروں میں موجود ہیں - ان کے حالات بوجہ طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں - ان میں

عزلت اور عاجز زیادہ مشہور ہیں۔

احاطہ مدراس و ارکٹ کے شعرا

مولوی محمد باقر آگاہ۔ ویلوران کا مولد ہے۔ انہوں نے فقہ، سیر اور عقاید کی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ دربار ارکاٹ کے مدارالمہام شرف الملک محمد غوث اور ان کے خلف قاضی بدرالدولہ نے بھی اردو میں کتابیں لکھی ہیں۔ اس وقت شعرا میں محمود صبائی۔ احمد۔ اعظم وغیرہ مشہور تھے۔

باب ۵

اساتذۂ دہلی

حصۂ اول طبقۂ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

دہلی میں اردو کی ابتدا اور ترقی

اردو زبان نے دکن میں نویں صدی سے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ لیکن شمالی ہندوستان میں بارھویں صدی کے آغاز تک اردو محض کاروبار کے لئے بولی جاتی تھی۔ بابر۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ہندوؤں کی زبان پر فارسی عربی کے الفاظ چڑھے ہوئے تھے۔ اور بازاروں اور شاہی محلات میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔

عالمگیر کے زمانہ سے اردو شاعری شروع ہوئی۔ موسوی خاں فطرت۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا عبدالغنی اگرچہ فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن تفریح کے لئے اردو میں بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ محمد شاہ

کے زمانہ میں جب مُلک میں امن پھیلا تو صاحب فضل و کمال دہلی میں جمع ہو گئے - جن میں قزلباش خاں امید - شیخ سعد اللہ گلشن - مرزا عبد القادر بیدل - سراج الدین علی خاں آرزو خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اسی زمانہ میں ولیؔ - فراقیؔ - فخریؔ - اور آرزو دکن سے دہلی آئے - آخر یہی زبان اُردو معلّیٰ کا خطاب لے کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی ؛

اُردو لغات — تقریباً عالمگیر کے زمانہ میں لوگوں کو اُردو لغات کا خیال پیدا ہُوا - مُلّا عبد الواسع ہانسوی نے "غرائب اللغات" کے نام سے اُردو ہندی الفاظ کا لغات مرتب کیا - لیکن معنی فارسی میں لکھے - پھر سراج الدین علی خاں آرزو نے اسی کو تصحیح اور اضافہ کے ساتھ "نوادر الفاظ" کے نام سے موسوم کیا ؛

دلّی کے پُرانے شاعر — دلّی کے پُرانے شاعر آبرو - حاتم - ناجی - مضمون - مرزا مظہر فارسی کے شاعر تھے - لیکن اُردو میں ولی کی پیروی کرتے تھے - ان لوگوں نے زبان کی بہت بڑی خدمت کی وہ دکنی الفاظ جو ولی کے دیوان سے دہلی میں رائج ہو گئے تھے - انہی نے نکالے اور ان کی جگہ دلکش فارسی الفاظ اور محاوروں کو دی - حقیقتاً یہ کام نہایت جانفشانی کا تھا - جو انہوں نے انجام دیا -

ولی کے معاصر آبرو - یک رنگ - حاتم صنعت ایہام کے بہت شوقین تھے - یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت ہے - شاہ عالم کے زمانے میں مظہر - سودا - میر - اور قائم وغیرہ نے اس کو کم کیا - اور میر درد اور میر حسن کے عہد میں یہ صنعت بالکل خارج ہو گئی ؛

تصوف — اس زمانہ میں تصوف کا رنگ بہت غالب تھا - کیونکہ اکثر شعرا صُوفی مشرب تھے ادھر اُردو شاعری کی رہنما یعنی فارسی شاعری بھی تصوف میں ڈوبی ہوئی تھی - اور پھر دکن میں شاعری کی ابتدا مذہب سے ہوئی تھی ؛

سپاہی پیشہ شعرا — چونکہ سپاہی پیشہ لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے - اور وہ زمانہ بھی پُر آشوب تھا - اس لئے اکثر شعرا سپاہی پیشہ ہوتے تھے ؛

کلام میں یک رنگی کی کمی سبک و مبتذل الفاظ کی کثرت	اس عہد کے اکثر شعرا کا کلام یک رنگ نہیں ہے۔ سوقیانہ اور بھرتی کے الفاظ اشعار میں بکثرت ہیں۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی مظہر کے ہاں ایسے الفاظ

بہت ہیں۔ میر اور سودا کے ہاں بھی بھرتی کے الفاظ کہیں کہیں ملتے ہیں۔ رام بابو صاحب کا خیال ہے کہ اس وقت شاعری تفنن کے طور پر کی جاتی تھی۔ اس لئے ایسے الفاظ استعمال ہو گئے لیکن میرے نزدیک ہر عہد میں ایسے الفاظ رائج ہوتے ہیں۔ جن کو آنے والے لوگ مبتذل اور سبک کہہ دیا کرتے ہیں؞

شعرا کا طرز بیان اور ان کی خامیاں	ابھی نظم درجہ کمال کو نہیں پہنچی تھی۔ بلکہ قواعد عروض کی پابندی بھی اکثر نہیں کی جاتی تھی۔ ڈھیلی بندشش اور زوائد کی کثرت ہوتی تھی۔ البتہ سادگی اور

شیرینی بہت تھی؞

عربی فارسی الفاظ اور خیالات کا دخلہ اور بھاشا سنسکرت اور دکنی الفاظ کا اخراج	اس دور میں سنسکرت بھاشا اور دکنی الفاظ نکال ڈالے گئے۔ میر و سودا سے لے کر ناسخ کے عہد تک یہ اصلاح جاری رہی۔

ان بزرگوں نے حقیقت میں بڑی بھاری خدمات انجام دیں۔ لیکن بھاشا اور سنسکرت کے بہت سے شیریں الفاظ بھی نکال ڈالے۔ اور نئے نئے محاورات اور الفاظ بنا کر زبان میں داخل کئے؞

شاہ مبارک آبرو متوفی ۱۷۵۰ء	شاہ نجم الدین دہلوی نام۔ مبارک شاہ عرف۔ اور آبرو تخلص تھا۔ وہ گوالیار میں پیدا ہوئے۔ اور بچپن میں دہلی آئے خان آرزو کے شاگرد اور رشتہ دار تھے۔

ان کا دیوان تلف ہو چکا ہے۔

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

نہایت خلیق اور متواضع بزرگ تھے۔ ایک آنکھ سے معذور تھے۔ اس لئے مرزا مظہر اکثر چوٹیں کرتے تھے۔ پیر کھن سے بہت محبت رکھتے تھے۔

تذکرہ نویس ان کے کلام کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ وہ استعارات اور ایہام کے بادشاہ ہیں۔ کہیں کہیں کلام سبک اور مبتذل اور وسعت معلومات بھی کم ہے۔ انہوں نے پچاس سے

زیادہ کی عمر میں سنہ ۱۷۵۰ء میں وفات پائی۔

خان آرزو	سراج الدین علی خان نام تھا۔ خان آرزو کے عرف سے مشہور ہیں۔ وہ ہندوستان کے

مشہور نقادوں میں سے ہیں۔ میر تقی کے قول کے مطابق ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور شیریں زبان شاعر اس زمانہ میں نہیں تھا۔ میر حسن نے ان کو امیر خسرو کے بعد سب سے بڑا شاعر مانا ہے۔ مولانا آزاد آرزو کی زبان اُردو سے وہی نسبت بتاتے ہیں۔ جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ تھی۔ وہ فارسی کے شاعر تھے۔ اور اُردو میں کم کہتے تھے۔ میر۔ سودا۔ مظہر۔ درد ان کو اُستاد مانتے تھے۔ جوانی میں گوالیار میں منصب دار تھے۔ فرخ سیر کے عہد میں دہلی چلے آئے شیخ علی حزین کی متکبرانہ باتوں سے ناراض ہو کر انہوں نے تنبیہ الغافلین لکھی۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں سنہ ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ لیکن وصیت کے مطابق دہلی میں دفن کئے گئے۔

خان آرزو بڑے صاحب کمال شاعر تھے۔ ان کی قابلیت کا سب کو اعتراف ہے۔ ان کی تصانیف بکثرت ہیں۔ اور زبان اُردو ان کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم سنہ ۱۶۹۹ تا سنہ ۱۷۹۱ء	ظہور الدین نام۔ سپاہی پیشہ تھے۔ ولی کے دیوان کو دیکھ کر شاعری شروع کی اور اپنے زمانہ کے اُستاد ہو گئے۔ ان کو دہلی کے رنگ کا موجد سمجھنا چاہیئے

ان کے ۲ دیوان ہیں۔ ایک قدیم رنگ میں ہے۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ اپنے کلیات کو منتخب کر کے "دیوان زادہ" نام رکھا تھا۔ ایک دیوان فارسی بھی ان سے باقی ہے۔

انہوں نے ۴۵ شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ جن میں سودا۔ رنگین۔ نثار۔ تاباں۔ فارغ ان کے لئے باعث فخر ہیں۔ شاہ صاحب نے سب سے پہلے زبان میں سے بہت سے غیر مانوس الفاظ نکالے۔ ان کا کلام عاشقانہ عارفانہ صاف سادہ اور سلیس ہے۔ انہوں نے دہلی میں ۸۳ یا ۹۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

میر تقی ان کو "مرد جاہل و متمکن" لکھتے ہیں۔ مگر میر حسن کہتے ہیں کہ وہ صاحب کمال پسندیدہ افعال

اور عالی ہمت تھے۔ اور ان کی غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔

مضمون متوفی ۱۷۴۵ء	شیخ شرف الدین نام تھا۔ بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے۔ اکبر آباد کے رہنے والے اور سپاہی پیشہ تھے۔ بچپن میں دہلی میں آئے۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر

بڑے بامذاق اور اپنے زمانہ کے اُستاد تھے۔ ایک دیوان دو سو اشعار کا چھوڑا ہے۔

کلام پاکیزہ اور پُر لطف ہے لیکن فحش بھی ہے۔ استعارات اور ایہام بھی ہیں۔ آرزو کو کلام دکھاتے تھے۔ اگرچہ عمر میں ان سے بڑے تھے۔ چونکہ نزلہ سے سارے دانت گر گئے تھے اس لئے آرزو ان کو "شاعر بیدانہ" کہتے تھے۔

مرزا مظہر ۱۶۹۸ء تا ۱۷۸۱ء	شمس الدین نام۔ جان جاناں عرف۔ اور مظہر تخلّص تھا۔ باپ اور دادا منصب دار تھے۔ پردادا سے اکبر کی بیٹی منسوب تھیں۔ مانے ہوئے صوفی تھے۔ کلام

میں متانت۔ تاثیر۔ توحید اور رُوحانیت پائی جاتی ہے۔ سینکڑوں ہندو مسلمان ان کے مرید تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے جو اس زمانہ کے حسین ترین شاعر تھے۔ بہت محبت رکھتے تھے۔

آپ کی تہذیب۔ متانت۔ قناعت۔ پابندیٔ وضع علمیت ضرب المثل تھی۔ نوابوں کے عطیئے واپس کر دیتے تھے۔ حسن معانی کے ساتھ حسن صورت کے بھی مالک تھے۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ نویں محرم تھی۔ مرزا صاحب نے تعزیہ کے جلوس پر اعتراض کیا اس پر ان کو قرابین سے کسی ستم پیشہ نے مار ڈالا۔

آپ نے نہ صرف اردو زبان کو صاف کیا۔ بلکہ نئی فارسی ترکیبیں اور خیالات پیدا کئے۔ زبان میں قدیم ایہام گوئی ترک کر کے جدید رنگ پیدا کیا۔ مصحفیؔ اور شوقؔ نے آپکی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

آپکا کلام نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہے۔ اور جذبات۔ تاثیر اور تصوّف سے مالا مال ہے۔

ناجی	محمد شاکر نام تھا۔ سپاہ گری پیشہ تھا۔ ولیؔ۔ آبروؔ حاتمؔ کے معاصر تھے۔ انہوں نے نادر شاہ کو

دہلی برباد کرتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ اور نہایت دردناک شہر آشوب دیکھا۔ افسوس کہ عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ آرزو کا احترام کرتے تھے۔ نہایت تیز طبع اور ظریف تھے۔ اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالتے تھے۔

ان کا دیوان موجود ہے۔ زبان میں سلاست اور خیالات میں نزاکت ہے۔ اشعار میں استعارات اور ایہام کی کثرت ہے۔ اکثر اشعار فحش بھی ہیں۔

تاباں میر عبدالحی نام تھا۔ اپنے غیر معمولی حسن کی وجہ سے یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ ہمیشہ سیاہ پوش رہتے تھے۔ ان کے حسن کا شہرہ سن کر شاہ عالم ان کو دیکھنے گئے انہوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ کہتے ہیں۔ شراب نوشی سے استسقا ہو گیا تھا۔ میر صاحب نے بھی اپنے تذکرہ میں ان کی بہت تعریفیں کی ہیں۔

ان کا کلام عاشقانہ۔ شیریں اور رنگین ہے۔ خیالات نازک اور زبان صاف ہے۔ میر صاحب نے ان کو محمد علی حشمت کا شاگرد لکھا ہے۔ بعض حاتم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ لطف سودا کا شاگرد لکھتے ہیں۔

یکرنگ مصطفےٰ خان نام تھا۔ امرائے محمد شاہی میں سے تھے۔ بڑی عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ باکمال سخنوروں میں سے ہیں۔ کلام بلند ہے مگر استعارات بہت ہیں۔ بعض شاہ آبرو بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر وہ خود مرزا مظہر سے تلمذ ظاہر کرتے ہیں۔ دیوان عاشقانہ اور عارفانہ رنگ میں ہے۔

فغاں
متوفی ۱۷۷۲ء
اشرف علی خان نام تھا۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے رضاعی بھائی تھے۔ ظریف الطبع ہونے کی وجہ سے انہوں نے ظریف الملک کا خطاب پایا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے بعد مرشد آباد گئے۔ وہاں سے فیض آباد پہنچے۔ لیکن نازک مزاجی نے یہاں بھی نہ رہنے دیا۔ پٹنہ میں مہاراج شتاب رائے کے پاس بڑی عزت سے رہے آخر وہیں انتقال کیا۔

دیوان ریختہ اور دیوان فارسی یادگار باقی ہے۔ فغاں فارسی اور ہندی کے محاورات

بڑی خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ کلام واں پاکیزہ بلند اور نازک ہے۔ ایہام اور فحش خیالات سے پاک ہے۔ سودا اور میر دو نوں ان کے کمال کے معترف ہیں ؛

دیگر شعرا — اس زمانہ میں شاعری بہت رواج پا گئی تھی۔ میر تقی اور میر حسن کے تذکروں میں بہت سے شاعروں کا ذکر ہے۔ جن میں میر محمد حسین کلیم دہلوی قابل ذکر ہیں۔ وہ میر صاحب کے رشتہ دار تھے انہوں نے فصوص کا اردو ترجمہ اور ایک رسالہ عروض و قافیہ پر لکھا تھا ؛

باب ۶

اساتذۂ دہلی

حصہ دوم۔ طبقۂ متوسطین

میر اور سودا کا زمانہ

اردو شاعری کا زرین عہد — اس دور میں اردو شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی۔ میر حسن۔ درد۔ سودا اور میر اسی عہد کے زندہ جاوید شعرا ہیں۔ اس عہد میں تمام اصناف سخن انتہائے کمال کو پہنچے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان۔ سودا کے پُر زور قصاید۔ میر اور درد کی پُر درد غزلیں اپنا آپ جواب ہیں۔ آنیوالے دور کے علمبردار یعنی ذوق۔ غالب۔ آتش۔ ناسخ سب ان کو استاد مسلم الثبوت مانتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

زبان میں فارسیت کا غلبہ — اس میں فارسیت کا بہت غلبہ تھا۔ شعرا لہند میں لکھا ہے کہ اس وقت

اُردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی تھی۔ اور ہمارے شعرا بالکل ایرانی شعرا کی طرز میں کہتے تھے۔

سوداؔ اور میرؔ نے حافظ و سعدی سے استفادہ کیا۔ بعض نے ناصر علی۔ جلال اسیر۔ کلیم۔ بیدل۔ طالب آملی اور شفائی کی روش اختیار کی۔ اس دَور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کے ترجموں کی کثرت ہے۔ اور یہ اسی تقلید کا اثر ہے۔ سوداؔ اور میرؔ نے زبان کو نئی ترکیبوں اور محاوروں سے مالامال کیا۔ لیکن میر حسن نے اہلی زبان پر قناعت کی +

تذکیر و تانیث اس عہد میں الفاظ میں تذکیر و تانیث کی پابندی عاید کی گئی۔ نئی بحریں اور نئے اصناف سخن بنائے گئے۔ میر صاحب نے واسوخت مربع اور مثلث ایجاد کیا۔ قصائد اور ہجو کی تکمیل سوداؔ نے کی۔ اور بھرتی کے الفاظ کو کم کیا ؛

شعرائے دہلی کی لکھنؤ کو ہجرت افغانوں کے حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے میرؔ اور سوداؔ۔ میر حسن اور سوزؔ وغیرہ نے دہلی سے لکھنؤ کو ہجرت کی۔ جہاں ان کی خوب عزت افزائی ہوئی۔ لیکن دردؔ آخر دم تک دہلی میں قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے ؛

کلام کی خصوصیت اس عہد کے شعرا کے کلام میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیالی۔ اور سخیف الفاظ کے ساتھ شاندار الفاظ ملے جلے ہیں۔ میرؔ کے متعلق ایک تذکرہ نویس کی رائے ہے۔ کہ ان کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلیٰ ہیں۔ اس کا جواب غالباً یہ ہو سکتا ہے۔ کہ پُر گو شعرا کا کلام ہموار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ خواجہ میر درد کا کلام بیشتر اس عیب سے پاک ہے۔ کیونکہ وہ پُر گو نہیں تھے ؛

تذکرے اس عہد میں متعدد تذکرے لکھے گئے۔ میر صاحب نے نکات الشعرا اور میر حسن نے تذکرہ شعرائے اُردو لکھا۔ جو اب چھپ چکے ہیں۔ ان تذکروں سے اس زمانہ کے حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے ؛

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ تا ۱۱۹۹ھ سید خواجہ میر نام تھا۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے صاحبزادے تھے۔

جن کا ایک بڑا دیوان نالۂ عندلیب کے نام سے مشہور ہے سلسلہ نسب خواجہ بہاءالدین نقشبند سے ملتا ہے۔ خواجہ صاحب کے جدّ امجد بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔ لیکن ان کے والد ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ جوان ہو کر شاہی منصب دار ہوئے پھر دنیا ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علوم کیا۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ سپاہی پیشہ تھے۔ لیکن والد کے حکم سے ۲۸ برس کی عمر میں دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے ۳۹ برس کی عمر میں والد کی جگہ سجادہ نشین ہوئے۔ ذاتی تقدس اور سلسلۂ نسب کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک ان سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی لوٹ مار نے سب کو مختلف اطراف میں ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن خواجہ صاحب اللہ پر توکل کئے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھے رہے۔ آخر خواجہ صاحب نے ۱۱۹۹ھ میں چھیاسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

خواجہ صاحب کی آزادی اور استغنا کا اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کی مدح سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ بادشاہ تک ان کے دربار میں باادب حاضر ہوتے تھے۔ آپ کو موسیقی سے بڑا ذوق تھا۔ محرّم میں مجالس برپا کرتے تھے۔ بڑے بڑے ارباب تصوف اور اصحاب سلوک حاضر رہتے تھے۔ اور بہت بڑے بڑے مشہور ماہران موسیقی اپنے کمال کی داد لینے آتے تھے۔

تصانیف خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا بچپن سے شوق تھا۔ ان کی بہت سی تصانیف چھپ چکی ہیں۔ بیشتر کتب تصوف پر ہیں۔

دیوان اردو خواجہ صاحب کی زبان میر کی طرح صاف اور سلیس ہے۔ درد و اثر اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ تصوف ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ بیہودہ مذاق اور ہجو سے کلام پاک ہے کہیں کہیں پرانے محاورے اور الفاظ بھی استعمال کئے ہیں لیکن اس طرح کہ ان سے شعر کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ عاشقانہ رنگ نہایت بلند ہے۔ اور بوالہوسی سے پاک ہے۔ بقول مولانا آزاد

خواجہ صاحب اُردو کے چار رکنوں میں سے ہیں۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر نہایت شان اور احترام سے کیا ہے۔ میر درد کی متصوفانہ شاعری نے مابعد کے شعرا کے کلام پر گہرا اثر ڈالا ہے ؛

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت شاگرد تھے۔ جن میں قائم۔ ہدایت۔ فراق اور اثر مشہور ہیں ؛

میر سوز
۱۱۳۳ھ تا ۱۲۱۳ھ

سید محمد میر نام تھا۔ ان کے والد میر ضیاء الدین صاحبزادہ شاہ قطب عالم گجراتی کی اولاد میں سے تھے۔ اصلی وطن بخارا تھا۔ لیکن میر سوز دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ تیر اندازی میں مشاق۔ اور ورزش کے شوقین تھے۔ خوشنویسی اور فنون سپاہ گری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین مزاج تھے۔ اور نہایت خوش طبع شیریں زبان اور پابند وضع تھے۔ پہلے میر تخلص رکھا۔ پھر سوز اختیار کیا۔ شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی کی تباہی سے افسردہ ہو کر فرخ آباد آئے۔ وہاں کے نواب کی کچھ دنوں ملازمت کرنے کے بعد آصف الدولہ کے دربار میں گئے۔ وہاں جی نہ لگنے کے باعث مُرشد آباد کے دربار میں پہنچے۔ مگر پھر آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ آ گئے۔ اس دفعہ آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے۔ کچھ مدت بعد انتقال کیا۔ سنہ وفات پر تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ بہرحال تقریباً ۸۰ سال کی عُمر پائی ؛

طرز کلام دیوان غزلوں۔ مثنوی۔ رباعیوں اور مخمّس پر مشتمل ہے۔ انداز کلام نہایت سادہ بیساختہ اور بے تکلف ہے۔ آورد فارسی تراکیب۔ فضول تشبیہات استعاروں۔ اور لفظی صنائع بدائع سے پاک ہے۔ مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ وہ عاشقانہ رنگ کے بادشاہ ہیں اور ان کا کلام سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔ سادگی اور صفائی میں ان کا مقابلہ میر تقی سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر سودا بہت پیچھے ہیں۔ میر صاحب کے ہاں لُطف زبان کے ساتھ لطف مضامین اور جذبات بھی ہے۔ جو سوز کے ہاں نہیں ان کے اشعار کی بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ریختی کی بنیاد انہی نے ڈالی تھی ؛

میر سوز شعر اس انداز سے پڑھتے تھے۔ کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ چنانچہ ایکدفعہ شعر پڑھتے پڑھتے گر کر بیہوش ہو گئے تھے ؛

سودا	مرزا محمد رفیع نام تھا۔ آبا و اجداد کابل کے باشندے تھے۔ ان کے والد
۱۱۲۵ھ تا ۱۱۹۵ھ	مرزا محمد شفیع بہ سلسلۂ تجارت دہلی میں آکر مقیم ہوئے۔ اور مرزا رفیع وہیں

پیدا ہوئے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ کہ سودا نے باپ کی سوداگری اور عشقیہ ایشیائی شاعری کو مدنظر رکھ کر سودا تخلص رکھا تھا۔

مرزا نے تعلیم و تربیت دہلی میں پائی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد اور پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب اپنے اس شاگرد پر بہت فخر کرتے تھے۔ اگرچہ وہ خان آرزو کے شاگرد نہیں تھے۔ مگر ان کی صحبت سے اس قدر فیضیاب ہوئے۔ کہ فارسی میں بھی کہنے لگے تھے۔ مرزا کے کلام کا ہر جگہ چرچا تھا۔ چنانچہ شاہ عالم ان کے شاگرد ہوئے۔ کچھ مدت بعد مرزا ان سے ناراض ہو گئے۔ لیکن قدردانوں نے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی۔ نواب شجاع الدولہ نے بلایا لیکن سودا نے یہ رُباعی جواب میں لکھ دی اور نہ گئے ؎

سودا پئے دُنیا تو بہر سو کب تک　　آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دُنیا ہووے　　بالفرض ہُوا یُوں بھی تو پھر تو کب تک

گردش زمانہ سے مرہٹوں اور مغلوں کے حملوں سے دہلی برباد ہو گئی۔ مرزا کی عُمر اسوقت ساٹھ برس کی تھی۔ کہ دہلی سے فرخ آباد پہنچے۔ وہاں چند سال رہے۔ جب نواب احمد خاں کا انتقال ہُوا۔ تو فیض آباد پہنچ کر نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہو گئے۔ اب دارالسلطنت لکھنؤ قرار پایا۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ تو انہوں نے بھی مرزا کی خوب قدردانی کی۔

اس زمانہ میں مرزا فاخر مکین سے مرزا کی جنگ چھڑ گئی۔ لیکن نواب سعادت علیخاں ولیعہد نے فیصلہ مرزا کے حق میں کرا دیا۔ اس وقت مرزا کو ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ ملا۔ اور اُن کو نواب صاحب کے مزاج میں اتنا دخل ہو گیا۔ کہ ان کی صحبت کو محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے۔

تصانیف	مرزا کی تصانیف جملہ اقسام سخن میں بکثرت ہیں۔ انہوں نے تذکرہ شعرائے اُردو بھی

لکھا تھا۔ جواب نہیں ملتا۔ دیوان فارسی ردیف وار غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہے۔ دیوان اُردو میں ہر طرح کا کلام ہے۔ مرزا فاخر نے فارسی شعرا پر اعتراض کئے تھے۔ مرزا نے ان کا جواب عبرۃ الغافلین نام رسالہ میں دیا ہے ؛

سودا کا مرتبہ شاعری	سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے اُستاد مانے گئے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے

ان کو اقلیم سخنوری کا شہنشاہ۔ اور اُردو کا خاقانی اور انوری مانا ہے ؛

خدمات زبان	مرزا صاحب نے ہندی الفاظ کی درشتی کو دُور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان

میں حلاوت پیدا کردی اور اُردو زبان کو ادبی زبان بنایا۔ فارسی الفاظ کو اس خوبصورتی سے زبان میں داخل کیا کہ وہ اصل زبان کا جزو بن گئے۔ فارسی کی روش پر نئی نئی ترکیبیں اور محاورے ایجاد کئے۔ اور فارسی کی تلمیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات کو بھی زندہ رکھا ؎

نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو
کنہیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہر جائی

مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دوہروں کا رواج جو کسی قدر باقی رہ گیا تھا۔ وہ بالکل متروک ہو گیا ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
مُنکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

مرزا نے قصیدہ اور ہجو کی اُردو شاعری میں بنیاد ڈالی۔ اور ان کو اس درجہ کمال پر پہنچایا کہ کوئی ان کی برابری نہیں کر سکا ؛

مرثیہ و قصیدہ	مرزا سے پہلے بھی لوگ مرثیہ کہتے تھے۔ مگر اس میں محض مذہبیت ہوتی تھی۔ مرزا نے

اس میں اپنی شاعری کا کمال دکھایا۔ اور آنے والوں کے لئے ترقی کی راہیں کھولدیں۔

مرزا نے عرفی و خاقانی کے مقابلہ کے قصیدے لکھے ہیں۔ بلکہ نزاکت معنی اور طرفگی مضامین

ہیں ان سے کہیں بہتر ہیں ۔

ہجو مرزا نے بے انتہا ہجویں لکھی ہیں۔ گرمی کلام کے باعث وہ ظرافت کا ایک مستقل ذخیرہ ہیں۔ بڑھاپے تک ان کے مزاج کی یہ حالت تھی کہ جو دل میں آتی تھی بے خوف و خطر کہہ گذرتے تھے۔ حق یہ ہے انہوں نے اس مبتذل صنف کو ایک باقاعدہ فن بنا دیا۔ ہجوؤں کے مطالعے سے ان کی قوت بیان۔ قدرت زبان اور وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہر بات کی جزئیات کو مفصل بیان کرتے ہیں۔ ظرافت کو درد و اثر کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں کہ سننے والا خوب متاثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ان کے مخالفین کی لکھی ہوئی ہجویں کوئی سنتا بھی نہیں تھا۔ اور ان کی ہجویں بچہ بچہ کی زبان پر ہوتی تھیں ۔

کلام پر رائے مرزا کو زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام سانچے میں ڈھلا ہُوا معلوم ہوتا ہے ٹھوس ہے اور فصاحت سے بھرا ہُوا ہے۔ نئی نئی بحریں۔ نئے ردیف قافیئے۔ شگفتہ اور سنگلاخ زمینوں اور قافیوں میں ایسے شعر نکالے ہیں۔ جس طرح پتھر سے چشمہ نکلتا ہے ۔

سودا کا اثر بعد کے شعراء پر مرزا کی شعر گوئی نے بہت سی منچلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا مذاق پیدا کر دیا معاصرین کے علاوہ متاخرین بھی ان کو استاذ الاستاذ مانتے ہیں۔ ذوق نے سودا کے قصاید کو دیکھ کر ایسے بلند اور زوردار قصیدے لکھے۔ کہ قصیدہ گوئی سودا سے شروع ہوئی اور اُن پہ ختم ہو گئی۔ سودا نے زبان کی صفائی اور سچے جذبات کے بیان سے آنے والے لوگوں کے لئے ایک نئی شاہراہ کھولی اور مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر کی انہی نے رہنمائی کی ۔

کلام پر رائے ان کا دل اصلی جذبات سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ ان کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ بندش میں ڈھیلا پن کہیں نہیں۔ ہر لفظ نگینہ کی طرح پیوست ہے۔ خیالات بلند اور نازک ہیں۔ استعارے اور تشبیہوں کو اس طرح صرف کرتے ہیں کہ شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے زبان نہایت صاف اور پاکیزہ ہے چنانچہ زبان کو صفائی بخشنے والوں میں ان کا

نمبر سب سے اوّل ہے ٭

| شعرا کی رائیں | (۱) میر تقی نے اپنے تذکرے میں ان کی خوب تعریف کی ہے۔ اور بقول مولانا آزاد

میر صاحب نے مرزا کو پورا شاعر مانا ہے ٭

(۲) مرزا قتیل نے سودا کا مرتبہ قصاید میں ظہوری کے برابر مانا ہے لیکن مولٰینا آزاد نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ کہ ظہوری کے قصاید استعاروں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے۔ جو محاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے۔ اور قصائد اور ہجو دونوں خوب کہتا ہے۔

(۳) طبقات الشعرا میں مرزا کے قصائد کا عرفی اور خاقانی کے قصائد سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

(۴) میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا کے مقابلہ کا اب تک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اُٹھا۔

(۵) حکیم قدرت اللہ خاں بقا اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ مرزا سر آمد شعرائے فصاحت ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی کو نہیں پہنچتے۔ مرزا ایک بے کنارہ سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا پر برتری ہے۔ اور قوّت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیّت ہے۔

(۶) گلشن بے خار میں لکھا ہے " ان کی غزلیں ان کے قصیدوں سے۔ اور ان کے قصیدے ان کی غزلوں سے بہتر ہیں۔

(۷) شمس العلماء نواب امداد امام کا قول ہے۔ سودا اردو کے شکسپیر تھے۔

(۸) سر الفرڈ لائل نے سودا کو اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔

| کلام میں کمی | (۱) کلام میں تصوّف نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے معاصرین کے کلام میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کا مطالعہ دنیاوی معاملات تک محدود ہے۔

(۲) غزلوں میں سوز و گداز نہیں۔ جو غزل کی جان ہے۔ بلکہ شان ہے جو قصیدے کی خصوصیت ہے

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ	میر غلام حسن نام تھا۔ اور میر حسن کے نام سے مشہور تھے۔ میر غلام حسین ضاحک معاصر سودا ان کے والد تھے۔ جو نہایت زندہ دل اور ظریف تھے۔ ان کے

اجداد ایران سے ہندوستان آئے تھے۔

میر حسن اپنے زمانہ کے مشہور فاضل اور خوشنویس تھے۔ وہ پرانی دلّی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے پڑھے اور شاعری میں انہی سے اصلاح لی۔ بعد میں میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے۔ کچھ مدت وہاں رہ کر لکھنؤ آئے اور وہیں پیوندِ زمین ہوئے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ جن میں سے تین شاعر تھے۔ مشہور مرثیہ گو میر انیس انکے پوتے تھے۔

میر حسن عربی کم جانتے تھے لیکن فارسی کے زبردست عالم تھے۔ انہوں نے تذکرہ شعرائے اُردو نہایت عمدہ فارسی میں لکھا ہے۔ مولانا آزاد اور میر صاحب ان کو سودا کا شاگرد لکھتے ہیں لیکن وہ خود اپنے آپ کو میر ضیاء الدین ضیاء کا شاگرد اور خواجہ میر درد سودا اور میر کا پیرو بتاتے ہیں وہ نہایت خوش مذاق اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے انہوں نے کبھی اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

طرزِ کلام ان کا کلام غزل، رباعی، مثنوی اور مرثیوں پر مشتمل ہے۔ جو نہایت سادہ اور صاف ہے۔ مثنوی سحر البیان اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ غزلوں میں میر اور سوز کا رنگ جھلکتا ہے۔

مثنوی سحر البیان اس کو قصہ بے نظیر و بدر منیر بھی کہتے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ میں لکھی گئی۔ اور نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون ہوئی۔ یہ شاہزادہ بے نظیر اور شاہزادی بدر منیر کا عشقیہ افسانہ ہے۔ میر صاحب نے جزئیات نہایت خوبی سے بیان کی ہیں۔ اشعار نہایت صاف اور سادہ ہیں۔ جو اب تک لوگوں کی زبان پر رواں ہیں۔ کتاب کو لکھے ہوئے ڈیڑھ سو برس ہو چکے ہیں۔ لیکن زبان تا ہنوز تازہ ہے۔

دوسری مثنوی گلزارِ ارم ہے۔ اس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی تعریف ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی مثنویاں ہیں جو اب نہیں ملتی۔ انہوں نے کئی ایک ہجویں بھی لکھی ہیں۔ جو نہایت مہذب

اور پُر لطف ہیں۔ کچھ قصائد بھی ہیں۔ اور چند مرثیے اور سلام بھی ملتے ہیں ؎

تذکرۃ الشعرا یہ تذکرہ فارسی میں ہے۔ اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا ذکر ہے۔ اگرچہ تذکرہ مفصّل نہیں لیکن پھر بھی نہایت دلچسپ اور کار آمد ہے ؎

میر محمد تقی میر محمد تقی نام تھا۔ اور میر تخلّص۔ ان کو اُردو شعرا کا اُستادِ اعظم مانا جاتا ہے۔ والد کا نام میر عبداللہ تھا۔ جو دُنیا ترک کر کے درویش ہو گئے تھے۔ اس لئے علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے بزرگ حجاز سے سرحدِ دکن میں آئے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات پہنچے تلاش معاش میں میر صاحب کے پردادا اکبر آباد آئے۔ آب و ہوا کی ناسازگی سے وہ تو وہیں راہیِ عدم ہوئے۔ میر صاحب کے دادا فوجدار تھے وہ گوالیار گئے اور وہاں پیوندِ خاک ہوئے ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کو خلل دماغ تھا۔ جو جوان مر گیا۔ اور چھوٹے میر صاحب کے والد تھے۔ جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔

میر صاحب کے والد کا بعارضہ تپ انتقال ہُوا۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے تمام ترکہ پر قبضہ کر لیا۔ میر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو وہیں چھوڑا اور خود تلاش معاش میں دہلی پہنچے۔ سرکاری ملازم ہو گئے۔ لیکن نادر شاہی حملے میں نواب مارے گئے۔ اور وہ آگرے واپس آ گئے۔ فکر معاش میں پھر دہلی آنا پڑا۔ اس مرتبہ اپنے بھائی خانِ آرزو کے ہاں ٹھہرے لیکن انہوں نے بڑے بھائی کی تحریک پر کچھ تکلیف پہنچائی۔ جس کا میر صاحب کو سخت صدمہ ہُوا۔ یہاں تک کہ جنون کی سی حالت طاری ہو گئی۔ خیر حکیم فخرالدین خان کے علاج سے افاقہ ہُوا۔ آخر وہ خان آرزو کے ہاں سے نکل گئے۔ اور رعایت خان رئیس کے مصاحب بنے۔ جب احمد شاہ درانی کو سرہند پر شکست ہوئی تو میر صاحب رعایت خان کے ساتھ تھے۔ بعد میں ان سے کچھ رنجش ہو گئی۔ جس پر میر صاحب نے ملازمت ترک کر دی۔ لیکن خان صاحب نے ان کے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔

چند دنوں بعد میر صاحب نواب صاحب کے پھر ملازم ہو گئے اور اسی سلسلے میں وہیلوں

کی جنگ میں شامل ہوئے۔ نواب صاحب کے قتل کے بعد میر صاحب پھر بیکار ہو گئے۔ سکندر آباد کی لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ مہاراجہ ناگرمل کے بیٹے نے اُنکی معقول تنخواہ مقرر کر دی۔ جس سے فارغ البالی سے بسر ہونے لگی۔

دہلی کی بربادی میں میر صاحب کا گھر بھی لُٹ گیا۔ دہلی سے نکل کر کمہیر پہنچے جو سُورج مل جاٹ کا قلعہ تھا۔ سُورج مل نے میر صاحب کا کچھ روزینہ مقرر کر دیا۔ اس زمانہ میں میر صاحب دہلی بھی آئے لیکن شہر کو ویران پایا۔ پھر تین۳ سال بعد راجہ سُورج مل کے ساتھ آگرے پُہنچے۔ اور کچھ مدت رہ کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد میر صاحب حاکموں کے ساتھ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے آخر خانہ نشین ہو گئے۔ بادشاہ عالمگیر ثانی ان کو بُلاتے تھے۔ مگر وہ نہ جاتے تھے۔ غرض امراء کی مہربانیوں سے میر صاحب کی گذر اوقات ہوئے جاتی تھی۔

روانگی لکھنؤ

میر صاحب خانہ نشین تھے اور چاہتے تھے شہر چھوڑ دیں۔ لیکن زادراہ کے لئے کچھ نقد پاس نہ تھا۔ غرض نواب آصف الدولہ نے زادراہ بھیجا۔ اور میر صاحب لکھنؤ روانہ ہو گئے راستہ میں فرخ آباد کے رئیس نے میر صاحب کو اپنے پاس رکھنا چاہا۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ اور لکھنؤ پہنچے۔ جب نواب صاحب سے ملازمت حاصل کی تو وہ بہت خوشی ہوئے اور بغلگیر ہوئے اپنے شعر ان کو سُنائے۔ اور ان کے شعر خود سُنے۔ اور میر صاحب کا روزینہ مقرر کر دیا۔ پھر میر صاحب نے لکھنؤ میں بڑے آرام سے زندگی بسر کی۔

میر صاحب کی عمر

میر صاحب کی عمر میں تذکرہ نویسوں کو اختلاف ہے۔ مولانا آزاد نے سَو برس لکھی ہے لیکن سکسینا بابو ۸۰ یا ۹۰ برس کا اندازہ لگاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ نادر شاہی حملہ ۱۱۵۱ھ میں ان کی عمر ۱۴ یا ۱۵ کی ہوگی۔ مزہ یہ ہے کہ وہ اس عمر میں اس جنگ میں بحیثیت مصاحب کے موجود تھے۔ اور اعلیٰ خدمات انجام دے رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ اتنی عمر میں مصاحبت؟

ذکر میر ۱۱۹۷ھ

میر صاحب کے صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے تھے کیونکہ ان کی خود نوشت سوانح عمری کہیں نہیں ملتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ کتاب اب دستیاب ہو گئی ہے اور انجمن ترقی اردو نے

اس کو چھپوا دیا ہے اس سے میر صاحب کے بہت سے حالات معلوم ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب میر صاحب کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی، اس میں نادر شاہ کی جنگ ۱۱۵۱ھ سے ضابطہ خاں ۱۱۹۶ھ کے قتل تک کے حالات موجود ہیں۔ اس سے دہلی کی خانہ جنگیوں۔ مرہٹوں جاٹوں۔ روہیلوں اور افغانوں کی لڑائیوں۔ نوابانِ اودھ کے معرکے۔ عمائدین شہر کی سازشوں اور ہندو مسلم خوشگوار تعلقات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

سیادت میں اختلاف تذکرہ شورش ۱۱۹۳ھ میں مذکور ہے۔ کہ میر صاحب حقیقت میں سید نہیں تھے۔ لیکن میر تخلص نے ان کو سید بنا دیا۔ مولانا آزاد نے کہن سال بزرگوں سے روایت بیان کی ہے کہ جب میر تقی نے میر تخلص رکھا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید بن جاؤ گے۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی طرف سے لکھا ہے کہ ان کی سیادت میں شبہ نہیں کرنا چاہئے اور سند میں انہی کا یہ شعر پیش کیا ہے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

تعجب ہے سکسینا بابو کو "کہن سال بزرگوں" کی روایت اس قدر بُری کیوں معلوم ہوئی ہے۔ خیر ذکرِ میر نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ میر اصل نسل سید تھے۔ اور انکا مذہب شیعہ تھا۔ آبحیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نہایت نازک مزاج اور بد دماغ تھے۔ سکسینا صاحب نے پہلے اس کی تردید کی ہے اور آگے چل کر خود ہی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ میر واقعی بد دماغ تو تھے لیکن اس درجہ بد دماغ نہیں تھے۔ پہلے تو لکھتے ہیں کہ نکات الشعرا سے میر کی ادبی زندگی پر روشنی نہیں پڑتی پھر تھوڑی دُور چل کر لکھتے ہیں۔ کہ الحمد اللہ نکات الشعرا اور معاصرین کے تذکرے چھپ جانے سے بہت سے شکوک دُور ہو گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا ان میں سے کونسا بیان درست خیال کیا جائے۔

نکات الشعرا آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب کا دعویٰ تھا کہ میں نکات الشعرا میں ایک

ہزار شعرا کا حال لکھونگا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں ان بچاروں میں سے ایک بھی طعنوں سے نہیں بچا۔ ولی کے متعلق میر صاحب فرماتے ہیں کہ وے شاعریست از شیطان مشہور تر۔"

سکسینا بابو کہتے ہیں نکات الشعرا اب شائع ہوگئی ہے لیکن اس میں نہ تو سو سے زائد شعرا کا حال ہے۔ اور نہ اس قسم کی سخت تنقیدیں ہیں۔ لیکن حسن اتفاق سے پنجاب یونیورسٹی نے تذکرہ شعرا میر قاسم بھی چھپوا دیا ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد آبحیات پر سے یہ اعتراض ہٹ جائیگا کہ وہ کہی سنی باتوں کا ذخیرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آب حیات تذکرہ شورش اور تذکرہ میر قاسم سے ماخوذ ہے جو نہایت قابل اعتماد کتابیں ہیں۔

نکات الشعرا میں ہے کہ میر صاحب اور خان آرزو میں میر صاحب کے بڑے بھائی کے اکسانے سے رنجش ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ اُن کو بُرا بھلا کہتے رہتے تھے اور دشمنوں کی طرح کا سلوک کرتے تھے۔ یہاں تک کہ میر صاحب کو وہ گھر اور محلّہ بھی چھوڑنا پڑا۔ سکسینا صاحب کہتے ہیں۔ کہ اس دشمنی کا میر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ورنہ وہ تذکرہ میں ضرور لکھتے ناظرین خود ہی غور کرلیں۔ کہ ایسی صورت میں میر صاحب کب تک اپنی بد دماغی اور نازک مزاجی کو سنبھالے رہے ہونگے۔ درآنحالیکہ ان کی حالت جنوں کو پہنچ گئی تھی +

تخلّص کا جھگڑا مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ کہ میر صاحب نے میر تخلّص سوز سے چھینا تھا جو پہلے میر تخلص کرتے تھے لیکن سکسینا بابو کے نزدیک سوز نے یہ سوچ کر کہ ان کے اچھے اشعار میر صاحب سے منسوب ہو جائیں گے۔ اپنا تخلّص سوز رکھ لیا ہوگا۔ پتہ نہیں یہ قیاس آرائی کہاں تک درست ہے۔ اس موقعہ پر مولانا آزاد نے سوز کا ایک شعر بھی سند میں لکھا ہے +

میر صاحب کا کیریکٹر میر صاحب انتہا درجے کے خوددار اور حساس تھے۔ وہ امرا کے ارتباط کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ اس سے ان کی خودداری میں فرق آتا تھا۔ وہ بیحد ضعدار۔ کم گو۔ اور آزاد طبیعت انسان تھے۔ اور افلاس نے ان کو اور اعلےٰ ظرف بنا دیا تھا +

نازک دماغی سکسینا بابو لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو بابت

مبالغہ سے بیان کیا ہے۔ پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ راجہ ناگرمل جیسے قدردان کی ملازمت انہوں نے اس لئے ترک کر دی کہ جو معاہدہ انہوں نے اس کے ایماء سے شاہی امراء سے کیا تھا اس پر وہ کاربند نہیں ہوا۔ پتہ نہیں یہ بد دماغی نہیں تھی تو اور کیا تھا۔

میر صاحب نے رعایت خاں کی رفاقت اِس لئے ترک کی کہ انہوں نے گویئے کو تین چار شعر یاد کروانے کو کہا تھا۔ پھر ایک دفعہ عالمگیر ثانی نے بہت بلایا لیکن نہیں گئے۔

اس قسم کی مثالیں دینے کے بعد سکینا بابو لکھتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو طبعی تھا۔ دوسرے اپنی وضع کا پاس تھا۔ اور جب فقر و فاقہ درپے ہو تو وضعداری نبھانے میں نازک مزاجی آ ہی جاتی ہے۔ ان کی نازک دماغی دوسروں کی ہمدردی کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سریع الغیظ اور جلد برہم ہونے والے تھے اور اپنی کمزوری سے خود واقف تھے۔ اور اکثر اشعار میں اس طرف اشارہ بھی کرتے تھے ؎

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ

ع　از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

میر صاحب اپنے معاصر شاہ حاتم جیسے بزرگ کی نسبت یہ فقرات لکھتے ہیں "مردیست جاہل ومتمکن و مقطع وضع" لیکن مرزا سودا کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے سکینا بابو یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ ہر شخص کو اس ناروا داری اور کم بینی سے نہیں دیکھتے تھے۔ سبحان اللہ۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ تحریری روائتیں اور تقریری حکائتیں ثابت کرتی ہیں۔ کہ میر صاحب، حافظ اور سعدی کی غزلوں پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ تو اور کسی کی کیا حقیقت ہے" سکینا بابو لکھتے ہیں کہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نکات الشعرا مولانا کی نظر سے نہیں گذری بلکہ انہوں نے میر صاحب کے غرور اور بدمزاجی کی اکثر بے بنیاد روائتیں ضعیف اور ناقابل اعتماد تذکروں سے علی الخصوص تذکرۂ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لے لی ہیں ؂

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تذکرۂ شورش اور میر قاسم کو سکینہ بابو کیوں ناقابل اعتماد قرار دیتے ہیں۔ شاید اس واسطے کہ وہ ان کی اپنی نظر سے نہیں گذرے۔

کلام میں مایوسی اور درد میر ازل سے دردمند دل لے کر آئے تھے۔ ان کو سوائے رنج والم کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر والد کی درویشانہ زندگی اور یہ تلقین کہ بیٹا عشق کرو کہ عشق ہی سے یہ دنیا بنی ہے عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ اور عشق میں دل کو ہارنا کمال۔" میر صاحب خود کہتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میر شروع سے ہی مصیبتوں میں مبتلا رہے۔ دس برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تلاش معاش میں دہلی گئے۔ وہاں خان آرزو درپئے آزار ہوئے۔ بڑے بھائی پہلے ہی سے دشمن تھے یہاں تک کہ میر دیوانے ہو گئے۔ دلّی میں جب تک رہے نان شبینہ کے فکر میں پریشان رہے۔ پھر دہلی کی بربادی نے ان کو بھی برباد کیا۔ اور دربدر پھرایا۔

بہار بے خزاں میں لکھا ہے۔ کہ میر صاحب اپنے کسی عزیزہ پر عاشق ہو گئے تھے۔ آخر رسوائی کے خوف سے اکبر آباد سے لکھنؤ آ گئے۔ لیکن وہ شعلہ عشق ہمیشہ بھڑکتا رہا یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچی۔

تصنیفات میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں انہوں نے چھ دیوان غزلوں کے لکھے۔ دیوان فارسی ابھی تک نہیں چھپا۔ نکات الشعرا چھپ چکا ہے۔ دیوانوں میں جملہ اقسام سخن موجود ہیں۔ میر صاحب نے قصیدے بہت کم لکھے ہیں لیکن وہ سودا کی طرح زوردار نہیں۔ بات یہ ہے ان کی طبیعت غزل گوئی کے لئے مخصوص تھی۔ انہوں نے بہت سی عشقیہ مثنویاں بھی لکھیں جو مقبول عام ہوئیں۔

میر صاحب کی ایجادیں اردو میں میر صاحب واسوخت۔ مربع۔ مثلث وغیرہ کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔

خدمات زبان میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں اور ان کے ترجمے اردو میں داخل کئے۔ ان میں سے اکثر مقبول عام ہوئے اور بعض متروک ہو گئے۔

ریختہ میر کی اقسام شاعری (۱) ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی (۲) نصف مصرعہ ہندی اور نصف

فارسی (۳) حرف و فعل فارسی استعمال کرتے ہیں اور یہ قبیح ہے (۴) ترکیبات فارسی استعمال کرتے ہیں۔ جو ترکیب کہ زبان ریختہ کے مطابق ہو وہ جائز ہے۔ اور اس کو غیر شاعر نہیں جانتا (۵) صنف ایہام شاعران سلف میں رائج تھی۔ اب اس کا رواج کم ہو گیا ہے (۶) انداز شعر۔ اس کو ہر ایک نہیں سمجھ سکتا ؞

میر بحیثیت شاعر چونکہ اُردو شاعری تغزل کی مرادف ہے۔ اور میر صاحب غزل گوئی کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ اس لئے وہ اُردو کے شاعر اعظم ہیں۔ اگرچہ مثنوی نویسی میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن غزل گوئی میں وہ یکتا ہیں۔ ان کے اشعار صاف۔ سادہ۔ فصیح درد انگیز اور دلکش ہیں۔ ان میں انتہا درجہ کا ترنم ہے اور وہ جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ میر صاحب کے ۷۲ نشتر مشہور ہیں۔ لیکن ان کا تعین نہیں۔ ہر درد و اثر والے شعر کو لوگ نشتر کہتے ہیں۔ انکی چھوٹی بحروں کی غزلیں خاص طور پر شستہ درد انگیز اور لاجواب ہیں۔ حسرت۔ ملال۔ مایوسی۔ درد اور حزن ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اب تک تمام شعرا میر صاحب کو اُستاد الشعرا مانتے ہیں اور تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے کلام کی تعریفیں کی ہیں ؞

میر اور سودا میر صاحب کی شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں پر۔ اور سودا کی قبولیت ان کے قصیدوں اور ہجوؤں پر مبنی ہے۔ خواجہ باسط لکھتے ہیں۔ کہ میر صاحب کا کلام "آہ" ہے اور میرزا صاحب کا "واہ"۔

حقیقت یہ ہے کہ قسام ازل نے حزن و ملال میر صاحب کو دیا تھا۔ اور شگفتہ مزاجی اور فارغ البالی مرزا صاحب کے حصے میں آئی تھی۔ اس لئے دونوں اُستادوں کی شاعری اپنے مزاج اور ماحول کی صحیح صحیح آئینہ دار ہے۔ میر صاحب کے دماغ میں درد و اثر پیدا کرنے کے لئے نہایت نرم صاف سادہ اور زود اثر الفاظ کا ذخیرہ محفوظ ہے۔ جو غزل کے لئے نہایت موزوں ہے برخلاف اس کے قصیدے کے لئے نہایت زوردار اور شاندار الفاظ کی ضرورت ہے۔ قصیدہ کہنا ایک دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں۔ اس لئے میر صاحب اس میدان میں مرزا صاحب سے بہت پیچھے ہیں ؞

باب

اساتذۂ دہلی

طبقۂ متاخرین

انشا اور مصحفی کا زمانہ

اس دور کی ترقیاں اس دور میں گذشتہ دور کی نسبت شعر کی زبان اور بندش میں بہت زیادہ ترقی ہوئی پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہوگئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور تراکیب نے لی۔ زبان اردو میر انشاء کی بہت احسان مند ہے۔ کہ انھوں نے ہر حیثیت سے اسکی توسیع کی۔ مصحفی اور جرأت اگرچہ انشا کے ہمعصر تھے۔ لیکن قدما کے پیرو تھے۔

شاعری اور دربار پہلے شعرا درباروں سے وابستہ تو ہوتے تھے۔ لیکن وہ اپنی خودداری اور آزادی کو ہمیشہ برقرار رکھتے تھے۔ اس دور کے شعرا کی حیثیت رؤسا کے درباروں میں بالکل ملازموں کی سی ہوگئی۔ اس لئے شاعری امرا اور رؤسا کو خوش کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری پر اہل دربار کے مذاق کا بہت گہرا اثر پڑا۔ شعرا کی حیثیت نقالوں اور مسخروں کی بن گئی۔ شعرا میں آپس میں رقابت اور بدمزگیاں پیدا ہونے لگیں۔ جو بڑھتے بڑھتے اخلاق اور شائستگی کے حدود سے متجاوز ہوگئیں۔ چنانچہ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں۔

اس کے خراب نتائج اس درباری تعلق سے شاعری کی متانت پاکیزگی اور بلند خیالی مٹنے لگی۔ آئندہ ترقی کی راہیں بند ہوگئیں۔ اب تک شاعر عشق حقیقی سے سرشار نظر آتے تھے۔ لیکن اس

درباری تعلق سے عشق مجازی کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ اور شہوانی جذبات بے تکلفانہ نظم ہونے لگے۔ کیونکہ عیاش امرا اسی سے خوش ہوتے تھے۔ اور انعام دیتے تھے۔

دہلی کے شعرا بھی اگرچہ درباری ملازم تھے۔ لیکن ان کی شاعری ابھی تک عشق حقیقی سے معمور تھی۔ کیونکہ شاعری کی باگ ڈور شاہ گلشن۔ خواجہ میر درد اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے بزرگوں کے ہاتھوں میں تھی ؛

ریختی | ریختی اسی دور کی ایجاد ہے۔ اور حقیقتاً اس وقت کے مذاق کا صحیح ترین نمونہ ہے اس کے موجد سعادت یار خاں رنگین تھے۔ لیکن انشاء نے بھی اس کے رواج میں بہت کچھ حصہ لیا تھا۔ ریختی عورتوں کی زبان ہونے کی وجہ سے عیاشوں کو بہت مرغوب تھی۔ اس میں سوائے فحش اور مبتذل باتوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس عہد میں اگرچہ شیریں کلامی اور بلند خیالی میں کمی ہوگئی۔ لیکن بحیثیت فن شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ شعرا مشکل ترین بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرکے اپنے اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ جن میں درد و اثر مفقود ہے۔ لیکن وہ ان کے کمال کا اعلےٰ نمونہ ضرور ہیں ؛

ہزل گو | اس دور میں بہت سے ہزل گو بھی پیدا ہوگئے تھے۔ جن میں سے میر اٹل نارنولی۔ میر جعفر زٹلی۔ زٹلی چرکین۔ فسق میر غلام حسین برہان پوری شاگرد زٹلی وغیرہ قابل ذکر ہیں ؛

انشاء متوفی ۱۸۱۷ء | سید انشاء اللہ خاں انشا حکیم ماشاء اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کے بزرگ نجف سے آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ انشاء کے والد شاہی طبیب تھے۔ اور مصدر تخلص کرتے تھے۔ زوال سلطنت کے زمانہ میں وہ مرشد آباد گئے۔ جو نوابانِ بنگالہ کا دار الخلافہ تھا۔ انشا یہیں پیدا ہوئے۔

انشا نے علوم رسمیہ اپنے والد سے پڑھے۔ ان کو بچپن سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ اکثر اپنی طبع خداداد سے کام لیتے اور کبھی اپنے والد سے اصلاح بھی لے لیتے۔ وہ شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی آئے۔ شاہ عالم خود شاعر تھے۔ اور شاعروں کے بڑے قدردان تھے۔ انہوں نے سید انشا کو

بڑے اعزاز سے اہلِ دربار میں شامل کیا۔ انشاء نے اپنی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے شاہ عالم کے مزاج میں ایسا دخل پایا کہ وہ ذرا سی دیر کی جُدائی کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ آخر انشاء دربار کی تباہی اور مرزا اعظیم بیگ کے باہمی مناقشہ سے ایسے بددل ہوئے کہ لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ پہنچ کر انشا نے مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی۔ اور تھوڑے دنوں میں اپنی قابلیت کے زور سے مصحفی کی جگہ ان کے اُستاد بن گئے۔

نواب سعادت علی خاں

تفضل حسین خاں علامہ سعادت علی خاں کے مشیرِ کار اور سرکار انگریزی کے معتمد تھے۔ وہ سید انشا کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا۔ کہ سید صاحب مرزا سلیمان کے پاس نہیں رہنا چاہتے تو انہوں نے سعادت علی خاں سے سید صاحب کے کمالات کا ذکر کیا۔ نواب صاحب سید انشا کے بے انتہا مشتاق ہوئے۔ دوسرے دن خاں صاحب ان کو نواب صاحب کے پاس لے گئے۔ نواب صاحب بھی سید انشا کی پُرلطف صحبت کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ایک دم کے لئے ان کو جُدا نہیں ہونے دیتے تھے۔

افسوس کہ سید انشا ہمیشہ نواب کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکے۔ اکثر مذاق مذاق میں انشا کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتیں جو نواب کو مکدر کر دیتیں۔ چنانچہ ایک دن دربار میں شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا۔ نواب نے کہا۔ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں انشا کی زبان سے ایک دم نکلا "بلکہ انجب" سوءِ اتفاق سے انجب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں۔ اور سعادت علیخاں حقیقت میں لونڈی کے پیٹ سے تھے۔ اس بات پر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اور نواب کو یہ بات کھٹک گئی۔

اب انشا کی بات بات پر گرفت ہونے لگی۔ چنانچہ حکم ہُوا کہ وہ کسی امیر کے ہاں نہ جائیں صدمہ پر صدمہ یہ گذرا کہ جوان لڑکا تعالی اللہ خاں مرگیا۔ آبحیات میں لکھا ہے کہ اس سے انشا پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور اس اثناء میں ان کی تنخواہ بھی بند ہوگئی۔ اور فقر و فاقہ کی نوبت پہنچ گئی۔

حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے۔ جو سید انشا کے نواسے تھے کہ نہ تو سید انشا مجنون ہوئے اور نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ دربار میں بغیر بلائے نہیں آ سکتے تھے۔ اور نہ کہیں آنے جانے کے مجاز تھے "

خصوصیات کلام | انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے زبان کی بیحد توسیع کی۔ وہ پہلے ہندوستانی ہیں۔ جنہوں نے اُردو کی صرف و نحو دریائے لطافت کے نام سے مرتب کی۔ ان کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابو رکھتے تو اُردو کے اُستاد اعظم کہلاتے۔

(۱) ظرافت اور مذاق میں سوائے سودا کے ان کا کوئی ہم پلّہ نہیں۔

(۲) جامعیت۔ وہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے خاص رنگ سے رنگ دیتے تھے۔

(۳) علم و فضل۔ ہر قسم کے علوم پر ان کو عبور تھا۔ وہ پُر لطف قصّوں شعروں اور دلیلوں سے اپنے حریف کو ہر وقت مغلوب کر لیتے تھے۔

(۴) ذہانت و طباعی۔ ان کی قوت تخئیل بجلی سے زیادہ تیز تھی بات بات پر شعر کہتے اور سندیں پیش کرتے تھے۔

(۵) فارسی۔ عربی۔ پشتو۔ ترکی۔ مارواڑی۔ پوربی۔ پنجابی۔ کشمیری اور ہندی وغیرہ میں بھی شعر کہتے تھے۔

مشکل اور نئی چیزوں میں ان کو بڑا لطف آتا تھا۔ انہوں نے ایک دیوان غیر منقوطہ لکھا ہے اور کوئی ایسی شعری صنعت نہیں جو انہوں نے نہ باندھی ہو۔ ان کو اُردو کا امیر خسرو کہنا بیجا نہیں ہے۔

بعض اوقات غیر معمولی مشکل قوافی ان کے اشعار کو بھونڈا اور مہمل کر دیتے ہیں۔ جو مذاق سلیم پر گراں گذرتے ہیں۔ افسوس کہ اس زمانے کے گرے ہوئے مذاق نے ان کی شاعری کو بھی اسی مبتذل روش پر ڈال دیا تھا۔

(۶) ایجاد و اختراع کے لحاظ سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔

(۷) اپنے وطن کی قدیمی روایات سے ان کو خاص لگاؤ ہے۔

عیوب (۱) انشا کی مثنوی شیر برنج۔ تصوف اور مذاق کا بے جوڑ میل ہے۔

(۲) تناسب الفاظ کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔

(۳) کلام میں ہمواری نہیں ہے۔ غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت ہے۔

(۴) قصیدہ اور غزل گوئی میں وہ قواعد شعر سے بے پرواہی برتتے ہیں (کیا کریں مشکل زمینیں اور قوافی مجبور کرتے ہیں)

(۵) اظہار ظرافت پر قابو نہیں رکھتے امرا کو خوش کرنے کے لئے فحش زبانی کرتے ہیں۔ (یہ اسوقت کا رنگ ہے)

(۶) وہ شعر کے بلند درجہ پر فائز نہیں ہوئے۔ نہ کوئی ان کا اعلیٰ مطمح نظر تھا اور نہ ان کو کوئی پیغام اپنی شاعری کے ذریعہ دینا تھا۔ (یہ ماحول کا اثر تھا ورنہ ان کا تخیئل بہت بلند تھا دربار داری مانع تھی)

(۷) سارا کلام بیکار اور خراب ہے۔ اکثر عمدہ اشعار بھی ہیں جو مرتبہ میں کسی طرح کم نہیں (یہ پر گوئی کا نتیجہ ہے)

(۸) میاں بیتاب کی رائے ہے "انشا کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علی خان کی دربار داری نے ڈبویا۔

نوٹ۔ مفصل اور پُر لطف حالات دیکھنے ہوں تو آبحیات مصنفّہ مولانا آزاد پڑھئے ؎

تصانیف (۱) کلیات۔ دیوان اُردو۔ دیوان ریختی۔ قصائد اُردو فارسی۔ دیوان فارسی۔ مثنوی فارسی۔ بے نقط مثنوی فارسی۔ مثنوی شکار نامہ۔ مختلف مثنویاں۔ متفرّق اشعار۔ اور دیوان بے نقط پر مشتمل ہے (۲) کہانی ٹھیٹھ ہندی میں (۳) دریائے لطافت یعنی قواعد اُردو (۴) لطائف السعادت غیر مطبوعہ۔ (۵) بحر السعادت (غیر مطبوعہ)

تمام تصنیفات کی مجموعی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سید انشا بہ حیثیت ادیب اور

شاعر کے بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں اس قدر تنوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں۔ تصرف اور ایجادوں میں وہ مہارت تامہ رکھتے تھے۔

جرأت
متوفی ۱۲۲۵ھ

شیخ قلندر بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ اصلی نام یحیٰی امان تھا۔ والد کا نام حافظ امان تھا۔ سلسلۂ خاندان رائے امان سے ملتا ہے۔ جو محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں دربانی کی خدمت کرتے تھے۔ وہ نادر شاہی حملہ ۱۷۳۹ء میں مارے گئے دہلی میں کوچہ "رائے مان" جس کو آجکل کوچہ رحمٰن کہتے ہیں۔ انہی کے نام سے موسوم ہے۔

جرأت وطن سے بہت کمسنی میں نکلے تھے۔ ان کا بچپن فیض آباد میں گذرا۔ شروع میں نواب محبت خاں کی رفاقت میں رہے خود کہتے ہیں ؎

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

اس کے بعد ۱۲۱۵ھ میں مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ اور آخر تک لکھنؤ میں انہی کے دربار سے وابستہ رہے۔ ناسخ نے "ہائے ہندستان کا شاعر موا" تاریخ وفات کہی۔

مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ نجوم اور موسیقی کے خوب ماہر تھے۔ بچپن ہی میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چیچک سے ہوا مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ کہ جرأت عاشق مزاج بہت تھے۔ اور پری وشوں کی پُرلطف صحبتوں کے دلدادہ تھے۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کر دیا کہ میری بینائی جاتی رہی۔ اس بہانے رئیسوں کے گھروں میں اندھے بن کر جاتے۔ اور صنف نازک کی پُرلطف مجلسوں کا لطف اُڑاتے۔ آخراس عمل بد کی پاداشں میں وہ سچ مچ اندھے ہو گئے

جرأت کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ زبان عربی اور معمولی علوم وفنون سے ناواقف تھے لیکن شعر کا شوق اس قدر تھا کہ ہر وقت فکر شعر میں غرق رہتے تھے۔

تصانیف

ایک دیوان اور دو مثنویاں لکھی ہیں۔ دیوان میں غزلیں۔ فرد۔ رباعیاں۔ مخمس مسدس

ہفت بند۔ ترجیع بند۔ واسوخت۔ ہجو۔ سلام مرثیے غرض سب کچھ ہے۔

خصوصیات کلام جرات نے فارسی میں کچھ نہیں کہا۔ وہ ایسی محفل کے شاعر تھے۔ جہاں دور شراب چلتا تھا۔ اور عشق و عاشقی کے چرچے رہتے تھے۔ عاشقانہ رنگ اور معاملہ بندی ان کا خاص رنگ ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض اوقات فحش صورت اختیار کر لیتی ہے۔

میر اور جرأت باعتبار رنگ کے ان کا کلام میر صاحب سے ملتا جلتا ہے۔ جرات بھی عاشقانہ غزل کے اُستاد ہیں۔ لیکن میر کا سادرد ان کے کلام میں نہیں۔ جرات سطحی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں بازاری ناز و ادا۔ عشاق کی حرمان نصیبی۔ ہجر کی مصیبتیں۔ درباری رقابتیں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔

غزل سے ان کی طبیعت کو بہت مناسبت تھی۔ انہوں نے غزل گوئی میں میر صاحب کے رنگ کو اختیار کیا۔ اور اس کی شیرینی فصاحت اور بلاغت میں ایسی شوخیاں بھر دیں۔ کہ علیحدہ طرز بن گئی اور خاص و عام میں مقبول ہو گئی۔

میر کا تخیئل نہایت بلند اور عاشقانہ رنگ نہایت پاکیزہ ہے۔ برخلاف اس کے جرأت کا عشق ادنیٰ قسم کا ہے۔ میر کے قدردان سخن شناس ہیں اور جرأت کے دلدادہ عوام ہیں میرؔ میں متانت۔ خودداری۔ استغراق اور گوشہ نشینی تھی۔ اور وہ شاعری کو ایک معزز اور مقدس کام خیال کرتے تھے۔ برخلاف اس کے جرات ایک ظریف طبع اور خوش باش آدمی تھے وہ شاعری کو ذریعہ معاش سمجھتے تھے۔ اور اس فن سے اپنے دوستوں اور سرپرستوں کا دل خوش کر کے گذر اوقات کرتے تھے۔ وہ میر کی طرح علم و فضل کے جامع نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے لئے ایک ایسی راہ نکال لی تھی کہ ان کا کلام خاص و عام کو مرغوب تھا۔

ایک دفعہ مشاعرے میں میر صاحب بھی موجود تھے۔ جرأت نے غزل پڑھی ہر طرف سے واہ واہ ہوئی۔ جرات میر صاحب کے پاس آ بیٹھے اور ان سے اپنے کلام کی داد چاہی۔ میر صاحب نے تیوری چڑھا کر فرمایا "تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چاٹی کر لیا کرو"۔

جرات نے نظم اُردو کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین چھوڑ گئے تھے۔ ہمیشہ اس پر گام زن رہے۔ کہا جاتا ہے۔ وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ اسی حد تک درست ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا۔ جس کی تکمیل نواب مرزا خاں داغ نے کی ؞

مصحفی ۱۱۶۴ھ تا ۱۲۴۰ھ	شیخ غلام ہمدانی نام تھا۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے تھے۔ اور امروہے کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں ۱۱۹۰ھ میں وطن چھوڑ کر دلی آئے۔

تکمیل علوم کر کے شاعری کی طرف رجوع کیا۔ کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ مانگ کر کتابیں پڑھتے اور ان کا خلاصہ لکھ کر بطور یادداشت رکھ لیتے۔ ۱۱۹۵ھ میں ان کی شعر گوئی نے شہرت حاصل کی۔ وہ خود بھی مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ جن میں انشا۔ میر حسن اور جرات وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

بارہ۱۲ برس دلی میں رہ کر ٹانڈہ آئے اور نواب محمد یار خاں کے پاس رہے۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کی۔ تھوڑے دنوں بعد دلی چلے آئے۔ لیکن آب و دانہ پھر لکھنؤ کھینچ کر لے گیا۔ غرض اسی برس کی عمر میں انتقال کیا ؞

تصانیف	مصحفی اُردو اور فارسی کے پُر گو شاعر تھے۔ انہوں نے نظیری نیشاپوری کے جواب

میں ایک علیحدہ فارسی دیوان لکھا۔ اور ناصر علی اور جلال اسیر کے رنگ میں ۲دو اردو دیوان ترتیب دیئے جو چوری ہو گئے۔ انہوں نے ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک اُردو شعرا کا فارسی میں لکھا۔ نیز ایک شاہنامہ بھی لکھا ہے۔ جس میں شاہ عالم تک کے حالات درج ہیں۔

مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے آٹھ اُردو دیوانوں اور تذکرہ شعرائے اُردو پر مبنی ہے۔ تذکرہ میں تقریباً ساڑھے تین سو شعرا کا حال درج ہے ؞

خصوصیات کلام	(۱) مصحفی نہایت زود گو شاعر تھے۔ جب وہ شعر کہتے تو اس طرح معلوم ہوتا

کہ کچھ نقل کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے لئے بکثرت اشعار کہتے منتخب اشعار اپنے لئے رکھ کر باقی خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے۔ اس زود گوئی سے ان کے کلام میں ناہمواری پیدا ہو گئی۔

(۲) وہ مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ اور میر مستحسن خلیق ۔ضمیر ۔آتش۔ شہیدی وغیرہ ان کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے۔ ان جتنے شاگرد کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔

(۳) وہ قواعد نظم کے سختی سے پابند تھے۔

(۴) اِن کے کلام میں پر گوئی کی وجہ سے رطب و یابس بہت ہے۔ کلام میں ہمواری نہیں کہیں میر کا سوز و گداز ہے۔ کہیں سودا کی بلند پروازی۔ کہیں فغاں کی رنگینی کہیں میر سوز کی سادگی۔ کہیں جراَت کی شوخی۔ اور کہیں انشا کا رنگ جھلکتا ہے۔

اگرچہ سودا۔ میر اور سوز کے تتبع میں بہت سے اشعار ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی سی بات پیدا نہیں ہوئی۔ اور استاد تھے - مصحفی شاعر کم بلکہ استاد زیادہ تھے

(۵) مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہ متقدمین کے پیرو تھے۔ مختلف اصناف سخن میں انہیں کمال حاصل تھا، ملکی خصوصیات ان کے ہاں جراَت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں نہ تخیئل میں بلندی ہے۔ نہ جذبات میں دلکشی۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی کی ہے۔ اگرچہ زمانہ انشا اور جراَت کا پایا تھا۔

مصحفی اور سید انشا

مصحفی اور انشا کے معرکے تاریخ اُردو میں بہت مشہور رہیں۔ جو بسا اوقات مذمت سے گذر کر فحش کی حد تک پہنچ گئے تھے۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی۔ کہ پہلے مرزا سلیمان شکوہ کا کلام مصحفی درست کیا کرتے تھے۔ جب انشا پہنچے تو مرزا نے مصحفی سے سلسلہ تلمذ قطع کر کے انشا سے جوڑ لیا۔ بلکہ مصحفی کی تنخواہ بھی کم کر دی۔ یہ بات ان کو بہت ناگوار گذری۔ غرض مشاعروں میں نوک جھونک ہونے لگی اس کے بعد گالم گلوچ تک نوبت پہنچی۔ ایک دن مصحفی کے بہت سے شاگردوں نے شہدو نکا سوانگ بھرا۔ اور سید انشا کی ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے ان کے مکان کی طرف روانہ ہوئے

سید انشا کو خبر لگی - انہوں نے بجائے مقابلہ کرنے کے ان کا شاندار استقبال کیا۔ مٹھائیاں کھلائیں۔ اپنی ہجویں نہایت خندہ پیشانی سے سنیں - اور عزت و احترام سے ان کو رخصت کیا -

دوسرے دن سید انشا نے ایک شاندار جلوس ترتیب دیا۔ جس میں لوگ ڈنڈے بجا بجا کر مصحفی کی ہجو گاتے جاتے تھے - اور گڈے گڑیا کو لڑا کر یہ شعر پڑھتے جاتے تھے ۵

لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی اور مصحفن　　سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن

ان ہنگاموں میں اسوقت کے تمام معزز شعرا شامل تھے - بلکہ مرزا سلیمان شکوہ انشا کے ساتھ تھے اور مصحفی سے ناراض تھے ؛

رنگین ۱۱۶۹ھ تا ۱۲۵۱ھ	سعادت یار خان رنگین طہماسپ بیگ خان تورانی کے فرزند تھے - رنگین سرہند میں پیدا ہوئے - ان کے والد توران سے آکر پہلے لاہور میں ملازم

ہوئے - پھر دہلی آئے اور ہفت ہزاری کا منصب اور معزز خطابات پائے - رنگین نے پہلے مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کی - پھر دکن میں توپ خانہ کے افسر ہوگئے - آخر کار ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے -

وہ انشا کے بہت دوست تھے - بچپن ہی سے شعر کہتے تھے - پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے پھر میر کا شاگرد ہونا چاہا - لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا - کہ تم امیر لڑکے ہو تمہیں شاعری نہیں آسکتی - حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا کلام دکھاتے تھے - ایک جرمن مستشرق کی تحقیق کے مطابق انہوں نے مصحفی سے بھی اصلاح لی ہے -

چونکہ خود امیر اور خوبصورت تھے - اس لئے عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے تھے بے انتہا خلیق اور متواضع شخص تھے - انہوں نے تقریباً ۸۰-۸۱ برس کی عمر میں وفات پائی ؛

تصانیف | (۱) مثنوی دلپذیر - (۲) ایجاد رنگین (مثنوی) (۳) چار دیوان - (۴) مثنوی مظہر العجائب (۵) مجالس رنگین یعنی اس زمانے کے شعرا کے حالات اور تنقیدیں (۶) فرسنامہ یعنی گھوڑوں کی شناخت اور ان کے معالجے ؛

ریختی؟ | نساخ کی رائے ہے کہ اس خاص طرز کے موجد میاں رنگین ہیں۔ اور وہ خود بھی اس کے دعویدار ہیں۔ لیکن یہ طرز قدیم شعرائے دکن میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری وغیرہ کے ہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے۔ زیر بحث ریختی اور دکنی ریختی میں یہ فرق ہے کہ دکنی ریختی میں بھاشا کا اثر زیادہ ہے۔ چنانچہ اظہار عشق عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور خیالات حقیقی اور پاکیزہ ہیں۔ برخلاف اس کے میاں رنگین کی ریختی میں فحش خیالات اور الفاظ بکثرت ہیں۔ جن سے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا دارومدار عیاشی اور نفس پرستی ہے۔

ہندوستان میں پردے کی رسم۔ قدامت پرستی۔ عدم تعلیم و آزادی اور شرم و حیا کی وجہ سے عورتوں کی زبان قدرتی طور پر مردوں کی زبان سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس امتیاز سے انشا اور رنگین نے اپنے خاص اغراض کے لئے ریختی ایجاد کی۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا صحیح عکس ہے۔ لکھنؤ کے امرا کی عیش پسندیوں نے عیش و عشرت کی محفلوں کو فیشن میں داخل کر دیا تھا۔ بازاری عشق و عاشقی کو عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے یہ طرز مقبول خاص و عام ہوئی۔

جان صاحب | میر یار علی "جان صاحب" نے ریختی کو معراج پر پہنچایا۔ وہ میر امن کے بیٹے تھے۔ اصلی وطن لکھنؤ تھا۔ لیکن ملازمت کی وجہ سے رامپور میں رہتے تھے۔ اس خاص صنف میں وہ خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس پہن کر آتے تھے۔ اور بالکل عورتوں کی طرح پڑھ کر سننے والوں کو خوش کرتے تھے۔

جان صاحب تلاش روزگار میں دہلی اور بھوپال بھی گئے۔ لیکن آخرکار نواب کلب علی خاں والئے رامپور کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اور ستر برس سے زیادہ کے سن میں ۱۸۹۷ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

یہ صنف شاعری اب کوئی پسند نہیں کرتا۔ البتہ وہ ظریفانہ اشعار پسند کئے جاتے ہیں جو

تہذیب سے گرے ہوئے نہیں ہیں ؛

شاہانِ دہلی

شاہ عالم ثانی ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۶ء	آخر زمانہ کے شاہانِ دہلی شاعروں کے بہت قدردان تھے کیونکہ وہ خود بھی شاعر تھے۔ شاہ عالم ثانی آفتاب تخلص کرتے تھے۔ اور فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

سودا۔ میر۔ نصیر۔ انشا۔ ممنون۔ احسان وغیرہ سب ان کے دُعاگو شاعر تھے ؛

مرزا سلیمان شکوہ متوفی ۱۸۳۸ء	مرزا شاہ عالم شاہ ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ اور سلیمان تخلص کرتے تھے۔ غلام قادر نمکحرام کی بغاوت کے بعد دہلی سے لکھنؤ میں جا رہے تھے۔ نواب آصف الدولہ

ان کو چھ ہزار روپے ماہوار اخراجات کے لئے دیتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر ان سے جھک کر ملتے تھے۔ ۳۸ سال لکھنؤ میں رہے۔ پھر اکبر آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں کئی بار دہلی آئے۔ ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوئے۔

مرزا سلیمان شعرا کی بہت قدر کرتے تھے۔ پہلے شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ اس کے بعد مصحفی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ آخر میں انشا کے شاگرد ہوئے۔ دہلی سے جو اُٹھتا تھا۔ سیدھا ان کے دربار میں حاضر ہوتا تھا۔ اور وہ فیاضانہ سلوک کرتے تھے۔ مصحفی۔ قتیل۔ انشا اور میر حسن وغیرہ سب انہی کی سرکار سے وابستہ تھے ؛

اکبر شاہ ثانی ۱۷۵۹ء تا ۱۸۳۷ء	اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے جو ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے ۱۸۰۶ء میں تخت پر بیٹھے اور ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔

اکبر شاہ موزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص آفتاب کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے۔ خود شعر کم کہتے لیکن شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ نظام الدین ممنون۔ غالب علی خاں سید اور شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے ؛

بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر ۱۷۷۵ء تا ۱۸۶۲ء

اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار تھے۔ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ باپ کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے۔ اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد معزول ہو کر رنگون کو جلاوطن کئے گئے۔ جہاں ۱۸۶۲ء میں فوت ہوئے۔

ظفر شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ اپنا سارا وقت شاعری میں صرف کرتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر سے استفادہ سخن کرتے تھے انکے بعد ذوق کے شاگرد رہے ذوق کے انتقال کے بعد غالب کو اپنا کلام دکھاتے تھے فن موسیقی میں دسترس رکھتے تھے اور خوشنویس بھی اچھے تھے۔

ان کا کلیات بہت ضخیم ہے۔ ان کی اکثر غزلیں لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غالب اور ذوق ان کو غزلیں کہہ کر دیتے تھے۔ بہر حال ظفر کے کلام میں دونوں اُستادوں کا رنگ موجود ہے ٭

خصوصیات کلام

ان کا کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔ اس میں خاص درد و اثر ہوتا ہے۔ جو ان کے مصائب کی سچی تصویر ہے۔ خیالات بلند تشبیہیں رنگین اور جذبات دلنشین ہوتے ہیں۔ اکثر مشکل بحروں اور سخت قافیہ ردیف میں کہتے ہیں ٭

قائم چاند پوری متوفی ۱۲۱۰ھ

شیخ قیام الدین نام۔ چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں توپ خانہ کے داروغہ تھے۔ پہلے اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد میں سودا کے شاگرد ہوئے۔ انہوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد ٹانڈہ میں نواب محمد یار خان کے پاس جا رہے تھے۔ پھر رامپور چلے گئے اور وہیں ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا ٭

خصوصیات کلام

وہ اعلےٰ درجہ کے شاعر تھے۔ قطعات اور رُباعیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ پختگی کلام کی وجہ سے وہ اُستادوں کے دوش بدوش تھے۔ اور تذکرہ گلشن ہند میں مرقوم ہے کہ مضمون تراشی اور معنی بندی میں سودا اور میر کے بعد کسی سخن گو کا قائم جیسا اسلوب نہیں ہوا ٭

منت متوفی ۱۲۰۸ھ

میر قمر الدّین منت دہلی کے باشندے تھے۔ ننھیال کی طرف سے سیّد جلال

بخاری کی اولاد سے تھے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا فخرالدین سے حاصل کی اور شعروشاعری میں میر نورالدین نوید اور میر شمس الدین فقیر کی شاگردی کی۔

بہت پُرگو شاعر تھے۔ ایک کلیات تقریباً ڈیڑھ لاکھ اشعار کا ان کی یادگار ہے۔ ایک مثنوی شکرستان نام شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں فارسی میں لکھی تھی۔

۱۱۹۱ھ میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ یہاں سے مسٹر جانسٹن ان کو مارکوئس آف ہیسٹنگز کے پاس کلکتہ لے گئے۔ انہوں نے ملک الشعرائی کا خطاب دیا۔ ۱۲۰۰ھ میں گورنر جنرل نے ان کو ایک خاص سفارت پر حیدرآباد دکن بھیجا۔ وہاں نظام کی مدح میں قصیدہ پیش کرکے انہوں نے گراں بہا انعام پایا۔ حیدرآباد سے عظیم آباد آکر مہاراجہ ٹکیٹ رائے کی مصاحبت میں چند دن رہے۔ پھر کلکتہ آگئے۔ اور وہاں پہنچتے ہی ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا۔

ممنون
متوفی ۱۲۶۰ھ

میر نظام الدین نام تھا۔ اور میر قمرالدین منت کے بیٹے تھے۔ آباؤ اجداد سونی پت کے رہنے والے تھے۔ لیکن وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو فخرالشعرا کا خطاب دیا تھا۔

کچھ دنوں اجمیر میں صدرالصدور کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ پھر دہلی آگئے اور ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔ خود اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ اور مفتی صدرالدین خان آزردہ جیسے بلند مرتبہ لوگ ان کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان کمیاب ہے۔

حسرت دہلوی
متوفی ۱۲۱۷ھ

مرزا جعفر علی نام تھا۔ ابوالخیر عطار کے بیٹے تھے۔ شروع میں عطاری کرتے تھے۔ فن شعرگوئی میں انہوں نے ایسا کمال حاصل کیا کہ شاہ عالم ثانی کے مخصوص شعرا میں داخل ہوگئے۔ غلام قادر نمکحرام کی بغاوت انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اِس وقت کی لوٹ مار اور شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکلوانے کا منظر انہوں نے بہت دردناک پیرائے میں نظم کیا ہے۔

اس ہنگامے کے بعد حسرت فیض آباد آگئے۔ فیض آباد اس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا انہوں نے نواب شجاع الدولہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ۱۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دارالسلطنت ہؤا تو دوستوں کے اصرار سے حسرت لکھنؤ چلے گئے۔ میاں جرأت حسرت کے شاگرد تھے۔ اور اُستاد کے ساتھ رہتے تھے۔ حسرت امرا کی طرح پالکی میں سوار ہوتے تھے۔ اس لئے ہم عصر شعرا رشک کھاتے تھے۔ چنانچہ سودا نے بھی ان کی ہجو لکھی ہے۔

شاہزادہ سلیمان شکوہ بھی حسرت کو کچھ وظیفہ دیتے تھے۔ حسرت کے شاگرد اس قدر تھے کہ وہ خود پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ جرأت اور نواب محبّت خاں ان کے بہت مشہور شاگرد ہیں۔ حسرت نے ۱۲۱۷ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

خصوصیات کلام	تصنیفات میں ایک کلیات یادگار ہے۔ جس میں ہر قسم کے اصناف سخن موجود

ہیں۔ خاص انداز سخن یہ ہے۔ کہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں۔ اور اکثر غزل میں ایک ہی مضمون ہوتا ہے۔

قدرت متوفی ۱۲۰۵ھ	شاہ قدرت اللہ میر شمس الدین فقیر کے برادر عمزاد تھے۔ اور کوئی عجب نہیں کہ ان کے شاگرد بھی ہوں۔ نساخ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں اور

جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ اور حسرت... میر ب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے + (گل رعنا - ۲۱۵)

خصوصیات کلام	میر صاحب نے ان کو "عاجز سخن" کا خطاب دیا ہے۔ مگر میر حسن اور لطف نے اپنے

تذکروں میں ان کی بے حد تعریف کی ہے۔

نمونہ کلام	اگر میسّر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی اس طرف آواز طبل اُدھر صدائے کوس ہو

صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور   شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہو

بیدار متوفی ۱۷۹۴ء یا ۱۲۰۹ھ	میر محمد علی عرف میر محمدی بیدار تخلص کرتے تھے۔ خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد تھے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراخ سے اصلاح لیتے تھے۔ کہتے ہیں

شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں دہلی سے آگرہ گئے۔ جہاں ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا۔ بیدار۔ میر اور مرزا کے ہمعصر تھے۔ ان کے دو دیوان یادگار ہیں۔ کلام میں صفائی اور تصوف کا رنگ خوب ہے۔

نمونہ کلام

بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی | صحرا میں قیس۔ کوہ میں فرہاد رہ گیا

ربط جو چاہئے بیدار سو اس سے معلوم | مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت
متوفی ۱۲۱۵ھ

ہدایت اللہ خاں دہلوی۔ خواجہ میر درد کے شاگردوں اور مریدوں میں سے تھے۔ وہ ۱۲۱۵ھ میں فوت ہوئے۔ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ میر اور میر حسن ان کے کمالات شاعری کی تعریف کرتے ہیں۔

فراق

حکیم ثناء اللہ خاں نام تھا۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت کے بھتیجے تھے۔ خواجہ میر درد کے مرید اور شاگرد تھے۔ وہ مشاہیر زمانہ میں سے تھے۔ اور دہلی کے بڑے نامور حکیم تھے۔ مصحفی اور میر حسن ان کی تعریفیں کرتے ہیں۔ میر حسن سے ان کی بہت دوستی تھی۔

ضیا

میر ضیا الدین دہلوی سودا کے ہمعصر تھے۔ دہلی سے فیض آباد اور وہاں سے لکھنؤ اور عظیم آباد گئے۔ جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ ان کے شاگرد ہوئے انہوں نے پٹنہ میں انتقال کیا۔

خصوصیات کلام

مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ سنگلاخ زمین میں اشعار لکھنا اور نامقبول الفاظ کو مقبول بنانا انہی کا کام ہے۔ میر حسن نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ میر حسن ابتدا میں انہی کے شاگرد ہوئے تھے۔ ان کو قصیدے اور مثنوی کہنے کا شوق نہیں تھا سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہنے کے بہت مشتاق تھے۔

نمونہ کلام

صاف تھا جب تک تو ہم کو بھی جواب صاف تھا | اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگ خلق
اس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

بقا — متوفی ۱۲۰۶ھ

شیخ بقاء اللہ حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن بعد میں لکھنؤ میں جا رہے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اُردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اُردو میں بقا اور فارسی میں حزیں تخلص کرتے تھے۔ میر اور سودا کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور ان دونوں سے اکثر چوٹیں رہا کرتیں ؂

پگڑی اپنی سنبھالئیگا میر — اور بستی نہیں یہ دہلی ہے

میر و مرزا کی شعر خوانی نے — بسکہ عالم میں دھوم ڈالی ہے

کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا ہم نے جب زیارت کی

کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن — ایک تو تو کہے ہے ایک ہی ہی

مُفلسی سے تنگ آکر انہوں نے تسخیر کواکب کے اعمال شروع کئے۔ آخر دماغ خراب ہو گیا ۱۲۰۶ھ میں ہر طرف سے مجبور ہو کر عتبات عالیات کی زیارات کو چلے مگر راستہ ہی میں انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے زمانہ کے مشہور صاحب دیوان شاعروں میں سے تھے۔

حزیں

میر محمد باقر نام تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے بزرگ اُستاد سے بہت عقیدت رکھتے تھے ؂

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیں — حضرتِ اُستاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

مصائب روزگار سے تنگ آکر پٹنہ عظیم آباد پہنچے۔ وہاں نواب صولت جنگ نے بڑی قدر کی ایک دیوان یادگار ہے ؂

نمونہ کلام

کچھ کہا شاید اس نے قاصد سے — دل میں میرے وہ اضطراب نہیں

ہر نصیحت میں تری مانونگا اے ناصح پر ایک — دلبروں کے دیکھنے میں جی مرا ناچار ہے

بیان — متوفی ۱۲۱۳ھ

خواجہ احسن اللہ کشمیری النسل تھے۔ اور دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مرزا مظہر کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کی ملازمت میں عزت سے زندگی بسر کی ۱۲۱۳ھ میں وہیں انتقال کیا۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کی تعریف لکھی ہے۔ وہ رُباعیات خوب کہتے تھے ؎

نمونہ کلام

مصلحت ترک عشق ہے ناصح — لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو — اک بے خلل مکان ہو۔ بس میں ہوں۔ اور تو ہو

راسخ
۱۱۶۲ھ تا ۱۲۴۰ھ

شیخ غلام علی نام تھا۔ ۱۱۶۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ اور چہتّر برس کے سن میں وہیں انتقال کیا۔

شروع میں مرزا فدوی اور مرزا اثر کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر آخر میں میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے۔ میر صاحب بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ۱۲۱۲ھ تک کلکتہ۔ غازی پور۔ دلّی۔ لکھنؤ کی سیاحت کی۔ اس کے بعد اپنے وطن میں زمین گیر ہوئے اور شاعری کا مشغلہ بہت زور شور سے جاری کیا۔

زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف اور سادہ ہے۔ سادہ اشعار کے ساتھ رنگین اشعار بھی انکے کلام میں ملتے ہیں ؎

باب ۶

اساتذہ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

دربار لکھنؤ

اب شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ میں منتقل ہو گیا۔ اس کے اسباب مندرجہ ذیل تھے:-

(۱) سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہت کمزور تھے اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے ؎

(۲) نادر شاہی حملے نے قصر سلطنت کی بنیادوں کو ہلا ڈالا تھا ؎

(۳) ابھی نادر شاہی تباہی کے اثرات دُور نہ ہونے پائے تھے کہ احمد شاہ درّانی اور مرہٹوں کے قتل و غارت نے عوام میں افراتفری ڈال دی ؎

(۴) غلام قادر نمک حرام نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اور ان کو قید کر کے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا ؛

(۵) اس عام بدامنی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگ دہلی چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل گئے میر۔ سودا۔ میر حسن اور انشا وغیرہ بھی انہی دنوں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ پہنچے تھے۔

(۶) لکھنؤ کا دربار شعرا کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا ؛

بُرے نتائج (۱) اب سے پہلے شعرا آزاد ہوتے تھے لیکن نوابان لکھنؤ کی عیش پرستیوں نے ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور شعرا نے اپنی عزّت اور خودداری کو چند روپؤں کے لئے امرا کے ہاتھ بیچ دیا۔

(۲) درباری مصاحبت اور رفاقت سے مرتبۂ شاعری پست ہو گیا۔

(۳) شاعری محض رسمیات اور تکلّفات میں اُلجھ کر رہ گئی۔ اور الہامی اور عرفانی رنگ کھو بیٹھی میر۔ سودا۔ انشاء اور مصحفی پہلے بھی وظیفہ خوار تھے لیکن نہایت آزاد طبیعت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے دربار میں پہنچ کر ان کی شاعری امرا کے ہاتھ بک گئی اور وہ امرا کی پسند کے مطابق شعر کہنے پر مجبور ہو گئے ؛

طرز لکھنؤ لکھنؤ میں شاعری کا مذاق شعرائے دہلی نے پھیلایا تھا۔ شعرائے دہلی کے لکھنؤ میں جمع ہونے سے وہاں شاعری کا عام چرچا ہو گیا۔ بادشاہ شعرا کو بہت عزّت سے اپنی مصاحبت میں رکھتے اور بڑی بڑی جاگیریں دیتے تھے۔ غرض لکھنؤ میں عوام الناس اور امرا شاعری کے دیوانے ہو رہے تھے۔ روزانہ مشاعرے ہُوا کرتے اور شعرا خراج تحسین وصول کرتے تھے۔

ان مشاعروں سے شعرا میں جذبۂ تقابل پیدا ہو گیا جس سے ایک نئی طرز کی بُنیاد پڑی۔ کیونکہ جدت پسند طبیعتیں قدامت پرستی کو چھوڑ کر اپنے نام و نمود کے لئے نئی راہیں نکالنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ اس طرز جدید کے پیشوائے اعظم حضرت ناسخ ہیں۔ آجکل انکی طرز بھی نامقبول ہے اور اب شاعری ایک جدید طرز پر جاری ہے ؛

طرزِ لکھنؤ ناسخ اور ان کے معاصر اپنی تمام توجہ شعر کے حُسن ظاہری۔ رعایت لفظی اور صنائع بدائع پر صرف کرنے لگے۔ یعنی حسن الفاظ پر بلند خیالی اور مصوّری جذبات کو قربان کر دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا شعر کی بے تکلفی اور سادگی جاتی رہی اور تکلّف اور تصنع کی بھرمار ہونے لگی اثر اور درد کی جگہ اغراق۔ غلو اور دُور از کار تشبیہوں نے لے لی۔

اصل میں یہ رنگ صائب اور بیدل کے کلام سے اُڑایا گیا تھا صائب کی طرح پہلے مصرع میں دعوےٰ کیا جاتا اور دوسرے مصرع میں مثال پیش کی جاتی تھی بیدل کے تتبع میں نازک خیالیوں سے کام لیا گیا۔ لیکن اُردو میں یہ طرز گورکھ دھندا بن کر رہ گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لکھنؤ کی شاعری دماغ کو ضرور لُطف اندوز کرتی تھی۔ لیکن دل پر کوئی اثر نہیں کرتی تھی۔ اس طرز سے جدت پسند طبیعتیں بہت جلد اُکتا گئیں۔ اور انیس و دبیر کی جادو نگاری اور غالب اور مومن کی مضمون آفرینی سے لُطف اندوز ہونے لگیں۔

ناسخ اور ان کے شاگردوں کے کلام سے اس زمانہ کے نسائیت پسند مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے کلام میں سے عورتوں کی آرائش کے سامان کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار ہو سکتی ہے اور اکثر جگہ زبان بھی زنانہ ملتی ہے۔ شعرائے لکھنؤ ایک ایک زمین میں سہ غزلے اور چو غزلے کہتے تھے طوالت سے اکثر شعر میں بے لطفی اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خراب رسم کی بنیاد مصحفی اور جرأت نے ڈالی تھی۔

طرزِ دہلی زنانہ طرزِ گفتگو دہلی والوں کے کلام میں نہیں ہے۔ وہ جذبات کی تصویر نہایت پُر اثر۔ سادہ اور نرم الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ دہلی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے تھے۔ اور پامال فرسودہ خیالات سے بہت بچتے ہیں۔

تحقیق الفاظ کا زمانہ اس زمانہ میں شیخ ناسخ نے تحقیق الفاظ اور رعایت لفظی کو رواج دیا۔ یہ طرز لکھنؤ اور رامپور میں عام تھی۔ رشک۔ بحر۔ سحر۔ منیر۔ جلال۔ برق۔ واجد علی شاہ۔ اختر اور اسیر وغیرہ ہمیشہ صحیح الفاظ اور محاورے لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس چھان بین سے

بہت سے الفاظ نکال ڈالے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لغات شعر بہ بہت کم رہ گئے۔ اور زبان میں کرختگی پیدا ہوگئی کیونکہ ایک تو الفاظ کم تھے۔ دوسرے ان کو مخصوص انداز سے استعمال کیا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی اس جدید طرز نے دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں اختلاف پیدا کر دیئے۔ لکھنؤ والوں نے بعض محاورات اور الفاظ کو خاص محل پر خاص انداز سے استعمال کرنا شروع کیا۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ ہمارا طریقہ زیادہ فصیح ہے۔ ایسے اختلافات کا بڑھتے بڑھتے صرف نحو پر بھی اثر پڑا۔ بعض الفاظ کی تذکیرو تانیث میں بھی اختلاف ہو گیا۔ اس کی ابتدا میر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی تھی۔ ان کے بعد سے ابتک شعرائے دہلی اور لکھنؤ ان باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

ناسخ
متوفی ۱۸۳۸ء

ان کا نام شیخ امام بخش تھا۔ اُردو زبان کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے۔ ان کے خاندانی حالات معلوم نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں لاہور کے ایک مشہور دولتمند خدا بخش سوداگر خیمہ دوز کے متبنیٰ تھے۔ اسی سوداگر نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا اُٹھایا۔ پھر ان کو زہر دینے کی کوشش کی۔ وہ ان کو اپنا غلام کہتے تھے۔ آخر کچھ مصالحت ہوگئی۔ فارسی اور عربی انہوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرنگی محل سے لکھنؤ میں پڑھی تھی۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شاعری میں کس کے شاگرد تھے۔ کہتے ہیں میر کے پاس گئے تھے۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ وہ ان کے شاگرد تنہا سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن یہ تعلق بھی زیادہ مُدت قائم نہیں رہا۔ وہ مشاعروں میں بڑے زور شور سے غزلیں پڑھتے تھے۔ آخر زور کلام نے ان کو اُستاد بنا دیا۔ اور بہت سے لوگ ان کے پاس اصلاح کے لئے آنے لگے۔

شوق ورزش

ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑے قوی ہیکل سیاہ رنگ کے آدمی تھے ان کے حریف ان کو دُم کٹا بھینسا کہا کرتے تھے۔ خوش خوراک اس قدر تھے کہ پانچ سیر غذا ایک وقت میں کھاتے۔ لیکن کھاتے ایک ہی وقت تھے۔ روزانہ صبح اُٹھ کر ورزش کرتے۔

پھر نہا دھو کر اپنے دوستوں سے ملتے۔ قریب بارہ بجے کے کھانا کھاتے۔ اور تھوڑی دیر آرام کرتے۔ شام کو دوست احباب جمع ہوتے اور مشق سخن ہوا کرتی۔ رات کو فکر سخن کرتے۔ اور شاگردوں کی غزلیں وغیرہ درست کرتے تھے۔ اکثر لوگ ان کو پہلوان سخن کہتے تھے۔

لکھنؤ کے بڑے بڑے امراء ان سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ ناسخ نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ لیکن قدردانوں کی بدولت ہمیشہ آرام سے زندگی بسر کی۔ مشہور ہے نواب آغا میر نے ۱۸۳۱ء میں ان کو سوا لاکھ روپیہ دیا تھا۔

ایک مرتبہ غازی الدین حیدر بادشاہ نے ان کو اپنے دربار سے متعلق کرنا چاہا۔ اور خطاب ملک الشعرائی کا وعدہ کیا۔ ناسخ اپنی آزادی بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ کہلا بھیجا کہ نہ تو آپ کا شاہان دہلی جیسا مرتبہ ہے اور نہ سرکار انگریزی جیسا اقتدار پھر میں آپکا خطاب لے کر کیا کروں۔ بادشاہ اس حقارت آمیز جواب سے ناراض ہو گئے۔ اور ناسخ کو جلاوطنی کا حکم دیا۔

ناسخ لکھنؤ سے الہ آباد آ گئے۔ یہاں راجہ چندو لال دیوان حیدر آباد دکن نے بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور قدر و منزلت کے وعدے کر کے بلا بھیجا لیکن ناسخ نے وطن سے دور جانے سے انکار کر دیا۔ مشہور ہے ایک دفعہ پھر پندرہ ہزار روپے بھیجے۔ لیکن ناسخ نے پھر بھی انکار کر دیا۔

غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد ناسخ لکھنؤ واپس آئے۔ لیکن حکیم مہدی کی دشمنی کی وجہ سے پھر وطن چھوڑنا پڑا۔ اب کی مرتبہ فیض آباد۔ الہ آباد۔ بنارس۔ کانپور اور پٹنہ میں تھوڑی تھوڑی مدت رہے۔ آخر ۱۸۳۲ء میں حکیم مہدی نے انتقال کیا۔ اور ناسخ اپنے محبوب وطن میں واپس آ گئے۔ جہاں پندرہ سال رہ کر ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی۔ مصرع

دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے

تصانیف ناسخ کے تین دیوان ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ مدحیہ قطعات اکثر ملتے ہیں۔ ہجو اور مذاقیہ اشعار بھی ان کے دیوان میں نہیں ہیں۔ مثنوی سراج اور

ایک مولود بھی آپ کی تصنیف ہے۔ لیکن آپ کے مرثیہ کے برابر نہیں۔

ناسخ کا اثر ناسخ کی شہرت کے اسباب تین ہیں (۱) قادر الکلامی (۲) طرز جدید (۳) مشہور شاگردوں کی جماعت ناسخ اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت اور مستند شاعر تھے۔ وہ سودا اور میر کے زمانے کے الفاظ سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کے کلام میں یہ بڑا نقص ہے کہ انہوں نے الفاظ کی تحقیق میں زیادہ دقت نظر سے کام نہیں لیا اور عربی فارسی کے ایسے مشکل الفاظ غزلوں میں برت ڈالے جن کی غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ان کا کلام حسن ظاہری سے آراستہ ہے لیکن تاثیر سے خالی ہے۔

غزل ناسخ ناسخ کی غزلیں شاندار الفاظ اور نادر تشبیہات کا مجموعہ ہیں۔ مگر جذبات و اثر سے عاری ہیں۔ تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے حسن الفاظ کو وہ غرض اصلی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے مناسبت الفاظ کی نگہداری میں اصل مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں صائب اور بیدل کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے اشعار میں تصوف اور ظرافت نام کو نہیں۔ ان کی ہنسی بناوٹی اور مذاق پھُس پھُسا ہے۔ کہیں مذہبی حملے بھی کرتے ہیں اور طعن تشنیع سے کام لیتے ہیں لیکن یہ باتیں ان کی شان کے شایاں نہیں معلوم ہوتیں۔

تاریخ گوئی تاریخ گوئی میں ان کو خاص مہارت تھی۔ بات بات پر نہایت عمدہ اور دلچسپ تاریخ کہہ ڈالتے تھے۔ یہ تاریخیں اسی حیثیت سے زیادہ قابل قدر ہیں۔ کہ ان سے اکثر نامی گرامی شعرا اور مشاہیر کے سنین وفات اور خاص حادثات و واقعات کا پتہ چلتا ہے مثلاً گھسیٹے خاں کی تاریخ وفات کس قدر لطیف ہے

افسوس کہ موت نے گھسیٹا

قصیدہ ناسخ کو شکوہ الفاظ کا بہت شوق تھا۔ اور شکوہ الفاظ قصیدہ گوئی کی جان ہے۔ لیکن تعجب ہے۔ انہوں نے پھر بھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی بلند فطرت خوشامد درآمد کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اپنے آپ کو کسی رئیس کے دربار سے بھی وابستہ نہیں کیا۔

نقائص ان کے کلام میں بلند خیالات مفقود ہیں۔ ان کے شعر پڑھنے سے کوئی کیفیت طاری نہیں

ہوتی۔ اکثر اشعار بے لوچ ہیں۔ تصنّع اور تکلف بہت ہے۔ فارسی تشبیہات اُردو کا جامع بدل کر بھدّی معلوم ہوتی ہیں۔ ادق اور مشکل فارسی الفاظ طبیعت پر بہت گراں گذرتے ہیں۔ ہر جگہ شعر کی لفظی آرائش مقدم ہے۔ اسی لئے اکثر خیالات پست ہیں۔ ان پر سرقہ کا بھی الزام لگایا جاتا ہے۔ جو ان کی شان کے شایاں نہیں ،،

ناسخ کے کارنامے ناسخ اپنے تخلص کے اعتبار سے طرز قدیم کو مٹانے والے گنے جاتے ہیں۔ یہ شوق ان کے دل میں مرزا حاجی صاحب رئیس کی پُر لطف صحبتوں سے پیدا ہُوا تھا۔ اور حقیقت میں ناسخ کی شاعری کو اسی بزرگ کی وجہ سے بیحد فروغ نصیب ہُوا۔ بہرحال انہوں نے مندرجہ ذیل تغیرّات غزل میں کئے :-

(۱) سب سے پہلے لفظ اُردو بجائے ریختہ استعمال کیا۔ (۲) اکہری ردیف کی غزلیں کہیں (۳) افعال میں تغیرّ کیا مثلاً آئے ہے جائے ہے کی جگہ آتا ہے جاتا ہے استعمال کیا اور آئیاں دکھائیاں وغیرہ ترک کیا۔ (۴) قدما کے فحش الفاظ اور محاورات کو ترک کیا۔ (۵) عربی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو رواج دیا۔ (۶) ہندی لفظوں کو بے ضرورت خارج کیا۔ (۷) تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کئے۔

غرض انہوں نے غزل کا دائرہ وسیع کیا اور الفاظ کا صحیح استعمال مقرر کیا۔ وہ مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل کرتے تھے۔ اور شاگردوں کو بھی بہت تاکید کرتے تھے ،،

شاگرد ناسخ کے شاگرد تو بہت تھے۔ لیکن وزیر۔ برق۔ رشک۔ بحر۔ منیر۔ مہر۔ نادر۔ آباد ظاہر وغیرہ بہت مشہور ہیں ،،

برق ۱۸۵۷ء فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق۔ مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے۔ اور واجد علی شاہ بادشاہ کے مصاحب اور اُستاد تھے۔ بادشاہ سے ان کو بہت محبّت تھی۔ چنانچہ جب بادشاہ معزول ہو کر کلکتہ گئے تو وہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ آخر وہیں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا ،،

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک اور بنوٹ اور تلوار کے ہاتھ خوب جانتے تھے۔ وہ اپنے اُستاد ناسخ کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے کلام میں اُستاد کی طرح تصنع اور تکلف بہت ہے۔ مگر زبان پر قدرت اور شعر میں مزہ بھی ضرور ہے۔ ایک ضخیم دیوان یادگار ہے۔ جس میں تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ لکھنؤ کی تباہی بڑے دردناک پیرائے میں نظم کی ہے۔ جلال اور تسحران کے مشہور شاگرد تھے +

نمونہ کلام

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھُونکا   کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو   دیکھ لینا مجھے تم موسم گُل آنے دو

بحر
متوفی ۱۸۸۲ء

شیخ امداد علی بحر شیخ امام بخش کے بیٹے اور حضرت ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کی ساری عُمر پریشانی اور تنگدستی میں گذری۔ آخر نواب کلب علی خاں والئے رامپور کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ اور پچھتّر برس کی عُمر میں وہیں انتقال کیا۔

ان کے کلام میں پیچیدہ تمثیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں۔ مگر ناسخ کی طرح تصنع اور تکلف کی بھرمار نہیں۔ اکثر اشعار نہایت سادہ اور پُراثر ہیں۔ وہ صحت الفاظ اور تحقیق لغات کے اُستاد تھے۔ ناسخ اور رشک کے بعد ان کا بہت بڑا درجہ تھا +

نمونہ کلام

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا   مَیں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

افسوس عُمر کٹ گئی رنج و ملال میں   دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

آباد

مرزا مہدی حسن خاں آباد مرزا غلام جعفر کے بیٹے اور نوابان فرخ آباد کے رشتہ دار تھے۔ اور لکھنؤ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ وہ ۱۲۲۶ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی کے بڑے شوقین تھے۔ اپنے مکان پر باقاعدہ مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ نہایت پُرگو شاعر تھے۔ ۲ دیوان یادگار ہیں۔ ان کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں۔ کہیں کہیں کوئی شعر پھڑکتا ہُوا نکل آتا ہے +

خواجہ وزیر
متوفی ۱۲۷۰ھ

خواجہ محمد وزیر نام اور وزیر تخلص تھا۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ خواجہ محمد فقیر انکے والد تھے ددھیال کی طرف سے حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند کے خاندان سے

متعلق ہیں۔ لکھنؤ میں خاندانی وقار اور ذاتی تقدس کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں گوشہ نشین ہو کر شعر و سخن سے نفرت کرنے لگے تھے۔ تسخیر اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقش بھرا کرتے تھے۔ تنور و پیہ ماہوار خرچ تھا۔ مگر آمدنی کہیں سے نہ تھی۔ آزاد طبع اس قدر تھے۔ کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا۔ لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ آخر کار ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔

وفات کے بعد شاگردوں اور دوستوں نے کلام ترتیب دے کر چھاپا۔ خواجہ وزیر اپنے استاد کے محبوب ترین شاگرد تھے۔ استاد کی طرح مشکل طرحوں میں طبع آزمائی کرتے تھے وہ اپنے عہد کے بلند مرتبہ شاعر سمجھے جاتے تھے۔

نمونہ کلام

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

نہ کر نظر مرے جرم و گناہ بیحد پر — الٰہی تجکو غفور الرحیم کہتے ہیں

کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج — یہاں کے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

رشک
متوفی ۱۲۸۴ھ

میر علی اوسط رشک میر سلیمان کے بیٹے تھے۔ ان کے بزرگ فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن پرورش لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں ان کی شاعری کی شہرت ہوئی۔ وہ ناسخ کے مشہور و معروف شاگرد تھے۔ انکی شہرت زیادہ "نفس اللغہ" پر مبنی ہے۔ یہ لغات فارسی میں ہے۔ اس میں اردو اور ہندی الفاظ کی تحقیق بڑی احتیاط سے کی گئی ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے۔ جن میں منیر مشہور ہیں۔ منیر پہلے ناسخ سے اصلاح لیتے تھے۔

رشک کچھ دنوں کانپور میں رہے۔ پھر کربلائے معلیٰ چلے گئے۔ آخر وہیں ستر برس کی عمر میں ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی ۔۔

خصوصیات کلام

رشک کا رنگ وہی ہے جو ناسخ کا تھا۔ ان کے ہمعصروں کی طرح ان کا کلام بھی پھیکا اور بے مزہ ہے۔ وہ صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جو لفظ جس طرح بولا جاتا ہے

اس کو اکثر اسی طرح نظم کرتے تھے۔ مثلاً آپ ہی کی جگہ "آپی" وغیرہ وغیرہ انکے کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی نہیں ہے۔ بالکل معمولی انداز سے معمولی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ بہت پُرگو شاعر تھے۔ اِن کا کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت کی اُلجھنوں میں اُلجھا ہُوا ہے ۔

نمونہ کلام

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں ۔۔۔ وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں

پُرزوں میں دستخط کروں کیا حال ۔۔۔ ایک دو تین چار تاؤ نہیں

میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب ۔۔۔ پاؤ روٹی ہے نانپاؤ نہیں

مہر
متوفی ۱۸۷۹ء

مرزا حاتم علی بیگ مہر ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور اصفہانی خاندان کے فرد تھے۔ اِن کے دادا مرزا مراد علی خان نے نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے رکن الدولہ کا خطاب پایا تھا۔ اور والد ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں علی گڑھ میں تحصیلدار تھے۔ والد کا انتقال صغر سنی میں ہو گیا تھا۔ مہر چودہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ جب اِن کے بھائی مرزا عنایت بیگ ماہ آتش کے شاگرد ہوئے تو انہوں نے ناسخ کو اپنا اُستاد بنایا۔

۱۸۴۷ء میں امتحان پاس کر کے چنار گڑھ میں منصف ہوئے اور یہ شعر کہا ؎

ازبسکہ سوز ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم ۔۔۔ منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

وہ ہائی کورٹ کے وکیل بھی رہے۔ غدر میں انہوں نے چند انگریزوں کو پناہ دی تھی اس صلے میں سرکار انگریزی نے خلعت اور دو گاؤں جاگیر عنایت کئے۔ اس کے بعد وہ آگرے میں آنریری مجسٹریٹ ہو گئے۔ اور وکالت بھی کرتے رہے۔ انہوں نے ۱۸۷۹ء میں ایٹہ میں انتقال کیا۔

مہر مذہب امامیہ رکھتے تھے۔ اور غیر متعصب تھے۔ غالب۔ انیس۔ دبیر۔ صبا۔ منیر وغیرہ سے دوستی تھی۔ اردوئے معلّٰی میں غالب کے اکثر خطوط ان کے نام موجود ہیں۔ بنارس کے راجہ بلونت سنگھ ان کے شاگرد تھے۔ اور پچاس روپے ماہوار دیتے تھے ؎

تصانیف

مہر کی اکثر تصانیف غدر میں ضائع ہو گئیں۔ اب (۱) دیوان اردو (۲) پیرایہ عروض

(۳) ایاغ فرنگستان - (۴) مثنوی داغ نگار (۵) داغ دل مہر - (۶) مثنوی شعاع مہر وغیرہ انکی یادگار ہیں ؛

خصوصیات کلام | وہ پُرگو شاعر تھے - تاریخ خوب کہتے تھے - ان کے کلام میں سلاست - روانی - تناسب اور زبان پر قدرت ہے - بعض اشعار نہایت عمدہ اور پُر لطف ہیں ؛

منیر متوفی ۱۸۸۱ء | سید اسمٰعیل حسین نام تھا - اُن کے والد سید احمد حسین شاد شکوہ آباد ضلع پوری کے رہنے والے تھے -

منیر لکھنؤ میں عرصے تک رہے - اُردو میں تعلیم و تربیت پائی - پہلے ناسخ سے خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے تھے - جب ناسخ لکھنؤ سے کانپور آئے تو منیر نے باقاعدہ ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا - وہ ان کے مشورے سے رشک سے بھی اصلاح لیتے تھے - لکھنؤ کی دلچسپیاں ان کو ہر سال لکھنؤ کھینچ بلاتی تھیں - ایک دفعہ کچھ مدّت کے لئے ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں (لکھنؤ) کے ملازم ہو گئے - لیکن پھر کانپور چلے گئے - پھر لکھنؤ آئے اور نواب سید محمد ذکی خاں کے رفقا میں داخل ہوئے ان کو اصلاح بھی دیتے رہے - دو سال بعد نواب تجمّل حسین خاں کے بُلائے فرّخ آباد چلے گئے - اور ان کے جیتے جی ان کے ساتھ رہے - پھر مہاراجہ الور نے بُلایا لیکن وہ والئے باندہ کی ملازمت کر چکے تھے - غدر کے بعد ان پر ایک رنڈی کے قتل کا مقدّمہ چلا - اور ان کو کالے پانی کی سزا ہوئی - آخر ۱۸۶۰ء میں رہائی پائی - پھر رامپور میں آ رہے جہاں ۱۸۸۱ء میں انتقال ہوا ؛

خصوصیات کلام | تین دیوان یادگار ہیں - بہت پُرگو شاعر تھے - مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے - قصیدے بہت زوردار کہتے تھے - رنگ وہی ناسخ اور رشک کا سا تھا - اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخیّل ہے - قطعات و رُباعیات بہت صاف اور سادہ ہیں - غزلوں میں پُورا لکھنؤ والوں کا رنگ ہے - مختصر یہ کہ منیر کا مرتبہ اس زمانہ کے شعرا میں بہت بلند تھا ؛

آتش
متوفی ۱۲۶۳ھ

خواجہ حیدر علی آتش خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ جو دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دہلی سے فیض آباد آکر آباد ہوئے تھے۔ آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اسی وجہ سے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے محروم رہے بُری صحبت سے بانکے اور شوریدہ سر ہوگئے تھے وہ نواب مرزا تقی خاں کے ملازم ہوکر ان کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ وہاں مصحفی اور انشا کے زوردار مقابلے دیکھ کر شعر گوئی کا شوق ہوا۔ آخر مصحفی کے شاگرد ہوئے اور چند دنوں کی مشق سے صاحب طرز بن گئے۔

ناسخ و آتش

آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان میں تکلّف اور تصنع بالکل نہیں تھا عاشق مزاج، حُسن پرست اور آزاد طبع تھے۔ سپاہیانہ لباس پہنتے تھے۔ ہر وقت تلوار لگی رہتی تھی۔ ان میں بانکپن بہت تھا۔ قناعت اور توکّل سے زندگی بسر کرتے تھے۔ شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے۔ وہ خود کبھی دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے اسّی رُپے ماہوار ملتے تھے۔ ایک شکستہ مکان میں رہتے تھے۔ وضعدار اور خوددار تھے منکسر المزاج اور خلیق ہونے کے باوجود امرا سے تنتے تھے۔ آخر دنوں میں مصحفی سے بگاڑ ہوگیا تھا اس زمانہ میں لکھنؤ آتش اور ناسخ کے ہوا خواہوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اس مقابلہ کی وجہ سے دونوں اُستاد خوب طبیعت کا زور دے کر کہتے تھے اور نہایت لطیف پیرائے میں آپس میں نوک جھوک بھی ہُوا کرتی تھی ؎

ناسخ ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب | بو مسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب
آتش کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب | جسنے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

پھر بھی آتش ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے مشہور ہے۔ کہ ناسخ کے بعد انہوں نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔

خصوصیات کلام

ان کا کلام تخلّص کی طرح گرم ہے۔ تصنع اور تکلّف بالکل نہیں۔ خیالات بلند ہیں اور ابتذال سے پاک شعروں میں فضول تمثیلیں نہیں ہیں۔ وہ سادے اور صاف الفاظ کو

موتیوں کی طرح پروتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک ہے۔ محاورات کا استعمال نہایت برمحل اور صحیح ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں میر جیسی تڑپ نہیں لیکن پھر بھی لاجواب ہیں۔ میر اور غالب کے بعد انہی کا درجہ ہے۔ جذبات کو نہایت موثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ شاندار اور ثقیل الفاظ سے ان کا کلام پاک ہے۔ زبان بہت مرید اور روزمرہ کی ہے۔ شعر اگرچہ بلند ہوتے ہیں لیکن آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

تصانیف | پہلا دیوان زندگی میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ باقی کلام ان کے مرنے کے بعد میر دوست علی خلیل نے مطبوعہ دیوان کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔ سوائے غزل کے انہوں نے اور کچھ نہیں کہا۔

نقائص کلام | بعض لوگ کہتے ہیں کہ کم استعداد ہونے کی وجہ سے ان کا کلام پختہ اور بلند نہیں۔ نیز انہوں نے غلط العام الفاظ جوں کے توں باندھ دیئے ہیں۔ مثلاً المضاعف کو المضاف، حلوائے بیدود کو حلوۂ بیدود۔ لیکن ایک طرح سے انہوں نے یہ بہت ہی اچھا کیا۔ کیونکہ اسی لفظی چھان بین نے زبان شعر کو عربی فارسی وغیرہ کے ثقیل الفاظ سے کرخت اور بے لوچ بنا دیا تھا۔ اِن کے اس اجتہاد سے زبان میں لچک پیدا ہو گئی۔

مقابلہ آتش و ناسخ کا | دونوں حضرات کامل اُستاد اور صاحب طرز تھے۔ اپنے اپنے زمانہ میں دونوں کی بڑی قدر تھی۔ آجکل لوگ ناسخ کو پسند نہیں کرتے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے تذکرہ گلشن بیخار میں ناسخ کو آتش پر ترجیح دی ہے۔ غالب نے کسی خط میں لکھا ہے کہ "آتش کا کلام بہت موثر ہے۔" بندش کی چستی۔ الفاظ کی حلاوت۔ مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر فوقیت حاصل ہے۔ ناسخ کو ثقیل الفاظ اور مشکل تشبیہات کے استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔ جس سے شعر کا مزہ جاتا رہتا تھا۔ آتش کے اشعار نیچرل ہیں۔ اور ناسخ کی نسبت ان میں بے تکلفی اور تڑپ بہت زیادہ ہے۔ برخلاف ناسخ کے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں۔ اور ان میں تصوف بھی ہے۔ مختصر یہ کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر فوقیت حاصل ہے۔

شاگرد	رند۔صبا۔خلیل۔نسیم۔نواب مرزا شوق۔اور آغا حجو شرف ان کے مشہور شاگرد ہیں۔
نمونہ کلام	

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

کوچہ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں — در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

رند متوفی ۱۸۵۷ء	نواب سید محمد خاں نام تھا۔سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے تھے ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔عالی خاندان تھے۔اور بڑے ناز و نعمت سے

پرورش پائی تھی۔جب تک فیض آباد میں رہے وفا تخلص کرتے تھے اور اپنا کلام میر مستحسن خلیق کو دکھاتے تھے۔۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ گئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔وہاں آتش کے شاگرد ہوئے اور رند تخلص رکھا۔

تخلص کی مناسبت سے بڑے لطف کی رندانہ زندگی بسر کرتے تھے۔آتش کی وفات کے بعد شراب چھوڑ کر تائب ہو گئے تھے۔اسی عرصہ میں حج کو گئے۔مگر (غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے) بمبئی میں انتقال کیا۔

خصوصیات کلام	دو دیوان ہیں۔کلام نہایت صاف اور سادہ اور پُر اثر ہے۔محاورات برجستہ

استعمال کئے ہیں۔بلند خیالی اور مضمون آفرینی کم ہے۔اشعار مہذب ہیں۔اکثر جگہ تصوف اور روحانیت کی جھلک ہے۔آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بلند درجہ ہے۔

نمونہ کلام	

پھینک دینگے لے کے ہم چیر کے پہلو اپنا — تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

خلیل	میر دوست علی نام تھا۔اور سید جمال علی کے بیٹے تھے۔بڑولی کے رہنے والے تھے۔

آتش کے مشہور شاگرد ہیں۔نواب نادر مرزا کے ساتھ کلکتہ بھی گئے تھے۔

خصوصیات کلام	اکثر کلام ناہموار ہے۔بعض اشعار نہایت بلند اور عمدہ ہیں۔غیر مانوس الفاظ اور

رعایت لفظی کے شوقین تھے۔عام طور پر شعر عشق مجازی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔اور بعض میں

ابتذال بھی ہے ۔

نسیم متوفی ۱۲۶۰ھ	پنڈت دیا شنکر کول نسیم پنڈت گنگا پرشاد کول کے لڑکے تھے۔ ایک معزز کشمیری خاندان کے فرد تھے ۔ ۱۲۶۰ھ میں عین جوانی میں ۳۲ سال کی عمر میں فوت

ہوئے ۔ فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ۔ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر فائز تھے ۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا ۔ بیس سال کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے اور نسیم تخلص کیا ۔

مثنوی گلزار نسیم	انہوں نے مثنوی میر حسن کے جواب میں مثنوی گلزار نسیم جیسی زندہ جاوید مثنوی لکھی تھی ۔

مشہور ہے کہ یہ بہت ضخیم تھی ۔ اُستاد کے کہنے سے مختصر کر دی ۔ ان کے کلام کی برجستگی محاورات اور نادر استعارے اور تشبیہات قابل تعریف ہیں ۔ اس میں تصنع بہت ہے اور دلاویزی اور تاثیر کم ۔ یہ مثنوی میر حسن سے علیحدہ طرز پر لکھی گئی ہے ۔ اس لئے دونوں کا مقابلہ فضول ہے ۔

صبا متوفی ۱۲۷۱ھ	میر وزیر علی نام تھا میر بندہ علی کے بیٹے تھے ۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی ۔ ان کے چچا نے ان کو بیٹا بنا کر بقدر ضرورت عربی فارسی کی تعلیم

دی تھی ۔ شاعری میں آتش کے مشہور شاگرد تھے ۔

صبا بہت ملنسار خلیق اور یار باش آدمی تھے ۔ دو سو روپیہ ماہوار واجد علی شاہ اور تیس روپے نواب محسن الدولہ دیتے تھے ۔ وہ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر راہی ملک عدم ہوئے ۔

خصوصیات کلام	ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہے ۔ ان کے کلام میں تصنع اور غیر مانوس الفاظ

بکثرت ہیں ۔ کہیں کہیں کوئی کوئی شعر اپنے اُستاد کے رنگ میں بھی ملتا ہے ۔ جو دل پر اثر کرتا ہے ۔

آغا حجو شرف	میر سادات حسین نام اور آغا حجو عرف تھا ۔ واجد علی شاہ بادشاہ کے سمدھی کے

خسر تھے ۔ غدر کے بعد والئے اودھ کے ساتھ کلکتہ گئے ۔ ولی عہد کے ساتھ رہتے تھے ۔ جن کے انتقال سے ان کو سخت صدمہ ہوا ۔

خصوصیات کلام | ان کے اشعار کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔ بندشیں اور ترکیبیں دلکش ہیں۔ مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔

نمونہ کلام | پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا — قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا
شاخِ گُل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی — پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

اس دور کے تغیرات زبان | (۱) غیر مانوس اور ثقیل فارسی عربی الفاظ اور ترکیبوں کی کمی (۲) متروکِ شُدہ ہندی الفاظ کا پھر رائج ہونا (۳) صرف برمحل اور حسن شعر کو بڑھانے والے محاورات کا استعمال (۴) معشوق کے خط و خال گُل و بُلبل۔ دُور از کار تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کی کمی۔

باب ۹

دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا

واجد علی شاہ اختر کا عہد

شاہان اودھ | دہلی کے زوال کے بعد اُردو شاعری کا مرکز لکھنؤ بن گیا۔ کیونکہ دہلی کے نامور شعرا مثلاً آرزو۔ میر۔ سودا اور سوز دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا رہے تھے۔ دہلی کی پریشانیاں اور شاہان اودھ کی قدردانیاں شعرا کے دلوں کو اس طرف کھینچتی تھیں۔

نواب آصف الدولہ متوفی ۱۷۹۷ء | نواب آصف الدولہ آصف تخلّص کرتے تھے۔ نواب یحیٰی خاں نام اور مرزا امانی عرف تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے فرزند اور جانشین تھے۔ شعر و سخن اور علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے۔ وہ ۱۷۷۵ء میں ۲۷ سال کی عُمر میں تخت نشین ہوئے۔ جب لکھنؤ دارالسلطنت ہُوا تو انہوں نے بڑے شوق سے وہاں بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرائیں ان کے عہد میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بہت بڑھا۔ ان کے دربار میں ہندو بڑے بڑے

عہدوں پر سرفراز تھے۔ سودا۔ میر۔ اور سوز انہی کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے۔ انہوں نے ۱۷۹۷ء میں انتقال کیا۔

آصف الدولہ اپنا کلام میر سوز کو دکھاتے تھے۔ ان کے اشعار اپنے اُستاد کے کلام کی طرح صاف اور سادہ ہیں اور تصنع اور تکلف سے پاک ہیں۔ ایک دیوان یادگار ہے:-

نمونہ کلام

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں — وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں — خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
گذرتے ہیں سو سو خیال اپنے و لمیں — کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف — تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

نواب وزیر علی خاں معزول ۱۷۹۸ء

آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں ان کے بیٹے وزیر علی خاں مسند وزارت پر بیٹھے۔ مگر چار ہی مہینے بعد انگریزوں نے یہ کہہ کر ان کو معزول کر دیا۔ کہ تم آصف الدولہ کی اولاد نہیں ہو۔ شاید اس لئے کہ وہ خود سر تھے۔ معزول کر کے ان کو بنارس بھیجا گیا۔ جہاں غصہ میں انہوں نے رزیڈنٹ کو مار ڈالا۔ اور بغاوت کر دی۔ پھر جے پور میں پناہ لی۔ وہاں سے گرفتار کر کے ان کو فورٹ ولیم بھیجا گیا۔

وہ وزیر تخلص کرتے تھے۔ ذیل کے اشعار انہوں نے مصیبت کی حالت میں لکھے تھے ؎

ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں — بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے — نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندان مصیبت میں بھلا کس کو ملا چین — ہنستے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم

نواب سعادت علی خاں

اب نواب آصف الدولہ کے سنجھلے بھائی نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے۔ ان کے عہد میں انگریزوں سے ایک عہد نامہ کیا گیا۔ جس سے انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اور دو تہائی ملک انگریزوں کے پاس چلا گیا۔ اس عہد میں ملک میں امن و سکون تھا اور نواب ہر وقت عیش و عشرت میں مشغول تھے۔ وہ علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے

اگرچہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن ان کا کلام نہیں ملتا۔

مصحفی اور انشا کے معرکے انہی کے عہد میں ہوئے تھے۔ سید انشا ان کے دربار کے خاص شاعر تھے۔

نواب غازی الدین حیدر نواب سعادت علی خان کے بعد ان کے بیٹے ۱۸۱۴ء میں مسند وزارت پر بیٹھے۔ پانچ برس بعد گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کے زمانہ سے یہ لوگ وزیر سے بادشاہ کہلانے لگے۔ ان کی تخت نشینی بڑی شان و شوکت سے ہوئی۔ غازی الدین اردو میں نعت و مرثیہ کہتے تھے۔ لیکن ان کا کلام بہت بے مزہ اور روکھا پھیکا ہے۔

نصیر الدین حیدر شاہ غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک حکومت کی۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح ائمہ کی شان میں شعر کہا کرتے تھے۔ اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔

نمونہ کلام

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے   کہ ساقی لئے ساغر مشکبو ہے

چلو قبر فرہاد پر فاتحہ کو   مگر آب شیریں سے لازم وضو ہے

شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر   یہ کس کشتۂ بے گناہ کا لہو ہے

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا   نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر

خداوند عالم نگہبان تو ہے

محمد علی شاہ امجد علی شاہ نصیر الدین کے بعد ان کے حقیقی چچا محمد علی شاہ ۱۸۳۷ء سے لے کر ۱۸۴۲ء تک حکمران رہے۔ پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ نے ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک حکومت کی۔ یہ دونوں بھی علوم و فنون کے قدردان تھے۔ اور شعرا کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔

واجد علی شاہ امجد علی شاہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے واجد علی شاہ ۲۵ سال کی عمر میں ۱۸۴۷ء

میں تخت پر بیٹھے۔ اِن کو فنِ تعمیر کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے ۲ دو کروڑ روپیہ صرف کر کے لکھنؤ میں قیصر باغ بنوایا۔ وہ نالائق اور بدخواہ ہم نشینوں کی صحبت کے اثر سے عیش و عشرت میں پھنس گئے تھے۔ صدہا ارباب نشاط ملازم تھیں۔ اس عیش کوشی پر انگریزوں نے بار بار فہمائش کی۔ آخر ۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو معزول کر کے فورٹ ولیم بھیجدیا۔ اور ۲ دو کروڑ سالانہ کی سلطنت انگریزوں کے قبضے میں چلی گئی۔

واجد علی شاہ تقریباً ۲ دو سال فورٹ ولیم میں رہے۔ وہاں سے مٹیا بُرج میں منتقل کر دیئے گئے۔ مٹیا بُرج کو انہوں نے لکھنؤ کا نمونہ بنادیا تھا۔ ہر بات میں ندرت اور نفاست پسند تھی۔ ان کا کلکتہ کا چڑیا خانہ دُور دُور سے لوگ دیکھنے آتے تھے۔ فنِ موسیقی کو بدرجہ اتم جانتے تھے۔ اُردو شاعری میں اختر تخلّص کرتے تھے۔ معزولی کے بعد لکھنؤ سے کلکتہ کا سفر ایک مثنوی میں نہایت دردناک پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ ہندی میں "جان عالم پیا" تخلّص کرتے تھے۔ ان کی ٹھمریاں اب تک زبان زدِ عوام ہیں۔

تصانیف ۔ ان کی تقریباً چالیس تصانیف ہیں (۱) چھ دیوان (۲) سات مثنویاں (۳) تین جلدیں مراثی اور مختلف کتابیں ہیں۔ ایک خطوط کا مجموعہ بھی چھپا ہے جو لکھنؤ کی یاد میں انہوں نے اپنی محبوب بیوی کو لکھے تھے۔ اختر۔ میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے اصلاح لیتے تھے برق کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ معزولی کے بعد اِن کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں جان دی۔

خصوصیات کلام ۔ اس زمانہ کے عام رنگ کے مطابق شعر کہتے تھے۔ رعایت لفظی کا خیال رکھتے تھے۔ سوز و گداز ان کے اشعار میں نہیں۔ ہاں لکھنؤ سے کلکتہ کے سفر کے حالات جو مثنوی "حزنِ اختر" میں بیان کیئے ہیں ضرور پُر درد ہیں۔

نمونہ کلام ۔ کمر۔ دھوکا۔ دہن عقدہ۔ غزال آنکھیں۔ پری چہرہ

شکم ہیرا۔ بدن خوشبو۔ جبیں دریا۔ زبان عیسیٰ

برائے سیر مجھ سا رندمے خانے میں گر آئے

گرے ساغر۔ لنڈھے شیشا ہنسے ساقی۔ بہے دریا

۵ یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائیگا مقدر میرا

شعرائے اختری | اسیر۔ برق۔ امانت۔ قلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول۔ شفق۔ بیخود۔ ہنر۔ عطارد۔ ہلال اور سرور وغیرہ ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

اسیر | سید مظفر علی خان نام تھا۔ اسیر تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد سید مداد علی امیٹھی کے رہنے والے تھے۔ کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ شاعری میں مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ملازم ہوئے۔ اور امجد علی شاہ کے عہد میں برسر اقتدار آئے۔ واجد علی شاہ کے آٹھ نو سال مصاحب رہے۔ اور تدبیر الدولہ اور مدبر الملک کے خطابات پائے۔ جب واجد علی شاہ لکھنؤ گئے تو انہوں نے ساتھ جانا منظور نہ کیا۔ لیکن برق چلے گئے۔ اس پر بادشاہ ان سے ناراض ہو گئے۔

غدر کے بعد نواب کلب علی خان اور پھر ان کے صاحبزادے نواب یوسف علی خان ان کے قدردان ہو گئے تھے۔ وہ چھ مہینے رامپور اور چھ مہینے لکھنؤ رہا کرتے تھے آخر ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ میں ۸۱ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

خصوصیات کلام | چھ دیوان ان کی تصنیف ہیں۔ ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ مرثیہ اور قصیدہ بھی کہتے تھے۔ فن عروض کے استاد کامل تھے زبان پر ان کو بہت قدرت تھی۔ نظم کا رنگ اہل لکھنؤ کا سا ہے۔ کہیں کہیں اچھے اشعار بھی ملتے ہیں۔ امیر مینائی انہی کے شاگرد تھے۔ ان کے دو نو بیٹے حکیم اور افضل بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔

نمونہ کلام | کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے
روشن اسی کا نام رہے جو جلائے دل

امانت | سید آغا حسین امانت میر آغا رضوی لکھنوی کے بیٹے تھے۔ ان کا رشتہ سید علی رضوی سے ملتا ہے جو مشہد مقدس کے کلید بردار تھے۔ امانت کو شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا اور دلگیر سے اصلاح لینے لگے۔ کچھ مدت بعد غزلیں کہنی شروع کیں۔ لیکن اُستاد نے ان کو درست کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۲۵۱ھ میں بیس برس کے تھے۔ کہ کسی عارضے سے قوت گویائی جاتی رہی۔ اور تحریر کے ذریعے باتیں کرنے لگے۔ دس سال بعد یہ مرض آپ ہی آپ جاتا رہا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کربلا جا کر خود بخود زبان کھل گئی تھی۔ انہوں نے لطافت اور فصاحت اپنے دو لڑکے جانشین چھوڑے۔ یہ دونو شعرائے لکھنؤ میں بہت مشہور ہیں ؛

تصانیف | امانت کی شہرت واسوخت اور اندر سبھا پر مبنی ہے۔ اندر سبھا اُردو ڈرامہ کی سب سے پہلی تصنیف ہے ؛

خصوصیات کلام | امانت کو رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اس قدر شوق تھا۔ کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا ہیں۔ لکھنؤ کا رنگ ان کے ہر شعر سے ظاہر ہے۔ لیکن کہیں کہیں صاف اور سادہ اشعار بھی ملتے ہیں ؛

نمونہ کلام |

بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دُعا — شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو

فی سبیل اللہ پانی ان کو دو اے آبلو — کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبان خار کے

فصل گُل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو — ساقی مہوش ہو مے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو

کوچہ قاتل تلک اے دل رسائی کیجئے — کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے

آفتاب الدولہ قلق | خواجہ ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ۔ قلق تخلص کرتے تھے۔ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا شاگرد بھی کہتے تھے ؛

خصوصیات کلام | انکے کلام میں لفظی تصنعات ہیں۔ اور مثنوی میں رکاکت اور ابتذال بھی ہے

بلحاظ زبان اِن کا کلام مستند ہے۔ مگر شعری خوبیوں سے معرّا ہے۔ مثنوی طلسم اُلفت نہایت دلچسپ اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ اور ایک دیوان بھی یادگار ہے۔ جس میں بادشاہ کی نظربندی کا دردناک حال ہے ؛

ذکی | مہدی علی خاں نام تھا۔ ذکی تخلّص کرتے تھے۔ شیخ کرامت علی انکے والد تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ مگر آخر عمر میں مرادآباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ بادشاہ کی شان میں قصیدہ لکھ کر انعام بھی پایا۔ لکھنؤ سے دہلی اور دکن گئے۔ جہاں اِن کی خوب قدر ہوئی۔ واجد علی شاہ کے عہد میں آ کر انہوں نے ملک الشعرائی کا خطاب پایا۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد مرادآباد چلے گئے۔ کچھ دنوں نواب یوسف علی خاں والئے رام پور کی سرکار سے وابستہ رہے۔ اِن کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا ؛

بہت خوش گو شاعر تھے۔ اور لکھنؤ کے دوسرے درجے کے شعرا میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ علم عروض سے خوب واقف تھے۔ اس فن پر ایک رسالہ ان کی یادگار ہے ؛

درخشاں | سید علی خاں نام تھا۔ اور مہتاب الدولہ کوکب الملک۔ ستارۂ جنگ خطابات تھے تخلّص درخشاں کرتے تھے۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ انہی کی کوشش سے دربار میں پہنچے فنِ نجوم سے بھی واقف تھے۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔ معزولی کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے تھے آخر وہیں انتقال کیا ؛

اختر | قاضی محمد صادق خاں نام تھا۔ قاضی محمد لعل کے صاحبزادے تھے۔ ہگلی کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں لکھنؤ آئے۔ اور ملک الشعرا کا خطاب پایا۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اور مصحفی۔ انشا۔ جرأت کے مشاعروں میں شریک ہوئے تھے۔ مشہور ہے۔ واجد علی شاہ نے بہت سا انعام دے کر ان سے تخلّص خرید لیا تھا۔ واجد علیشاہ کی ناراضگی کی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ پھر اٹاوہ میں تحصیلدار ہو گئے تھے آخر وہیں

۱۸۵۵ء میں انتقال کیا۔

اختر بڑے جامع کمالات شخص تھے۔ فارسی میں بہت کہتے تھے۔ ان کی بہت سی فارسی تصنیفات موجود ہیں۔ انہوں نے فارسی شعرا کا تذکرہ بھی لکھا ہے۔ جس میں پانچہزار شعرا کا حال درج ہے۔ ان کے چند ایک دیوان بھی ہیں ؎

نمونہ کلام

جب وہ رُخ سے دُور کرے رُوہ نقاب کا — جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا
کل بن کے شیخ مجتہد عصر سا قیا — دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا زراہِ تبختر مجھے بطنز — معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے — پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

باب ۱۰

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف مرثیہ قصیدہ کے برعکس ہے۔ قصیدہ میں کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے۔ اور مرثیہ میں مُردہ اشخاص کی۔ عام طور پر مرثیہ انہی نظموں کو کہتے ہیں۔ جن میں شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بالعموم مرثیے بہت سوز و گداز اور خوش الحانی سے ان مجالس اور جلوسوں میں پڑھے جاتے ہیں جو شہدائے کربلا کی یاد میں ترتیب دیئے جاتے ہیں۔

ابتداء میں مراثی میں صرف بین کے اشعار ہوتے تھے۔ جن کا مطلب رونا رُلانا اور داخل حسنات ہونا ہوتا تھا۔ لیکن اُنیسویں صدی میں مرثیہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ اور اس میں نئے نئے مضامین اور اسلوب بیان داخل ہو گئے۔ مثلاً چہرہ۔ مناقب ممدوح مصائب و ثمن۔ مناظر جنگ۔ مناظر قدرت۔ رجز خوانی۔ گھوڑے اور تلوار کی تعریفیں وغیرہ وغیرہ

گویا مرثیہ اُردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت شروع سے اہل اسلام مرثیہ کے بہت شائق ہیں۔ عرب شاعری کی ابتدا مرثیہ ہی سے ہوئی ہے چونکہ مرنے والا مرثیہ گو کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس لئے شعرا نے قصیدے لکھ کر امیروں سے انعام لینے شروع کئے۔ اس طرح مرثیہ گوئی کو زوال ہونا شروع ہوا۔

فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ تکلف اور آورد پر قائم تھی۔ اس لئے وہاں ابتدا قصیدہ سے ہوئی۔ پھر بھی شاہنامہ میں کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے مثلاً مادر سہراب نے اپنے بیٹے کی موت پر نہایت دردانگیز بین کئے ہیں نیز محمود غزنوی کی وفات پر فرخی نے دس بارہ اشعار دردناک پیرائے میں لکھے ہیں۔ لیکن آجکل کے خیال کے مطابق انکو مرثیہ نہیں کہہ سکتے۔

سعدی اور خسرو نے بھی مرثیہ لکھے لیکن نہ وہ مقبول ہوئے اور نہ لوگوں نے ان کا اتباع کیا۔ مُلا محتشم کاشی اگرچہ بے مثل مرثیہ گو تھے۔ لیکن انہوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اسی طرح طالب آملی۔ غزالی۔ میلی۔ کلیم اور ظہوری وغیرہ نے بھی مرثیہ لکھے۔ لیکن ان میں سوائے تعریفوں اور اظہار تاسف کے کچھ نہیں تھا۔ آخر مُلا مقبل نے اس صنف میں ایک قسم کا تغیر پیدا کیا۔ جس کو ایرانیوں نے بہت پسند کیا۔

اُردو مرثیہ اُردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی تھی۔ اور مرثیہ بھی سب سے پہلے وہیں لکھا گیا تھا مصنف گل رعنا لکھتے ہیں۔ کہ ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ شاہان گول کنڈہ اور بیجا پور خود مرثیہ کہتے تھے۔ اور شاعروں کی قدردانی کرتے تھے۔ شعرائے دہلی مرثیہ گوئی مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ اسی لئے مرثیے میں عیوب شاعری پر نظر نہیں کرتے تھے۔ میر و سودا بھی مرثیے لکھتے تھے۔ ان میں بھی حقیقی جذبات کی کمی ہے۔ میر انیس کے بزرگ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے بھی کوئی خصوصیت نہیں رکھتے۔

سودا کے وقت تک سالم مرثیے چومصرعے ہوتے تھے۔ غالباً[۱] سودا نے سب سے پہلے

۱؎ سکسینا صاحب کا یہ خیال غلط ہے۔ انیس کے بزرگوں نے مرثیہ کو سب سے پہلے عروج پر پہنچایا تھا ۱۲

ان کو مسدس میں کیا۔ ضمیر نے مرثیہ میں جدید تشبیہات استعارات۔ معرکۂ کارزار کے مفصل حالات شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کئے۔ زور بندش میں چُستی اور صفائی پیدا کر کے سوز سے پڑھنے کی بجائے تحت اللفظ خوانی کی طرح ڈالی۔ آخر یہی طرز انیس اور دبیر کے زمانہ میں معراج کمال کو پُہنچی ؛

بزرگان انیس کی خدمات | میر امانی۔ میر ضاحک اور میر حسن نے بھی مرثیے کہے تھے۔ لیکن وہ اب نہیں ملتے میر حسن کے چار بیٹے تھے۔ جن میں خلیق۔ خلق۔ محسن شاعر تھے خلق صاحب دیوان تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے۔ انہوں نے نَنّو برس کی عُمر میں انتقال کیا ؛

میر خلیق | میر مستحسن نام تھا خلیق تخلص کرتے تھے۔ خلق سے چھوٹے تھے۔ تعلیم و تربیت فیض آباد اور لکھنؤ میں پائی تھی۔ سولہ برس کی عُمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ ان کے والد میر حسن مثنوی سحرالبیان کی تصنیف میں مشغول تھے۔ اس لئے ان کو مصحفی کا شاگرد کرا دیا تھا۔ تھوڑی مُدت میں وہ بہت ترقی کر گئے۔ چنانچہ ایک مشاعرے میں آتش بھی موجود تھے۔ جب خلیق نے اپنا یہ مطلع پڑھا ؎

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو　　　صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو آتش نے یہ کہہ کر اپنی غزل پھاڑ دی۔ کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔

میر حسن کے انتقال نے سارے گھر کا بوجھ خلیق پر ڈال دیا۔ لہذا گذرا وقات کے لئے خلیق اپنی غزلیں بیچنے لگے۔ وہ آخر عمر میں محض مرثیہ کہتے تھے۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ ضمیر فصیح اور دلگیر ان کے معاصر تھے۔ دلگیر ناسخ کے شاگرد تھے۔ زبان میں لکنت ہونے کی وجہ سے مرثیہ خود نہیں پڑھتے تھے۔ انہوں نے مرثیہ میں جدتیں نکالی تھیں۔ مرزا فصیح جب حج کو چلے گئے۔ تو ضمیر اور خلیق کے لئے میدان خالی رہگیا۔ یہ دونو ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوششیں کرتے تھے۔ اس جد و جہد کا نتیجہ مرثیے کی ترقی کا باعث ہُوا۔ اب مرثیہ چو مصرعے سے مسدس ہو گیا۔ سلام غزل کی طرز میں لکھے جانے لگے۔ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ سوز سے تحت اللفظ ہُوا۔ متزاد کی صورت

میں نوحے کہے جانے لگے۔ پہلے مرثیہ چالیس بند کا ہوتا تھا۔ میر ضمیر نے اس طرز میں تبدیلی کرکے پہلے سراپا اور پھر میدان جنگ کا نقشہ کھینچ کر شہادت امام کو بیان کیا۔ اس طرز نے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اب سے پہلے مرثیے حصول ثواب کے لئے لکھے جاتے تھے۔ لیکن جدید مطالب نے ان کو شاعری کے دامن میں لے لیا۔ اور اس پر سخن اور باریک بینی سے تنقیدیں ہونے لگیں۔ گویا مرثیہ شاعری کی ایک الگ صنف مقرر ہوگئی۔

خصوصیات کلام میر خلیق نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی۔ انہوں نے خالی تشبیہو کو چھوڑ کر درد و اثر کو اختیار کیا۔ میر ضمیر اور ان کے کلام میں یہی فرق ہے۔ انیس بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلے۔ چنانچہ ناسخ کہا کرتے تھے۔ کہ اگر زبان سیکھنی ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

میر انیس میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انکے والد نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ جب ان کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا ہوئے تو لکھنؤ آئے۔ چھوٹے بھائی انس ہمراہ تھے۔ چونکہ باپ اور بھائی فیض آباد میں رہتے تھے۔ اس لئے فیض آباد میں آنا جانا رہا۔ آخر پورا خاندان لکھنؤ آ گیا۔

ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی اور مفتی میر عباس سے حاصل کی تھی۔ ورزش کے بہت شائق تھے۔ فنون سپہ گری میر کاظم علی اور ان کے بیٹے سے سیکھے تھے۔ فن سپہ گری اور شہسواری مناظر جنگ دکھانے میں ان کے بہت کام آئے۔

میر انیس وضعدار اور خوددار شخص تھے۔ اور اپنی فضیلت خاندانی پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ گھر والوں سے بھی اوقات مقررہ پر ملتے تھے۔ بادشاہ وقت کے ہاں بھی اسوقت تک نہیں جاتے تھے۔ جب تک ایک معتمد شاہی ان کو لینے نہیں آتا تھا۔ استغنا۔ خودداری اور قناعت اس قدر تھی۔ کہ کبھی کسی کی مدح نہیں کی اور نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ ہاں امرا کے تحائف قبول کر لیتے تھے۔ اور وہ لوگ بھی آل رسول سمجھ کر ان کی خدمت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ ایکدفعہ نواب تہور جنگ رئیس حیدرآباد نے میر صاحب کی جوتیاں اٹھا کر پالکی میں رکھی تھیں۔ اور

میر صاحب اس بات پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ اور لباس بھی ان کا خاص تھا۔ جس کو انہوں نے عُمر بھر نبھایا۔

میر انیس سلطنت لکھنؤ کی تباہی سے پہلے لکھنؤ سے باہر نہیں نکلے۔ کہتے تھے۔ اور جگہ کے لوگ ہماری زبان کا کیا لطف اُٹھائیں گے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب پر پٹنہ عظیم آباد گئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ کے اصرار پر حیدر آباد گئے اِن مقامات سے لَوٹتے ہوئے بنارس اور الہ آباد میں بھی معرکۃ آرا مجالس پڑھیں۔ وہ ۱۸۷۴ء میں بعارضۂ بخار لکھنؤ میں فوت ہوئے ٭

انیس کی شاعری میر صاحب طبعی شاعر تھے۔ اور ملکہ شاعری ورثہ میں بھی پایا تھا۔ انکے خاندان جتنے مشہور اور قابل شعرا کسی اور خاندان میں نہیں ہوئے۔ میر صاحب بچپن ہی سے شعر کہتے تھے پہلے حزیں تخلّص کرتے تھے۔ جب لکھنؤ آئے تو ان کے والد ناسخ کے پاس لے گئے۔ ناسخ کے کہنے سے تخلّص بدل دیا۔ اور انیس اختیار کیا۔ شروع سے مرثیہ کہتے کہتے اِس میں کافی مہارت پیدا کرلی تھی۔ اپنے والد کے زمانہ میں وہ کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ جب خلیق اور ضمیر نے میدان خالی کیا۔ تو میر انیس اور مرزا دبیر کا مقابلہ شروع ہوگیا ٭

تصانیف میر صاحب کا کلام اب تک پُورا شائع نہیں ہُوا۔ انہوں نے ہزارہا مرثیے رُباعیاں اور سلام وغیرہ لکھے ہیں۔ مشہور ہے انہوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے تھے۔ جن میں غزلیں بھی تھیں۔ ان کا کلام ہموار ہے۔ اور رطب و یابس سے پاک ہے۔ بحیثیت شاعر کے ان کی جگہ صف اوّلین میں ہے۔ اور وہ اُردو کے تمام شعرا سے بہترین اور کامل ترین سمجھے جاتے ہیں ٭

انیس کی مرثیہ خوانی جس طرح انیس کا کلام لاجواب ہے۔ اسی طرح ان کا پڑھنے کا طریقہ بھی بے مثال تھا ان کی آواز۔ قد و قامت۔ صُورت غرض ہر چیز نہایت موزوں واقع ہوئی تھی۔ وہ تنہائی میں آئینہ سامنے رکھ کر پڑھنے کی مشق کیا کرتے تھے۔ آنکھ کی گردش۔ ہلکی سی اعضا کی جنبش سے اپنے کلام میں زندگی پیدا کر دیتے تھے۔ جس سے سُننے والے سر دُھنتے رہ جاتے تھے ٭

خدمات انیس میر انیس نے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ حقیقت میں انہوں نے زبان کو مانجھ ڈالا ہے۔ وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی لغات کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے سجاتے تھے۔ انہوں نے نئے نئے محاورات زبان میں داخل کئے۔ اور پرانے محاورات کا صحیح استعمال بتایا۔ میر صاحب کی زبان لکھنؤ اور دہلی میں مستند مانی جاتی ہے پہلے اُردو زبان رزمیہ نظم سے بالکل تہیدست تھی۔ میر صاحب نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ کسی کے لئے گنجائش باقی نہیں رکھی۔ اسی طرح مناظر قدرت اور انسانی جذبات جس صحت اور عمدگی کے ساتھ انہوں نے لکھے ہیں۔ اس کا بھی زبان اُردو میں جواب نہیں ملتا ؏

مرقّع نگاری انیس مناظر قدرت کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے۔ اس قسم کے مناظر کو مراثی میں انہوں نے اس طرح قلمبند کیا ہے کہ وہ اصل مضمون کے تحت میں بھی ہیں۔ اور بالذات ایک مکمّل چیز ہیں ؏

اظہار جذبات میر صاحب انسانی جذبات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دل وجد کرنے لگتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ جزئیات تک کو بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے جنگوں کے مناظر ہزاروں جگہ بیان کئے ہیں۔ مگر ہر جگہ نئے انداز اور نئی تشبیہات کے ساتھ۔ افسوس ہے کہ بعض واقعات کربلا انہوں نے ایسے بیان کئے ہیں جو حقیقت میں ظہور پذیر نہیں ہوئے ؏

مولوی عبد الغفور نساخ نے ایک رسالہ میں انیس اور دبیر کی غلطیاں جمع کی ہیں۔ انیس اور دبیر کے طرفداروں نے اس کے جواب بھی دیئے ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے لاکھوں شعر کہے اگر کہیں کہیں غلطیاں ہوگئیں۔ تو اس سے ان کی اُستادی میں کوئی فرق نہیں آسکتا ؏

طرز انیس میر انیس تمثیلوں۔ استعاروں اور صنائع بدائع کے استعمال میں کمال رکھتے تھے۔ وہ اپنے زمانہ کی روش کے خلاف فضول مبالغوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ صنائع بدائع کو اس طرح استعمال کرتے تھے۔ کہ اس سے شعر کی حسن وخوبی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ان کے استعارے

اور تشبیہیں بھی نہایت خوبصورت ہیں۔ اور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ انکے کلام کی فصاحت اور زور کہیں کم نہیں ہوتا۔ بیان میں روانی غضب کی پائی جاتی ہے ایک بات کو ہزار مرتبہ کہتے ہیں لیکن ایسے نئے انداز سے کہ اس کی دلاویزی کم نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی۔ کہ اس زمانہ میں تصنع تکلف۔ اور مبالغہ کا عام رواج تھا لیکن انکی شاعری حقیقت کا آئینہ تھی حقیقت میں جس نیچرل شاعری کی بنیاد آزاد اور حالی نے ڈالی تھی۔ اس کا آغاز میر انیس نے کیا تھا۔ نیچرل شاعر ہونے کی وجہ سے آجکل انیس انگریزی دان طبقے میں زیادہ مقبول ہو رہے ہیں ؎

مرزا دبیر | مرزا سلامت علی دبیر ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا دبیر کے والد دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ گئے اور وہیں شادی کر کے وہیں رہنے لگے۔ جب دہلی میں امن ہوا تو مرزا غلام حسین پھر دہلی میں آگئے۔ مرزا کی عمر سات سال کی تھی۔ کہ پھر لکھنؤ چلے گئے ؎

مرزا دبیر کی استعداد علمی معقول تھی۔ بچپن ہی سے مرثیہ گوئی کے شوقین تھے۔ وہ میر ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ آخر بادشاہ نے بھی ان کو سنا۔ محلات شاہی اور رؤسائے لکھنؤ ان کے شاگرد ہوئے۔ اس شہرت اور عزت اور استاد کی محبت سے دشمنوں میں آتش حسد بھڑک اٹھی۔ ایک مجلس میں لوگوں نے استاد کے دل میں رنجش پیدا کر دی۔ لیکن یہ رنجش بہت جلد دور ہو گئی۔ دبیر اپنے استاد کا بہت احترام کرتے تھے۔

دبیر کی شہرت بہت کافی ہو چکی تھی۔ جو انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ انیس و دبیر ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔ اور نہایت لطیف انداز سے نوک جھوک کرتے تھے۔

۱۲۹۱ھ میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہو گئی۔ واجد علی شاہ نے مٹیا برج بلایا۔ کلکتہ میں ایک ماہر ڈاکٹر کے علاج سے یہ شکایت جاتی رہی۔

مرزا صاحب بھی میر انیس کی طرح گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ غدر کے بعد وہ بھی مرشد آباد اور

پٹنہ عظیم آباد گئے۔

۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں انہوں نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

| مرثیہ گوئی | مرزا دبیر نے انیسؔ کی طرح پوری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور اپنے فن کے اُستاد کامل

کہلائے۔ ان میں میر صاحب کی اکثر خصوصیات ہیں۔ اور شوکت الفاظ اس پر طرّہ ہے۔ مرزا صاحب کے الفاظ زوردار، تخیئل بلند، تشبیہات نئی اور مضامین تازہ ہوتے ہیں۔ آیات قرآنی کو خوب کمال سے نظم کرتے ہیں۔ وہ نہایت پُرگو اور زودگو شاعر ہیں۔ اور ہر حیثیت سے انیسؔ کے برابر کے ہیں۔

| انیسؔ و دبیر | انیس اور دبیر کی طرفداری میں اہل لکھنؤ انیسیئوں اور دبیریوں میں منقسم ہو گئے تھے

ان دونوں گروہوں کا بڑے زور کا مقابلہ رہتا تھا۔ لیکن انیس و دبیر آپس میں نہایت احترام سے ملتے تھے۔ یہ دونو بزرگ ایک سال کی کمی بیشی سے پیدا ہوئے اور ایک سال کی کمی بیشی سے فوت ہوئے۔ دونو کی ایک سوسائٹی تھی اور ایک ہی صنف شاعری اور دونو مسلم الثبوت اُستاد تھے۔

| طرز دبیر و انیس | انیس کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ لیکن دبیر نے اس کمال کو خود پیدا کیا تھا دونو

صاحبوں کی طرز جدا جُدا ہے۔ انیس زبان کی صفائی اور حلاوت۔ بندش کی چستی اور محاورے کی دُرستی کا خیال رکھتے تھے۔ اور مرزا دبیر جدّت خیال بلند تخیئل شوکت الفاظ نادر استعارات اور نئی نئی تمثیلوں کو پسند کرتے تھے۔

بعض لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ میر صاحب کو عربی درسیات پر عبور نہیں تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی کتابی علمیّت کی کمی میر صاحب کی شگفتگی کلام کا باعث ہے۔

حق یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے پر ترجیح دینا سخت ظلم ہے۔ وہ دونو مسلم الثبوت اُستاد تھے۔

| مرثیہ کے اسباب مقبولیت | چونکہ لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے۔ اس لئے وہاں عشرۂ محرّم

بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اظہار غم کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔

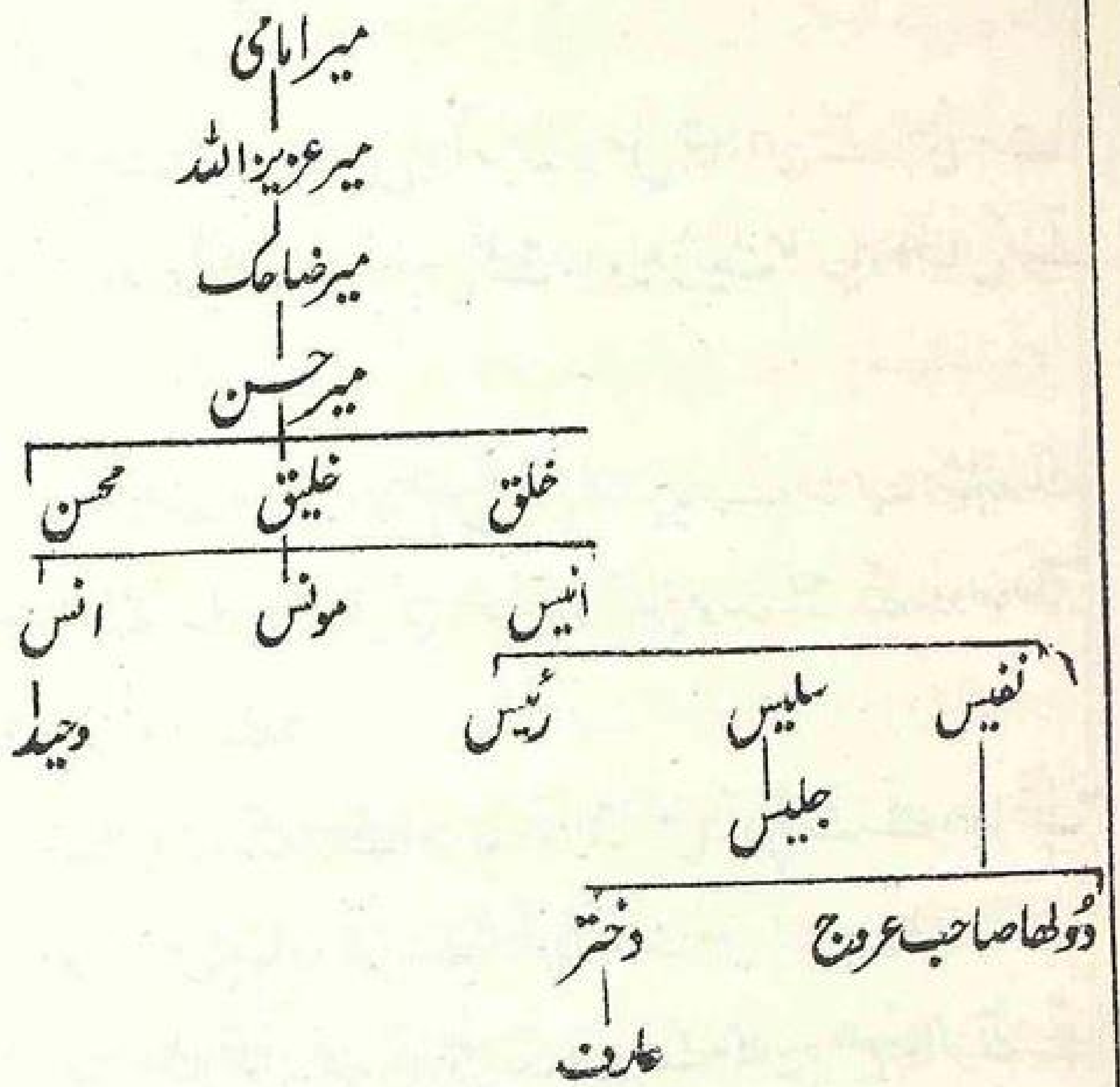
شعرا مرثیہ گوئی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور وہاں کے بادشاہ خود مرثیے کہتے تھے۔ اور مرثیے کہنے والوں کو بڑے بڑے صلے دے کر ہمّت افزائی کرتے تھے۔ اس لئے اس زمانہ میں مرثیہ گوئی کو کمال عروج حاصل ہوا ؎

مرثیہ کے ادبی فوائد میر ضمیر پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ اور میر انیس اور دبیر نے ان کو معراج ترقی تک پہنچایا۔ اس زمانہ سے پہلے مرثیہ چو مصرعہ ہوتا تھا۔ اب مسدّس ہوگیا۔ چنانچہ حالیؔ نے اسلام کا مرثیہ مسدّس حالی کے نام سے لکھا ہے۔ سرور جہان آبادی نے اپنی قومی اور نیچرل نظمیں اسی طرز میں لکھیں۔ سکینیا بابو کے نزدیک آزاد۔ حالیؔ اور سرور کی قومی اور نیچرل نظمیں سب مرثیہ ہی کی رہین ہیں۔ کیونکہ وہ تمام صفات ان میں موجود ہیں۔ جو مرثیہ میں پائی جاتی ہیں۔

انیسؔ اور دبیرؔ کی مرثیہ گوئی نے لکھنؤ کی قدیم مصنوعی اور مخرب الاخلاق طرزِ شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ کیونکہ مرثیہ کا مضمون ہمیشہ بلند اور مقدّس ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انیس اور دبیر کے چار پانچ لاکھ شعروں نے اُردو کو صاف اور پاکیزہ الفاظ محاورات اور ترکیبوں سے مالامال کر دیا۔ اس سے پہلے اُردو میں رزمیہ نظمیں نہیں ہوتی تھیں۔ ان حضرات کی مرثیہ گوئی نے اس کمی کو بدرجہ اتم پُورا کر دیا ؎

دیگر مرثیہ نویس اس زمانہ میں اور مرثیہ گو بھی تھے۔ جن میں دلگیر اور فصیح قابل ذکر ہیں۔ اور ان سے پیشتر کے مرثیہ گو شعرا میں مسکین۔ افسردہ۔ سکندر وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں ؎

شجرہ خاندان انیس اس خاندان میں شاعری اور علم وفضل پشتوں سے چلا آتا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ میر امامی موسوی ہروی تھے



مونس میر محمد نواب نام تھا۔ انیس کے چھوٹے بھائی تھے۔ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مرثیہ بہت خوب کہتے تھے۔ مگر انیس کی طرح مشہور نہیں ہوئے۔ مرثیہ نہایت موثر اور دلکش انداز سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن خان صاحب والئے ریاست محمود آباد ان کے شاگرد تھے۔ اور معقول مشاہرہ دیتے تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں انتقال ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی ۔

نفیس میر خورشید علی نام تھا۔ انیس کے بڑے بیٹے تھے۔ لیکن بھائیوں سے زیادہ لائق تھے۔ باپ سے اصلاح لیتے تھے۔ بہت قابل اور خوشگو تھے۔ انہوں نے ایک بڑا ذخیرہ مراثی اور سلاموں کا چھوڑا۔ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ پچاسی سال عمر پائی ۔

عارف سید علی محمد نام تھا۔ سید محمد حیدر کے بیٹے اور میر نفیس کے نواسے تھے ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۵۷ سال کی عمر میں انتقال کیا ۔

انہوں نے اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اور انہی کے شاگرد تھے۔ مہاراجہ سر محمد علی خاں والئے ریاست محمود آباد ان کے شاگرد تھے۔ اور ایک سو پچیس روپے ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔

عارف کو زباندان کی حیثیت سے لکھنؤ میں بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ ان کے مراثی بہت فصیح بلیغ اور زوردار ہیں۔ وہ ساقی نامہ وغیرہ نہیں لکھتے۔ اور مرثیت کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔

جلیس | سید ابو محمد نام۔ ابو صاحب عرف۔ اور جلیس تخلص تھا۔ پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔ عین جوانی میں ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل خوب کہتے تھے۔ دولھا صاحب عروج۔ فایق اور قدیم اسی خاندان سے ہیں۔

انس | سید محمد مرزا انس سید علی مرزا کے لڑکے اور سید ذوالفقار علی کے پوتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مگر اب تک ان کا دیوان نہیں چھپا وہ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر تھے۔

ہر اتوار کو بڑے بڑے شاعر مثلاً قلق۔ سحر۔ اسیر وغیرہ ان کے مکان پر جمع ہوا کرتے تھے سو روپے ماہوار ان کو خزانۂ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر کے بعد ملکہ نواب جہان کی ملازمت کر لی تھی۔ ۱۲۷۵ھ میں نواب کلب علی خاں والئے رامپور نے اپنے اُستاد امیر مینائی کو بھیج کر انہیں بلایا تھا۔ تھوڑے عرصے بعد وہ وہاں سے واپس آگئے تھے۔ ۹۵ سال کی عمر میں ۱۳۰۲ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے عشق۔ تعشق۔ صبر۔ صابر اور عاشق ان کے پانچ بیٹے تھے۔

عشق | حسین مرزا نام تھا۔ لیکن میر عشق کے عرف سے مشہور تھے۔ اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیس و دبیر کے ہمعصر تھے۔ ان کا کلام اُستادانہ اور بے عیب ہے۔ ان کے کلام کی عمدگی کے مقابلہ میں انکی شہرت بہت کم ہے۔ ان کے پوتے عسکری مرزا مودب رشید کے شاگرد تھے۔

تعشق | سید مرزا تعشق مرثیہ اور غزل دونو کے اُستاد تھے۔ لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ عرصہ دراز تک کربلا میں رہے۔ اور اپنے بھائی میر عشق کے انتقال کے بعد

واپس آئے۔

ناسخ کے شاگرد تھے۔ اِن کا کلام جذبات۔ حسن بندش۔ نزاکت خیال اور تاثیر کی وجہ سے مشہور ہے۔ حقیقت میں وہ فطری شاعر تھے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز بہت ہے۔ میر انیس ان سے بہت محبت رکھتے تھے۔ وہ ۱۳۰۹ھ میں ۷۰ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

صابر احمد میرزا نام تھا۔ پیارے صاحب رشید انہی کے بیٹے تھے۔ ان کی شادی میر انیس کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس رشتہ سے ان دو مشہور مرثیہ گو خاندانوں میں اتحاد ہوا تھا۔ صابر واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ بیگم کے داروغہ تھے۔ جو منظوم خطوط واجد علی شاہ کلکتہ سے اپنی محبوب بیوی کو بھیجتے تھے۔ ان کا منظوم جواب صابر ہی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ میں انتقال کیا۔

رشید سید مصطفےٰ میرزا نام تھا۔ لیکن پیارے صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ۱۲۶۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اِن کی شادی میر انیس کی پوتی سے ہوئی تھی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے تھے۔ اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ عشق کے بعد تعشق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اِن کی غزلوں اور مرثیوں میں زیادہ تر تعشق ہی کا رنگ ہے۔ رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی۔ وہ انیس کے قدم بقدم چلتے تھے۔ انہوں نے مرثیے۔ غزلیں سلام رباعیاں اور قصیدے بکثرت لکھے ہیں۔

ان کی غزلوں میں سلاست حلاوت اور پابندی محاورہ بہت ہے۔ جدت خیال اور تاثیر کم ہے سلاموں میں بھی غزلیت زیادہ ہے۔ رباعیاں کثرت سے ہیں۔ اور بہت عمدہ ہیں۔ بڑھاپے کی رباعیاں بہت مؤثر اور قابل تعریف ہیں۔

رشید نے مرثیہ میں ساقی نامہ اور مناظر بہار کا اضافہ کیا۔ اس سے مرثیہ کی ادبی حیثیت اور بڑھ گئی۔ اور مرثیہ کی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

رشید نے رام پور۔ پٹنہ۔ عظیم آباد۔ کلکتہ اور حیدرآباد کا سفر کیا۔ اور ہر جگہ سے خراج تحسین

وصول کیا۔

ان کا ۷۷ سال کی عمر میں ۱۳۲۶ھ میں انتقال ہوا۔ سید باقر حمید۔ مودب۔ پروفیسر ناصری۔ جلیس۔ اشہر۔ شدید۔ ناظم۔ فرہاد وغیرہ ان کے مشہور شاگرد ہیں ؛

خاندان دبیر مرزا اوج	مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوج شاعری میں اپنے والد کی پیروی کرتے تھے۔ پٹنہ۔ حیدرآباد اور رام پور وغیرہ میں ان کی بڑی شہرت تھی۔

اپنے والد کی طرح وہ بہت بڑے عروض دان اور زبان دان تھے۔ ایک سالۂ عروض بھی ان کی یادگار ہے ؛

باب ۱۱

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر کا مرتبہ	نظیر کا کلام سب شعرا سے الگ رنگ کا ہے۔ اس لئے ان کا تعلق کسی خاص دور

سے نہیں ہو سکتا۔ قدما کے مقابلہ میں ان کا کلام زمانۂ حال کا معلوم ہوتا ہے۔ متوسطین شعرا کی نسبت ان کے کلام میں آزادہ روی بہت ہے اور مضامین اور انداز بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لکھنؤ کی قدیمی طرز یعنی تصنّع اور بناوٹ سے وہ بالکل پاک ہے۔ دورِ جدید کے شعرا مومن۔ غالب اور ذوق فارسی تراکیب کے دلدادہ تھے۔ لیکن نظیر کا کلام سادہ اور صاف ہے اس لئے ان کے لئے الگ باب قائم کیا گیا ہے ؛

نظیر اکبر آبادی متوفی ۱۲۴۶ھ	نظیر کا نام ولی محمد اور ان کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اُسوقت محمد شاہ کا عہد تھا۔ اور نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ چونکہ اپنے والد کے

بارہ۱۲ بچوں میں صرف یہی زندہ بچے تھے۔ اس لئے بہت لاڈلے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے میں نظیر اپنی ماں اور نانی کو لے کر آگرے چلے آئے۔ وہیں انکی شادی ہوئی۔ اور دو لڑکے ہوئے ؛

نظیرؔ فارسی کی معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ اور تھوڑی سی عربی بھی جانتے تھے۔ ان دنوں خوشنویسی کا بڑا چرچا تھا۔ اس لئے خوشنویسی بھی سیکھی تھی۔ ان کے مزاج میں قناعت اس درجہ تھی۔ کہ نواب سعادت علی خان نے بلایا مگر نہ گئے۔ اور اسی طرح بھرت پور جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا میں معلمی کی۔ پھر آگرہ میں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو سترہ روپے ماہوار پر پڑھانے لگے۔ آخیر عمر میں فالج میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اور اسی مرض میں ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا نظیرؔ نے چونکہ بہت زیادہ عمر پائی تھی۔ اس لئے انشاؔ۔ جرأتؔ اور ناسخؔ کی مجلسیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں نظیرؔ بہت محبت پسند آدمی تھے۔ ہر قسم کے آدمی سے بے تکلفانہ اور بغیر کسی قسم کے تعصب کے ملتے تھے۔ ہر مذہب کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کے وسیع معلومات کا ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے۔ گانے اور سیر تماشے کا بہت شوق رکھتے تھے۔ نہایت حلیم الطبع اور ظریف تھے۔ جوانی میں رنگین مزاج تھے۔ اور عشق و عاشقی کرتے تھے۔ ان کے اسی زمانہ کے کلام میں فواحش بھی پائے جاتے ہیں۔ جوانی میں وہ موتی رنڈی پر عاشق تھے۔ ان کے کلام میں اکثر جگہ اس کا ذکر بھی آتا ہے۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے۔ مگر سارا کلام تلف ہو گیا۔ کیونکہ انہیں اپنا کلام محفوظ رکھنے کا خیال نہیں تھا۔ موجودہ کلام لالہ بلاس داس کی یادداشتوں سے نقل کیا گیا ہے۔

نظیرؔ بحیثیت ناصح

نظیرؔ آخر عمر میں تائب ہو کر صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اس زمانہ کا کلام نہایت پُر اثر ہے۔ اگر ان کے کلام میں سے معمولی شعر نکال ڈالے جائیں تو وہ بہت بڑے فلسفی اور ناصح شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار دُنیا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی کا یقین دلاتے ہیں اور ہم کو رذائل اور معائب سے پاک زندگی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار فقرا خوش الحانی سے پڑھ کر لوگوں کے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔

شیخ سعدی اور نظیرؔ

نظیرؔ کا مقابلہ شیخ سعدی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دونو کا کلام صاف اور سلیس ہے۔ دونوں میں تصوف کا رنگ ہے اور دونوں عاشقانہ رنگ کے اُستاد اور

ناصح شاعر ہیں ؎

نظیر بحیثیت ہندوستانی شاعر | نظیر ایک صُوفی مشرب آدمی تھے۔ ان کو دُنیا کے جھگڑوں اور مذہبی امتیازوں سے کوئی تعلّق نہ تھا۔ وہ ہندو اور مسلمانوں سے دلی محبّت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب اِن کا انتقال ہُوا تو ہندو مسلمانوں کو برابر کا صدمہ پُہنچا۔ اور ان کے جنازے کے ساتھ ہر مذہب کے آدمی انتہائی حزن و ملال کے ساتھ شریک ہوئے۔

نظیر بنی نوع انسان کی طرح حیوانات اور بے جان اشیا سے بھی اُنس رکھتے تھے۔ جانوروں کے متعلّق ان کی نظمیں نہایت دلچسپ اور پُراز معلومات ہیں۔ نظیرؔ ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ اور اس سیر تماشے سے اخلاقی نتیجے نکالتے تھے۔ ان کی معلومات غیر محدود۔ اور خزانۂ الفاظ نہ ختم ہونے والا ہے۔ صفائی بیان نہایت دلکش ہے۔ وہ ہر بات کو صاف صاف کہتے ہیں۔ لیکن اس طریقے سے کہ دوسرے مذہب والوں کو بُرا معلوم نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان کو ہندوستانی شاعر کہنا بالکل درست ہے۔ ان کے خیالات ان کی زبان اور ان کے مضامین مقامی رنگ میں ڈُوبے ہوئے ہیں ؎

خدمات زبان | نظیر کی خدمات زبان بہت قابل قدر ہیں۔ انہوں نے بہت سے ایسے الفاظ لُغات شعریہ میں داخل کئے۔ جن کو شعرا سوقیانہ خیال کرتے تھے۔ نظیرؔ کے مستعملہ لغات ذیل کی تین قسموں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:۔

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی کلام میں ملتے ہیں اور اب خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) ایسے الفاظ جو عام طور پر اُردو شاعری میں استعمال ہوتے آئے ہیں۔

(۳) وہ الفاظ جن سے حُسن شعر بڑھ گیا ہے۔ اور زبان شعر میں وہ قابل قدر اضافہ ہیں ؎

الزامات | کہا جاتا ہے نظیر پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اِن کے اشعار بازاری لوگوں کو پسند تھے۔ ان کا کلام اکثر فحش ہے۔ اور انہوں نے بازاری الفاظ کی آمیزش سے زبان کا ستیاناس کر دیا۔ سیکسینا بابو کے نزدیک یہی ان کی صفات اور خصوصیات ہیں۔ کیونکہ وہ ان چیزوں پر

شاعری کرتے تھے۔ جو عوام کو پسند ہیں۔ اس لئے وہ انہی کی زبان استعمال کرتے تھے۔ وہ ایسی چیزوں کا سچا فوٹو پیش کرتے ہیں۔ اور ان پر اپنی طرف سے کوئی نکتہ چینی نہیں کرتے۔ بلکہ خود ان کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں اسی لئے ان کا کلام دلچسپ اور نیچرل ہے۔ اور تصنع اور بناوٹ اس میں بالکل نہیں۔

نظیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نہ انہوں نے کسی کی ہجو لکھی اور نہ کسی کی تعریف کی۔ یہ دونو باتیں ان کے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں۔ اور سکینا بابو کے نزدیک ان لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں ان سے سرزد ہوئی تھیں۔

جدید رنگ اور نظیر موجودہ نیچرل شاعری کے پیشرو حقیقت میں نظیر اکبر آبادی ہیں۔ جس طرح انیس و دبیر نے مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بے مثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں۔ اسی طرح نظیر نے ایسی معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویر اپنے کلام میں کھینچی ہے۔ جن کا ان سے پہلے کہیں پتہ نہیں ملتا۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں قدرتی مناظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ جس طرح انسان حقیقت میں ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں مشکل لفظ اور پیچیدہ ترکیبیں اور تشبیہیں بالکل نہیں۔ ان کی نظمیں برخلاف اردو غزلوں کے مسلسل ہیں۔ اور ان میں وہ گہرائی نہیں جو اس زمانہ کی طرز میں داخل ہے۔ غالباً یہی ان کی ہردلعزیزی کا سبب ہے۔ آگے چل کر نظیر کی یہی طرز ہمارے ادب کی ترقی کا باعث ہوئی۔ اور موجودہ نیچرل رنگ کی بنیاد پڑی جس کے موجد آزاد اور حالی کہلاتے ہیں۔

نظیر کا ظریفانہ رنگ اور انشا سے مقابلہ نظیر چونکہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے مساویانہ تعلقات رکھتے تھے اس لئے ان کو انسانی فطرت کے مطالعہ کا خوب موقعہ ملتا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انکی ظرافت تکلیف دہ نہیں ہے اور نہ اس میں شہدہ پن ہے۔

نظیر اور انشا دونو اپنے رنگ میں ظرافت کے استاد ہیں۔ مگر دونوں میں فرق ہے انشا کی ظرافت درباری ظرافت ہے جو محض درباریوں اور آقائے نعمت کو خوش کرنے کے لئے

اختیار کی گئی ہے۔ ان کا مذاق درباری مسخروں کا سا ہے۔ وہ اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے دوسروں کی عزّت کا بھی خیال نہیں کرتے۔

برخلاف اس کے نظیر ایک آزاد روش ظریف ہیں۔ جو اپنی پُر مذاق باتوں سے کسی کے دل کو نہیں دکھاتے بلکہ ہنساتے اور خوش کرتے ہیں۔

باوجود اس کے انشا اور نظیر میں کچھ مماثلت بھی ہے۔ دونو نے مشکل مشکل ردیف قافیوں میں طبع آزمائی ہے۔ دونو عربی مصرعہ اشعار میں کامیابی سے موزوں کرتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں مقامی رنگ ہے۔ دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ دونوں کے کلام میں تصوّف ہے۔ زبان کے بارے میں دونوں آزاد ہیں۔ مگر انشا اپنی استعداد علمی کی وجہ سے عربی فارسی الفاظ درست استعمال کرتے ہیں۔ اور بمقابلہ نظیر کے ان کے ہاں متروکات بہت کم ہیں اور ان کی ظرافت کا رنگ بہت گہرا ہے۔

نظیر بحیثیت مصوّر

نظیر کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ اس لئے اپنے اشعار میں وہ نہایت خوش آواز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور واقعات کی صحیح تصویر ایک کامیاب مصوّر کی طرح کھینچ دیتے ہیں۔ وہ صنعت تجنیس کے بہت شایق ہیں۔ اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو معنوں کے ساتھ اپنی آواز سے بھی اظہار مطلب کرتے ہیں۔ دوراز کار تشبیہوں اور بیجا صنائع بدائع سے ان کا کلام پاک صاف ہے۔ اسی لئے وہ واقعات اور جذبات کی صحیح ترین تصویر کھینچنے میں کامیاب ہیں۔

اُردو کا شیکسپیئر کون ہے؟

ڈرامہ کا وجود اہل عجم میں نہیں تھا۔ اُردو شعرا نے اس کو سنسکرت سے بھی اخذ نہیں کیا۔ ہاں سودا نے اپنی طباعی سے ہجو لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ اس لئے انکو مذاحیہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ ان کا انسانی مطالعہ بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو "المیہ نگار" نہیں کہہ سکتے میر کے ہاں سوز و گداز بہت ہے۔ لیکن کیریکٹر نویسی سے وہ ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ انشا کے ہاں ظرافت بہت ہے۔ اور وہ خود ایکٹر بننے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ نیز درباری تعلّق نے

ان کو بالکل بیکار کر رکھا ہے۔

انیس و دبیر فطری شاعر ہیں۔ زبان پر پورے قادر اور کریکٹر نویسی میں مشاق ہیں لیکن ان کی قوت عمل مرثیہ نویسی تک محدود ہے۔ حقیقت میں "پیشن پلے" یعنی نقل واقعات کربلا ڈرامہ سے بہت قریب ہے۔ لیکن مذہبی جوش کی وجہ سے معمولی معمولی جذبات انسانی اس میں نظرانداز ہو جاتے ہیں۔

نظیر کو سودا۔ انشا۔ اور انیس کی طرح زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اور خصائل و جذبات انسانی کی معلومات ان کو اکثر شعرا سے زائد تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ ہر سوسائٹی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے مرد عورتوں اور بچوں کا پوری ہمدردی اور چھان بین سے مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان میں پردہ کی رسم کی وجہ سے وہ زنانہ فطرت کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کر سکے تھے۔ لیکن انہوں نے شاہدان بازاری کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ انکے اکثر اشعار میں اس کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔

نظیر کو کریکٹر نگاری کا بڑا ملکہ تھا۔ اور قوت بیانیہ بھی غضب کی پائی تھی۔ لیکن ان میں نہ تو شیکسپیئر جیسے گہرے خیالات تھے۔ اور نہ اس جیسی اعلیٰ ذہانت تھی۔ نظیر کی نظم "لیلیٰ مجنوں" میں المیہ اور "مہادیو کے بیاہ" کی نظم میں مذاحیہ رنگ پوری طرح موجود ہے۔ لیکن سودا کا زور۔ میر کی بلند پروازی۔ انشا کی ظرافت اور انیس و دبیر کا جوش و خروش نہیں۔ گر یہ سب صفات مجموعی حیثیت سے ضرور موجود ہیں۔

نظیر کی بڑی صفت یہ ہے۔ کہ وہ معمولی معمولی چیزوں میں ایسی دلچسپیاں پیدا کرتے ہیں جو اوروں کے ہاں نہیں ہیں۔ نظیر نے شعر میں نئے نئے رنگ اختیار کئے۔ ادب اُردو کو وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ فاضل شاعر نہیں۔ اس کے کلام میں متروکات و اخلاط بھی بہت ہیں۔ زبان اور خیالات شستہ نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اصلی ہندوستانی شاعر ہیں۔ اور ہر مذہب کے لوگوں کو مرغوب ہیں اور وہ ایسے رنگ کے موجد ہیں۔ جس کو آجکل نیچرل شاعری کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کو شعرائے اردو میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔

شاہ نصیر
متوفی ۱۸۴۰ء

شاہ نصیر کا شمار نظیر اکبر آبادی کی طرح زمانہ اور زبان کے اعتبار سے طبقہ متقدمین میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس لئے ان کو دورِ متقدمین اور متوسطین کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہیئے۔

ان کا نام نصیر الدین تھا۔ اور نصیر تخلص کرتے تھے۔ کالا رنگ ہونے کی وجہ سے میاں کلّو کے عرف سے مشہور تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد شاہ غریب گوشہ نشین فقیر تھے جاگیر کی آمدنی پر بسر اوقات تھی۔ نصیر کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد نے بہت کوشش کی لیکن ان کو سوائے شاعری کے کچھ نہ آیا۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہوئے جو شیخ قیام الدین قائم کے شاگرد تھے۔ گویا اس نسبت سے سودا اور درد سے شاگردی کا تعلق ہوا۔ وہ اپنی شاعری اور خاندانی وجاہت کی بدولت دربار میں پہنچے۔ اور خاطر خواہ انعام پائے۔

شاہ صاحب کو سیر و سفر کا بہت شوق تھا۔ وہ لکھنؤ اور حیدر آباد متعدد مرتبہ گئے۔ دہلی میں اپنے مکان پر مشاعرہ بھی کرتے تھے۔ جہاں ان کے شاگرد ذوق اپنے جوہر دکھاتے تھے۔

جب دہلی تباہ ہوئی تو شاہ نصیر بھی باہر نکلے۔ دو مرتبہ لکھنؤ اور چار دفعہ حیدر آباد گئے جب پہلی دفعہ لکھنؤ گئے تو مصحفی اور انشا اور جرأت سے مقابلے رہے۔ دوسری دفعہ انہوں نے ناسخ اور آتش کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ دیوان چندو لال حیدر آباد میں شعرا کی بہت قدر کرتے تھے۔ انہوں نے ناسخ اور ذوق کو بلایا۔ لیکن وہ نہ گئے۔ شاہ نصیر گئے۔ اور وہاں انکی شاعری کا بازار بہت گرم ہوا۔ آخر چوتھی مرتبہ جب حیدر آباد گئے۔ اور ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں وہیں انتقال کیا۔

شاہ نصیر نہایت متین۔ سنجیدہ۔ بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج بزرگ۔ حنفی مذہب تھے مگر متعصب نہیں تھے۔ لکھنؤ۔ دہلی اور حیدر آباد میں ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ آخر زمانہ میں وہ اپنے مایۂ ناز شاگرد ذوق سے بگڑ گئے تھے۔ کیونکہ وہ زورِ طبع میں میر اور سودا کی غزلوں پر غزلیں

لکھنے لگے تھے ۔

تصانیف | شاہ نصیر پُر گو شاعر تھے ۔ ساٹھ برس شعر و شاعری کرتے رہے ۔ بہت سا کلام تلف ہو گیا ۔ ان کے شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کے کلام کو ترتیب دیا ہے ۔ جو ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ہے ۔

خصوصیات کلام | شاہ نصیر بڑی سنگلاخ زمینوں اور مشکل قافیہ ردیفوں میں غزلیں کہتے ۔ اور ان میں لُطف سخن پیدا کرتے تھے ۔ شکوہ الفاظ کے عاشق تھے ۔ نادر تشبیہیں اور استعارات نکالتے تھے ۔ صائب کی پیروی میں مثالیہ اور اخلاقی مضمون خوب باندھتے تھے ۔ فی البدیہ کہنے میں مشاق تھے علمی استعداد کم تھی ۔ کہیں کہیں متروک الفاظ بھی استعمال کرتے تھے ۔ کلام میں زور اور اثر ہے ۔ لیکن بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں ۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز درجہ کے شاعر ہیں ۔

باب ۱۲

طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دہلی کی شاعری کا دوبارہ عروج | اُردو شاعری کا مرکز نادر شاہی حملوں اور مرہٹوں کی بغاوتوں کی وجہ سے دہلی سے لکھنؤ میں منتقل ہو گیا تھا ۔ لیکن تھوڑی مدت بعد دہلی میں شاعری کو پھر عروج ہونا شروع ہوا ظفر ۔ ذوق ۔ غالب ۔ مومن وغیرہ اس دور کے مشہور شعرا ہیں ۔ اس زمانے کے شعرائے دہلی بھی لکھنؤ کی طرز جدید کے پیرو نہیں تھے ۔ انکے کلام کی خصوصیات حقیقی شاعری اور صحیح جذبات تھے ۔

غالب اور مومن کے ہاں فارسی الفاظ اور محاورات کثرت سے ہیں۔ کیونکہ وہ فارسی کے بھی شاعر تھے۔ انہوں نے قدما کی سیدھی سادی ترکیبیں اور محاورے نکال کر ان کی جگہ فارسی الفاظ کو دی تھی۔ مومن اور غالب کے بعد فارسی کا جزو اردو شاعری میں کم ہوگیا۔ اور شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوگئی۔ غالب اور مومن کے شاگردوں کا کلام دیکھو کس قدر صاف اور سہل ہے۔

مومن
۱۲۱۵ھ تا ۱۲۶۸ھ
۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۱ء

حکیم مومن خاں مومن حکیم غلام نبی کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا نجبائے کشمیر میں سے تھے۔ وہ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر شاہی حکیموں میں داخل ہوئے تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں چند موضع انہیں جاگیر میں ملے۔ انگریزی دور میں ان کو پنشن ملتی تھی۔ اور اسی پنشن کا کچھ حصہ مومن کو بھی ملا کرتا تھا۔

مومن ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ ان کا حافظہ بہت زبردست تھا۔ انہوں نے عربی فارسی خوب پڑھی تھی۔ طب اپنے باپ اور چچا سے سیکھی تھی۔ نجوم میں بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ شاطر بھی بہت زبردست تھے۔ ان مشاغل کو انہوں نے ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ وہ خوبصورت خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ ایام شباب کے بعد توبہ کر لی تھی۔ اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ہوگئے تھے۔

جوانی کا کلام عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخری زمانہ کا کلام پختہ اور سنجیدہ ہے۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو کلام دکھلاتے تھے۔ بعد میں اپنی ذہانت خداداد پر بھروسہ رکھتے تھے۔ وہ دہلی سے پانچ دفعہ باہر گئے۔ لیکن وطن کی محبت پردیس میں نہیں رہنے دیتی تھی۔ جب مرزا غالب نے دلی کالج کی پروفیسری لینے سے انکار کیا تو یہی جگہ مومن کو اس شرط پر دی گئی کہ وہ باہر جائیں لیکن مومن نے دہلی چھوڑنی قبول نہ کی۔ وہ کپور تھلے تین سو روپیہ ماہوار پر اس لئے نہیں گئے کہ وہاں اتنی ہی تنخواہ ایک گویئے کو ملتی تھی۔ والئے ٹونک نے ایک مرتبہ ان کو بلایا لیکن دہلی کی پُرلطف صحبتوں کو چھوڑنے کو ان کا جی نہ چاہا۔ ان کے کریکٹر کی یہ نمایاں خصوصیت ہے۔ کہ انہوں نے

رئیسوں کی خوشامد نہیں کی۔ ان کے دیوان میں محض قصیدۂ ذیل ملتا ہے۔ جو مہاراجہ پٹیالہ کی شان میں اس وقت لکھا تھا۔ جب انہوں نے ایک ہتھنی تحفۃً دی تھی ؎

صبح ہوئی تو کیا ہُوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلہ شمعِ خاوری

مومن اپنی قابلیت اور جوہرِ ذاتی کے مقابلہ میں سب کو ہیچ سمجھتے تھے۔ وہ گلستان سعدی کو ایک معمولی کتاب جانتے تھے۔ تاریخ گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ نئے نئے انداز سے تاریخیں نکالتے تھے۔ تخرجہ اور تعمیہ پہلے بُرا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ان کے کمال نے اس کو نہایت درجہ مرغوب و مقبول بنا دیا۔

ان کا دیوان ان کے مشہور شاگرد مصطفےٰ خاں شیفتہ نے مرتب کیا تھا۔ اس میں تمام اصناف سخن موجود ہیں ؏

خصوصیات مومن مومن خاں نازک خیالی اور بلند پروازی کے لئے شہرہ آفاق ہیں۔ انکی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں بلند پروازی اور صحیح جذبات نگاری ایسے خوبصورت انداز سے موجود ہے۔ کہ طرز لکھنؤ سے ان کو علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ اُستاد ہیں۔ غالب کی طرح فارسیت کے دلدادہ ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ فارسیت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ ان کی مثنویاں سرتیز نشتر ہیں۔ البتہ ان میں عشق بازاری ہے۔ اور طرز ادا بلند نہیں۔ مومن نے الفاظ کا ایسا طلسم باندھا ہے۔ کہ اس سے تخیل کے نئے راستے کھل گئے ہیں ؏

انتخاب کلام

روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

پس از شکستن خم زجر محتسب معقول
گنا ہگار نے سمجھا گنا ہگار مجھے

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف
خونِ فرہاد سرِ گردن فرہاد رہا

مرتبۂ مومن مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ وہ صاحب طرز تھے۔ نسیم دہلوی۔ امیر اللہ تسلیم۔ حسرت موہانی وغیرہ انہی کے پیرو ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ میر حسن تسکین۔

میر غلام علی وحشت۔ اصغر علی خاں وغیرہ ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

مومن ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر گئے۔ انہوں نے خود حکم لگایا کہ پانچ دن۔ پانچ مہینے یا پانچ برس میں مرونگا۔ چنانچہ پانچ مہینے بعد مر گئے۔ دست و بازو بشکست یعنی (۱۲۶۸ھ) اپنے گرنے کی تاریخ کہی تھی۔ وہی مرنے کی تاریخ ہوئی۔

شیفتہ
۱۲۲۱ھ تا ۱۲۸۶ھ
۱۸۰۵ء تا ۱۸۶۹ء

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نواب مرتضیٰ خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے والد نے لارڈ لیک کے ساتھ بڑے بڑے کام کئے تھے۔ اور اس کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا۔ شیفتہ ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ غدر بعد وہ اپنے علاقے جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں آ رہے تھے۔ وہ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ کہتے ہیں۔ فارسی میں غالب سے اور اُردو میں مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ شاید وہ اپنا کلام مومن کے بعد غالب کو دکھانے لگے ہوں۔

شیفتہ نے امام بخش صہبائی۔ عبداللہ خاں علوی۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ شاہ نصیر غالب۔ ذوق۔ احسان۔ تسکین اور حکیم آغا جان عیش جیسے لوگوں کی صحبتوں میں پرورش پائی تھی۔ ان کے ہاں خود مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ غالب جیسا صاحب کمال اپنے کلام کی کسوٹی شیفتہ کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے ؎

غالب بفن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

شیفتہ حج کرنے کے بعد شعر کی طرف سے بے توجہ ہو گئے تھے۔ اور بُری باتوں سے توبہ کر کے عبادت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ ان کی شہرت ناقد کی حیثیت سے بہت ہے۔ ان کا تذکرہ گلشن بے خار آزادانہ تنقیدوں سے مالامال ہے اُردو شاعری میں وہ مومن کے پیرو ہیں۔ اخلاق و تصوف ان کے کلام کی جان ہے۔ اُردو اشعار اگرچہ بہت اعلیٰ نہیں۔ مگر بلند مضامین۔ صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجے کے

شعرا میں ان کا درجہ ممتاز ہے۔ ان کا کلام ان کے صاحبزادے نے چھپوا دیا ہے ؀

میر حسین نام تھا۔ میر احسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں امام بخش صہبائی سے پڑھیں۔ شاہ نصیر سے اصلاح	تسکین ۱۲۱۸ھ تا ۱۲۶۸ھ ۱۸۰۳ء تا ۱۸۵۱ء

سخن لی۔ ان کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے وہاں سے ناکام رام پور گئے۔ جہاں نواب یُوسف علی خاں والئے رام پور نے بڑی قدر دانی کی آخر کچھ مدت بعد ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں وہیں انتقال کیا۔

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں ان کا خاص رُتبہ تھا۔ وہ اس طرح اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ کہ دونوں کے کلام میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسی بھی نامور شاعر تھے ؀

مرزا اصغر علی خان نام تھا۔ نواب آقا علی خاں کے بیٹے تھے۔ دہلی میں ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ باپ کے بعد بڑے	نسیم دہلوی ۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۴ء

بھائی سے ناموافقت ہو گئی اور نسیم لکھنؤ چلے آئے۔ بعد میں معافی مانگ کر بھائیوں نے ملنا چاہا۔ لیکن وہ نہیں مانے اور پھر کبھی دہلی نہ آئے۔ وہ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ سے بسر کرتے رہے۔ مگر کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ احکام مذہب کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ غدر کے بعد انہوں نے منشی نولکشور کے ہاں الف لیلیٰ کو نظم میں لکھنا شروع کیا۔ پہلا دفتر ختم کرنے کے بعد مطبع والوں نے جلدی مچائی۔ جو ان کو ناگوار گزری۔ اس لئے اس کام سے دست کش ہو گئے۔

اسوقت طرز لکھنؤ بہت زوروں پر تھی۔ لیکن نسیم کو اپنی خاص طرز میں شہرت حاصل تھی وہ اپنے کلام کو احتیاط سے نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے بہت کچھ تلف ہو گیا۔ ان کے شاگرد عبدالواحد خان نے ان کے کلام کو چھپوا دیا تھا۔ لیکن وہ اس کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے مرزا غالب نسیم کی غزلوں کو پسند کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ طرز اور زبان میں دہلی کے پیرو تھے۔ لیکن بہت سے اہل لکھنؤ ان کے شاگرد تھے۔ جن میں عبداللہ خاں مہر۔ منشی اشرف علی

اشرف اور منشی امیر اللہ تسلیم مشہور ہیں ۔

طرز کلام نسیم کے کلام میں مومن کا رنگ بہت تھا۔ ان کی لطیف طرز میں نازک خیالی کی آمیزش ہے۔ اور یہ مومن کا فیض تھا۔ نسیم کو صحت محاورات اور تازگی مضامین کا بہت خیال تھا۔ لکھنؤ کی تصنع اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے اُستاد کی طرح فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے ہیں۔ ان کا رتبہ دوسرے درجے کے شعرا میں بہت بلند ہے ۔

ذوق
۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۴ء

شیخ ابراہیم نام تھا۔ وہ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول سے پائی تھی۔ حافظ صاحب شعر کا ذوق رکھتے تھے۔ اور محلے کے لڑکے ان سے پڑھتے تھے۔ بچپن میں ذوق اپنا کلام حافظ صاحب ہی کو دکھاتے تھے۔ اسوقت شاہ نصیر کی دہلی میں بہت شہرت تھی۔ ان کے ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ان کی وساطت سے ذوق بھی شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے۔

ذوق کی طباعی سے شاہ نصیر کو خیال ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہونہار شاگرد اُستاد سے بڑھ جائے۔ اس لئے وہ اکثر ان کا کلام بغیر اصلاح کے پھیر دیتے اور کہتے طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ ایک دفعہ ذوق نے سودا کی غزل پر غزل کہی۔ اس پر شاہ نصیر بہت ناراض ہوئے۔ اور غزل اُٹھا کر پھینک دی۔ غرض انہی باتوں نے ذوق کی طبیعت کو اُبھارا اور سلسلۂ شاگردی ختم کر دیا۔ اب ذوق اپنے کلام کو خود ہی دیکھتے تھے۔ ان کے کلام کی بہت جلد شُہرت ہو گئی۔ اس زمانہ میں ظفر ولیعہد تھے۔ اور قلعہ میں بڑے زور کے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ذوق بھی وہاں جاتے اور اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ اتفاق سے شاہ نصیر دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اور ولیعہد بہادر کے کلام کی اصلاح میر کاظم حسین بیقرار کے سپرد تھی۔ اتفاقاً ان کو بھی کہیں باہر جانا پڑا۔ اب اصلاح کی خدمت ذوق کے سپرد ہوئی۔ اور چار روپے ماہوار تنخواہ بھی مقرر ہو گئی۔ کم تنخواہ کی تلافی اس طرح ہوئی کہ تمام شعرا ان کو اُستاد ماننے لگے۔ مولانا آزاد

نے لکھا ہے نواب الٰہی بخش خاں معروف جو مرزا غالب کے خسر اعلیٰ خاندان عالی ہمت اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہ پہلے شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اب وہ بھی ذوق سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ تذکرۂ گُل رعنا کے مصنف نے لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے جوش عقیدت میں یہ لکھدیا ہے ورنہ نواب صاحب کی عمر اسوقت چھپاسٹھ برس کی تھی۔ اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے ہونگے۔" تعجب ہے سوچنے کی بات ہے۔ کہ آخر ذوق میں کچھ تو جوہر تھے۔ کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں ولیعہد بہادر کے اُستاد اور خاقانی ہند کے خطاب سے سرفراز ہو گئے تھے۔

حقیقت امر یہ ہے۔ کہ انہی لوگوں کی شاگردی نے ذوق کی طبع عالی پر جلا کی تھی۔ نواب صاحب سودا۔ جرأت اور درد کی طرز میں شعر لکھتے تھے۔ اور اُستاد ذوق اسی رنگ میں ان کی اصلاح کرتے تھے۔

شاہ نصیر سے معرکہ جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو ذوق خاص و عام سے اُستادی کی سند لے چکے تھے۔ اور مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں آسانی سے غزلیں کہتے تھے۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل لکھی تھی۔ جس کی ردیف "آتش و آب و خاک باد" تھی شاہ نصیر نے وہی غزل ایک مشاعرے میں سُنائی اور کہا اگر کوئی اس طرح میں غزل کہے تو اس کو اُستاد مانتا ہوں۔ ذوق نے اسی طرح پر ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر تیار کئے۔ شاہ صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گذری۔ انہوں نے ایک شاگرد سے اس پر اعتراض کرائے۔ جس کے ذوق نے خاطر خواہ جواب دیئے۔ اور کہا آپ نے تو ایک غزل کے لئے کہا تھا۔ اور میں نے ایک غزل اور تین قصیدے لکھ ڈالے ہیں۔ اب بھی آپ اُستاد تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے بعد سے ان کی اُستادی مسلم ہو گئی۔

ذوق کے پُر زور قصاید کے صلے میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو خاقانی ہند کا خطاب دیا تھا۔ جب ظفر بادشاہ ہوئے تو ان کی تنخواہ سو روپے تک ہو گئی تھی۔ ہمیشہ خلعت۔ گاؤں اور انعام ملتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے اسی تنگ و تاریک مکان میں رہتے۔ اور ۶۸ سال کی عمر میں ۱۸۵۴ء

میں وہیں انتقال کیا۔

اُستاد ذوق کا حافظہ اور ذہن بہت تیز تھا۔ دل میں خوف خدا بیحد تھا۔ شروع میں موسیقی۔ نجوم۔ اور طب وغیرہ سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن کمال شعر گوئی میں حاصل کیا تھا۔ فقہ تصوف تفسیر۔ حدیث۔ تاریخ پر بہت عبور تھا۔ روزے نماز کے سختی سے پابند تھے۔ ان کو دہلی سے بہت محبت تھی۔ راجہ چندو لال نے حیدر آباد کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے یہ لکھ کر ٹال دیا ؎

ان دنوں دکن میں ہے گرچہ بڑی قدر سخن

کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

تصانیف اُستاد ذوق تقریباً پچاس سال تک شعر و شاعری کرتے رہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا سارا کلام ہنگامہ غدر میں ضائع ہو گیا۔ ان کے شاگرد مولٰنا آزاد نے ان کے باقیماندہ کلام کو دیوان ذوق کے نام سے مرتّب کیا ہے۔

خدمات زبان ذوق نے زبان کو خوب صاف کیا۔ وہ الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کماحقہ واقف تھے۔ محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے۔

اندازِ کلام ذوق کی شاعری میں تصنع اور تکلف بالکل نہیں ہے۔ استعارے تشبیہیں و صنائع بدائع انہوں نے نہایت احتیاط سے صرف کئے ہیں۔ جس سے حُسن شعر دوبالا ہو گیا ہے۔ انکے کلام میں روانی اور ترنم ہے۔ اعلٰی تخیل اور بلند مضامین الفاظ کی خوبصورتی اور برمحل استعمال میں مزاحم نہیں ہوتے۔ ان کا کلام حشو و زوائد سے پاک ہے۔ زورِ کلام اور تنوع کو مدِنظر رکھ کر ان کا مقابلہ سودا سے ہو سکتا ہے۔ ویسے ان کے ہاں درد، جرأت اور مصحفی کا رنگ بھی موجود ہے۔ قصیدہ گوئی میں وہ اُستاد کامل تھے۔ اس صنف میں بھی وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان کی غزلیں تازگیٔ مضامین خوبیٔ محاورہ سادگی اور صفائی کے لئے مشہور ہیں۔

نازک خیالی اور معنی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں۔ مگر سادگی صفائی اور ترنم الفاظ کے لحاظ سے وہ ان سے بہت آگے ہیں۔ اور قصیدے میں تو ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

شاگرد | ان کے شاگرد تو سینکڑوں تھے لیکن داغ۔ ظفر۔ آزاد۔ ظہیر اور انور بہت مشہور ہوئے ہیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے خلیفہ محمد اسمٰعیل غدر سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔

ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء | سید ظہیر الدین نام تھا۔ ان کے والد سید جلال الدین حیدر ابو المظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں استاد تھے۔ انہوں نے مرصع رقم اور خان بہادری کے خطاب بھی پائے تھے۔ ظہیر بھی بچپن ہی سے شاہی ملازم تھے۔ اور شعر و شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ چودہ برس کی عمر میں وہ استاد ذوق کے شاگرد ہوئے۔

ظہیر غدر میں دہلی سے نکل کر جھجر۔ سونی پت۔ نجیب آباد۔ بریلی اور لکھنؤ گئے۔ وہاں بھی ابتری دیکھی تو رامپور پہنچے چار برس رہ کر دہلی آئے اور محکمہ چونگی میں ملازمت کر لی۔ پھر اخبار جلوۂ طور کے ایڈیٹر ہو گئے۔ جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ مہاراجہ الور ان کے مضامین کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے الور بلا لیا۔ جہاں وہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے تنگ آ کر دہلی چلے آئے پھر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور پولیس میں ملازم ہو گئے۔ وہاں اُنیس برس بعد والئے ریاست کے انتقال سے ملازمت جاتی رہی۔ چند روز پریشانی میں گذرے۔ پھر نواب ٹونک نے بلا لیا۔ جب تک وہ زندہ رہے ان کے ساتھ رہے۔ نواب کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے نے ظہیر کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طرح پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں ٹونک سے رخصت لے کر حیدر آباد آ گئے۔ جہاں آٹھ مہینے بعد بار یابی ہوئی اور ابھی تنخواہ مقرر نہ ہونے پائی تھی۔ کہ انتقال کر گئے۔

ظہیر ایک پُر گو شاعر تھے۔ ان کے چار دیوان ہیں۔ پہلے تین چھپ چکے ہیں۔ اگرچہ وہ ذوق کے شاگرد تھے۔ لیکن کلام میں مومن خاں کا رنگ ہے۔ اور وہ خود کہتے ہیں ؎

طرز مومن سے نہ آگاہ تھا جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

ظہیر آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے۔ اور استاد مانے جاتے تھے۔ انکے مشہور شاگرد

نجم الدین ثاقب بدایونی پہلوان سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

انور — سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا ظہیر دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور اُستاد ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے بعد اپنا کلام غالب کو دکھاتے تھے۔ نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے۔ انہوں نے ۴۰ سال کی عمر میں جے پور میں انتقال کیا۔

وہ غدر کے بعد کے ان مشاعروں میں شریک تھے۔ جن میں داغ۔ حالی۔ ظہیر۔ مجروح۔ سالک وغیرہ چھاتے تھے۔ ان کے کلام میں ذوق۔ غالب اور مومن کا رنگ ہے۔

غالب
سنہ ۱۲۱۲ تا سنہ ۱۲۸۵ھ
سنہ ۱۷۹۶ تا سنہ ۱۸۶۹ء

نام مرزا اسداللہ خاں تھا۔ اسد اور غالب تخلّص کرتے تھے۔ اسد آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کو اپنی ذاتی قابلیت اور عالی خاندانی پر بہت ناز تھا۔ ان کا سلسلۂ خاندان ایبک ترکمانوں سے ملتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل سے بتاتے تھے۔ مرزا کے دادا ہندوستان آکر شاہ عالم کے دربار میں ملازم ہوئے تھے۔ مرزا کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں متلوّن مزاج تھے وہ پہلے حیدرآباد کی فوج میں ملازم ہوئے۔ پھر الور میں نوکر ہوئے۔ اور وہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اسوقت مرزا کا سن پانچ سال کا تھا۔ مرزا کی والدہ خواجہ غلام حسین آگرے کے رئیس کی لڑکی تھیں۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کو ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے تعلیم و تربیت دی۔ وہ انگریزی فوج کے رسالدار تھے۔ اور اپنی خدمات کے صلے میں انہوں نے جاگیر پائی تھی۔ مرزا نو برس کے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ سرکار انگریزی سے مرزا کی پنشن مقرر ہوگئی تھی۔ اب مرزا کی تعلیم و تربیت ان کی ننہیال کے سپرد تھی۔ ان کا بچپن آگرے میں گذرا۔ کہتے ہیں انہوں نے نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔

چودہ برس کی عُمر تھی۔ کہ مرزا کی مُلاقات ہرمز نامی پارسی سے ہوئی۔ بعد میں وہ پارسی مسلمان ہوگیا تھا۔ اور عبدالصمد نام رکھ لیا تھا۔ مرزا نے دو سال اسی سے اکتساب فارسی کیا۔ اسی کے فیضان صحبت سے مرزا صحیح اور بامحاورہ فارسی بولنے اور لکھنے لگے۔

مرزا پہلی مرتبہ ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۱ء میں دہلی آئے۔ اسوقت ان کا سن تیرہ برس کا تھا۔ مرزا کی شادی ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی جو نواب لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ اس وقت دہلی میں شعروشاعری کا بہت چرچا تھا۔ مرزا پہلے فارسی میں کہتے تھے لیکن ماحول کے اثر سے اُردو میں بھی کہنے لگے۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب کسی شخص کا یہ شعر سنا ؎

اسد تم نے غزل اچھی بنائی   اسے او شیر رحمت ہو خدا کی

تو اس تخلص سے نفرت ہوگئی۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء سے غالب تخلص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسد بندھ چکا تھا۔ انہیں اسی طرح رہنے دیا۔

اب مرزا کی پنشن بند ہوگئی تھی۔ اس کے لئے وہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے۔ ولایت میں بھی اپیل کی مگر ناکام رہے۔ واپسی میں لکھنؤ اور بنارس کی سیر کی۔ انہوں نے ایک قصیدہ بادشاہ اودھ نصیر الدین حیدر شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جہاں سے پانسو روپے سال مقرر ہوگئے۔ لیکن دو سال بعد سلطنت اودھ کا خاتمہ ہوا۔ اور وظیفہ بھی ختم ہوگیا۔ ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء میں کوتوال شہر کی عداوت سے غالب تین ماہ قید رہے۔ لیکن ان کے مرتبے کے مطابق وہاں بھی انکا احترام ہوتا تھا ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ ٹامسن صاحب سیکرٹری گورنمنٹ انگریزی نے ان کو بلایا۔ لیکن وہ استقبال کے لئے باہر نہ آئے۔ یہ بات مرزا نے کسرِ شان خیال کی اور نوکری نہ کی۔

۱۸۴۹ء میں بادشاہ نے ان کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب دیا۔ پچاس روپے ماہوار مقرر کئے۔ اور تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا۔ ذوق کی وفات کے بعد اصلاح کا کام بھی انہی کے سپرد ہوا۔ غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہوگئی تھی۔ لیکن بے گناہ ثابت ہونے پر عزت اور پنشن بحال ہوگئی۔ غالب نواب یوسف علی خاں والئے رام پور کے بھی اُستاد تھے۔ اور سو روپیہ ماہوار ان کی سرکار سے پنشن پاتے تھے۔ آخر ۷۳ سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں انہوں نے دہلی میں انتقال کیا۔ اور درگاہ نظام الدین اولیاء میں دفن ہوئے۔

عام حالات غالبؔ نہایت ملنسار اور خلیق تھے۔ وہ اپنے احباب کے ساتھ نہایت وضعداری اور محبت سے خط و کتابت کرتے تھے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ اُردوئے معلیٰ کے نام سے چھپا ہے۔ جو اُردو ادب میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مذہبی تعصبات سے بالاتر تھے۔ ان کے شاگرد اور دوست ہندو بھی تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ فارسی کے شاعر تھے۔ اور ان کے خاص شاگرد تھے۔ مرزا کبھی آسودہ حال اور فارغ البال نہیں ہوئے۔ باوجود اس کے ان کی آمدنی اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے لئے وقف تھی۔ وہ نہایت صاف گو اور پاک باطن تھے۔ اپنے عیوب کبھی نہیں چھپاتے تھے۔ خُلق اور تواضع کے ساتھ وہ خوددار بھی بہت تھے چنانچہ دہلی کالج کی پروفیسری سے محض انہوں نے اس لئے انکار کر دیا تھا۔ کہ ٹامسن صاحب نے بدستور سابق ان کا استقبال نہیں کیا تھا۔

مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ بیوی سے ان کے تعلقات کچھ شگفتہ نہیں تھے۔ لیکن ظاہرہ رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ان کی اولادیں بچپن ہی میں ضائع ہوگئیں تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی فاترالعقل تھے۔ وہ اپنی بیوی کے بھانجے عارف سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اس کے جوان مرنے سے ان کو بہت صدمہ تھا۔ ان کا چھوٹا بھائی بھی غدر میں مر گیا تھا۔

سکسینا بابو کہتے تھے۔ آخر عمر میں مرزا کی زندگی آلام و امراض کے لئے وقف ہوگئی تھی ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کرتے ہوں لیکن کیا فرماتے ہیں۔ سکسینا بابو مرزا کی ایام شباب کی شراب نوشی کے متعلق ؟

چونکہ مرزا نے میر صاحب کی طرح درد اور دُکھ پائے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں بھی سوز اور درد ہے۔ انکے کلام میں تفاخر بیجا نہیں۔ بلکہ اس سے حُسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

مرزا کی نمایاں خصوصیت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے۔ وہ ہر دُکھ کو ہنسی کھیل میں کاٹ دیتے ہیں۔ اور کس فلسفیانہ انداز سے کہتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غرض مرزا کی ظرافت اور لطافت سخت سے سخت موقعوں پر بھی کم نہیں ہوتی۔ وہ اپنی بیوی کے متعلق لکھتے ہیں "ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹُوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے"۔

غالب بحیثیت شاعر | مرزا کی شاعری کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور اس سے کسی کو انکار نہیں وہ وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے۔ ان کو فارسی سے خاص دلچسپی تھی اور ہمیشہ کہتے تھے۔ کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے لگانا چاہئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کی فارسی شاعری کی طرف ابھی تک کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس وقت تک ان کی شُہرت اُردو کلام کی وجہ سے ہے اُردو میں وہ احباب کے اصرار پر یا تبدیل ذائقہ کے لئے کہتے تھے۔ حافظہ بہت اچھا پایا تھا۔ کتابیں مانگ کر پڑھتے اور ان کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھتے تھے۔ فی البدیہہ کہنے کی بھی عادت تھی۔ کلکتہ میں چکنی ڈلی پر فی البدیہہ قطعہ کہا تھا۔ فن عروض کے اُستاد تھے۔ نجوم میں بھی دخل تھا۔ تصوف سے خوب واقف تھے۔ اور ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے۔

تصانیف | یُوں تو ان کی بارہ[12] تیرہ[13] تصانیف ہیں لیکن دیوان اُردو۔ اُردوئے معلیٰ قاطع برہان اور مہر نیمروز وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

فارسی کلام | غالب نظم و نثر فارسی دونوں کے اُستاد تھے۔ اُن کی فارسی دانی کا اندازہ ان کی تصنیف قاطع برہان سے ہو سکتا ہے۔ جس میں انہوں نے فارسی کی مشہور لُغت برہان قاطع پر فاضلانہ اعتراض کئے ہیں۔ فارسی شاعری میں ان کا مقابلہ خسرو، بیدل، نظیری، فیضی اور حزیں وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور

(۱) مرزا کی شاعری کا دورِ اوّل اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اور وہ پچیس سال کی عمر میں جاکر ختم ہوتا ہے جب انہوں نے اپنے اُردو دیوان کو چھانٹا اور موجودہ دیوان اس میں سے نکالا۔ حُسنِ اتفاق سے اب مکمّل دیوان بھی مل گیا ہے۔ جس سے ان کے ابتدائی رنگ کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے ابتدائی کلام میں ایسی عجیب و غریب تشبیہیں اور بلند پروازیاں ہیں۔ جن سے شعر کے معنی مبہم ہوجاتے ہیں۔ اور فارسی کی مخصوص بندشیں اور غیر مانوس الفاظ شعر کی روانی اور فصاحت کلام کو خراب کر دیتے ہیں۔ وہ اثر اور عمق جوان کے بعد کے کلام میں ہے ابتدائی کلام میں نہیں۔ شروع کے اشعار میں فارسی کی اس قدر آمیزش ہے۔ کہ ان کو مشکل سے اردو اشعار کہا جاسکتا ہے۔ بلکہ ادنیٰ تغیّر سے وہ بالکل فارسی بن جاتے ہیں۔ ایسے اشعار سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ آئندہ بہت ترقّی کرنے والے ہیں۔ اصل میں وہ مرزا بیدل کی پیروی کرتے تھے اور اُردو میں یہ طرز کچھ چلتی نہیں تھی اس لئے حکیم آغا جان عیش نے خوب کہا تھا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے ۔۔۔ مزا کہنے کا ہے جب اک کہے اور دُوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے ۔۔۔ مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

آخرکار مولنا فضل حق خیرآبادی مفتی صدرالدین آزردہ نے یہ رنگ ترک کرادیا تھا۔

(۲) دوسرے دور میں غالب کے کلام میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے ان کو مرغوب تھا۔ اس میں زبان صاف ہے۔ الفاظ پر قدرت بڑھ گئی ہے۔ فارسی بندشوں اور محاورات کے استعمال میں احتیاط ہے۔ مگر فارسی خیالات موجود ہیں۔ لیکن وہ طبعِ سلیم پر گراں نہیں گذرتے۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی دقت سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور حق یہ ہے ان گتھیوں کو سلجھا کر ایک قسم کی مسرّت ہوتی ہے۔

(۳) مرزا کی شاعری کا تیسرا دور ان کی شاعری کا ارتقائی دور ہے اس دور کے بعض اشعار اپنی جامعیّت اور اختصار میں بے مثال ہیں۔ ندرتِ خیال کے ساتھ لطافتِ زبان اور شُستگیٔ کلام

عجیب لطف دیتی ہے۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے غالب کو شعرائے اردو کی صف اوّلین میں ممتاز جگہ ملی ہے۔

(۱) جدت پسندی — خصوصیات غالب

غالب کے ہاں تخئیل۔ طرزِ ادا۔ تشبیہات استعارات۔ محاکات۔ تراکیب الفاظ غرض ہر چیز میں جدت ہے۔ پامال مضامین کو وہ ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ کہ بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اپنے اسلوب بیان سے نہایت ادنیٰ مضمون کو بے انتہا بلند کر دیتے ہیں۔ اس سے شعر ایک معمّا بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا حل کرنا دماغ کو بہت لطف دیتا ہے۔ نیز غالب کے ہاں الفاظ خیالات کے تابع ہیں۔ اور دوسرے شعرا کے ہاں معاملہ برعکس ہے۔ جس سے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے غالب کے کلام میں محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی　　ظلمے ست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

(۲) نظر فریب طرز تحریر

غالب کے کلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اس کے لوازمات جمع کر لیتا ہے۔ گویا ان کے ہاں بات سے بات پیدا ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(۳) ذاتی جذبات کا ادا کرنا

ان کے اشعار ان کے خیالات کا صحیح فوٹو گراف ہیں۔ وہ زندگی اور اس کی مختلف کیفیات کو نہایت دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

(۴) فلسفہ اور حقیقت

مرزا بہت بڑے فلسفی شاعر تھے۔ وہ حقایق فلسفہ کو اپنے اشعار میں نہایت آسان اور سادہ طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ اور رموز و حقایق تصوف سے پوری طرح واقف اور تعصبات سے آزاد ہیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(۵) جذبات نگاری | انہوں نے جذبات انسانی کو نہایت مؤثر و دلکش الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ظرافت و شوخی | مرزا کے کلام میں درد اور شوخی دونوں نہایت عمدہ نسبت سے ملے ہوئے ہیں۔ متین سے متین آدمی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

غالب اور معاصرین | علوئے خیال۔ فلسفۂ حیات اور ذہانت طباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن روزمرّہ سادگئ بیان اور محاورہ بندی میں ذوق ان سے بہت آگے ہیں۔

(۱) یورپ میں رابرٹ براؤننگ غالب کا ہمعصر تھا۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ تھا۔ کہ وہ رُوح کا تجزیہ کرتا تھا۔ غالب کا کلام اس قدر تجزیہ نہیں کرتا۔ لیکن رموز روحانی کے عمق کو خوب دریافت کرتا ہے۔ ان کا کلام سراپا تصوّف نہیں۔ مگر اس میں جا بجا تصوّف کی جھلک ضرور ہے۔

(۲) جرمن کے شاعر ہینؔ سے مرزا غالب کا مقابلہ خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) جرمن کا مشہور فلسفی شاعر گوئٹے غالب کا مدِمقابل ہے۔

غالب کے شاگرد | یوں تو غالب کے بکثرت شاگرد تھے۔ لیکن نواب ضیاء الدین نیرّ درخشاں۔ میر مہدی مجروح۔ مرزا قربان علی بیگ سالک حالیؔ۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ نواب علاءالدین خاں علوی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

مجروح
متوفی ۱۹۰۲ء | میر مہدی نام تھا۔ میر حسین کے بیٹے تھے۔ مجروح تخلّص کرتے تھے اور غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ غدر میں اپنا وطن دہلی چھوڑ کر پانی پت جا رہے تھے۔ جب غدر کا طوفان دُور ہوا تو پھر دہلی آ گئے اور شعر و شاعری میں مشغول رہے تلاش روزگار میں الور گئے۔ وہاں کے راجہ شیودھان سنگھ نے ان کی بہت قدردانی کی آخر عمر میں

نواب رام پور کے دربار سے وابستہ ہو کر آرام کی زندگی بسر کی ؎

خصوصیات کلام	زبان نہایت صاف سادہ اور شیریں ہے۔ چھوٹی بحروں میں خوب شعر نکالتے

ہیں۔ خیالات اور مضامین میں جدّت نہیں ہے۔ مگر کلام عیوب سے پاک ہے انہوں نے اُردو کی روایات قدیمہ کو خوب نبھایا ہے۔ مرزا غالبؔ ان کی بہت قدر کرتے تھے ؎

سالک متوفی ۱۸۹۳ء	مرزا قربان علی بیگ سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے۔ بعض کہتے ہیں۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اور بعض دہلی کی پیدائش بتاتے ہیں۔

غرض نشو و نما دہلی میں پائی تھی۔ پہلے قربان تخلص تھا۔ اور مومنؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد غالبؔ کے شاگرد ہوئے اور سالکؔ تخلص کیا۔ غدر میں الور جا کر وکالت شروع کر دی تھی وہاں سے حیدر آباد گئے۔ اور محکمۂ تعلیم کے سررشتہ دار ہو گئے۔ کچھ مدت مخزن الفوائد رسالہ اردو) حیدر آباد کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انہوں نے ۱۲۹۱ھ میں حیدر آباد میں انتقال کیا۔

غالبؔ کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ ان کا کلام جدّت سے خالی ہے۔ مگر خیال عمدہ اور زبان اچھی ہے۔ ان کا شہر آشوب دہلی اور مرثیہ غالبؔ بہت درد انگیز ہے ؎

زکی متوفی ۱۹۰۳ء	نواب سیّد محمد زکریا خاں رضوی ۱۸۳۹ء میں دہلی پیدا ہوئے۔ وہ نہایت عالی خاندان تھے۔ ان کے والد اور نانا دونو مشہور شاعر تھے۔ زکی کو عربی فارسی پر

خوب عبور تھا۔ حدیث۔ فقہ۔ تصوّف اور نجوم میں ان کو کامل دستگاہ تھی۔ موسیقی اور خوشنویسی بھی جانتے تھے۔ صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم درسیہ میں شاگرد تھے۔ مرزا غالبؔ سے کچھ قرابت داری تھی۔ اپنا کلام بھی انہی کو دکھاتے تھے۔ اور وہ نہایت محبت سے پیش آتے تھے۔

زکی کو شعر و شاعری کا بہت شوق تھا۔ وہ طرز غالبؔ کی پیروی کرتے تھے۔ خیال آفرینی اور جدت تخیّل ان کے کلام کا جوہر ہے۔ لیکن درد و اثر ان کے ہاں کم ہے۔ سلسلۂ معاش میں وہ میرٹھ گورکھپور اور الہ آباد میں بھی رہے۔ آخر ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے سے بدایوں میں پنشن پائی

اور ۱۹۰۳ء میں وہیں انتقال کیا۔ نرکی طرز قدیم کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت جوہر ناتھ کول ساقی بہت مشہور ہیں +

رخشاں متوفی ۱۸۸۵ء	نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر اور رخشاں تخلّص کرتے تھے۔ نواب احمد بخش رئیس لوہارو کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نیّر غالب کے رشتہ دار تھے۔ غالب ان کو

اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ نیّر اپنے زمانے کے اہل علم اور اہل ثروت میں درجۂ امتیاز رکھتے تھے شعروسخن کو خوب پرکھتے تھے۔ تاریخ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ ایلیٹ صاحب نے ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں ان سے بہت مدد لی تھی۔

نیّر کے بڑے بیٹے ثاقب غالب کی بیوی کے بھتیجے تھے۔ وہ اُردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کا انتقال عین شباب میں ہوا۔

ان کے دوسرے بیٹے طالب اپنے بڑے بھائی ثاقب سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد مجروح سالک اور حالی سے اصلاح لینے لگے وہ کچھ عرصہ تک دہلی میں آنریری مجسٹریٹ رہے پھر پنجاب میں ای۔ اے۔ سی ہوگئے۔ آخر اپنے والد کے بعد اسی عہدہ سے مستعفی ہوگئے۔

ثاقب کے بیٹے شجاع الدین احمد خاں تاباں داغ کے شاگرد ہوئے۔ ان کے دو دیوان بھی ہیں۔ دہلی کے مشہور شاعر نواب سراج الدین خاں سائل جانشین داغ انہی تاباں کے صاحبزادے ہیں +

آزردہ ۱۲۰۴ تا ۱۲۸۵ھ ۱۷۸۹ تا ۱۸۶۸ء	مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ مولوی لطف اللہ کشمیری کے صاحبزادے تھے۔ آزردہ نے فیض تربیت شاہ عبدالعزیز محدث اور فضل امام سے

حاصل کیا تھا۔ وہ عہدۂ صدرالصدور کے ممتاز عہدہ پر سرفراز تھے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ نواب یوسف علی خاں والئے رام پور نواب صدیق حسن خاں صاحب رئیس بھوپال ان کے شاگرد تھے۔ سرسید بھی انہی کے شاگرد تھے۔ غالب۔ مومن۔ ذوق وغیرہ

ان کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے بعد ان کی نصف جاگیر ضبط ہو گئی تھی۔

آزردہ عربی فارسی اُردو میں خوب شعر کہتے تھے۔ اُردو میں پہلے شاہ نصیر پھر مجرم اکبر آبادی اور آخر میں میر ممنون سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے اشعار نہایت سلیس اور پُراثر ہیں۔ دیوان مرتب نہیں ہُوا۔ ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا بھی لکھا تھا۔ جواب نہیں ملتا۔ ان کی شہرت بحیثیت عالم و فاضل کے بہت ہے۔

باب ۱۳

دربار رام پور اور حیدرآباد

امیر اور داغ کا زمانہ

لکھنؤ اور دہلی کے درباروں میں مدت دراز سے شعرا کی سرپرستی اور قدردانی ہو رہی تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے ان دو سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا۔ واجد علی شاہ کلکتہ اور شہنشاہ دہلی رنگون بھیج دیئے گئے۔ دہلی اور لکھنؤ ویران ہو گئے۔ اور شعرا اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

مٹیا برج کلکتہ کے شعرا واجد علی شاہ کے دامن دولت سے بہت سے شعرا وابستہ تھے۔ ان میں سے بعض ان کے ساتھ کلکتہ چلے گئے۔ اور بعض نمک دُور ہونے کے بعد ان سے جا ملے۔ جو شعرا مٹیا برج میں جمع تھے۔ بادشاہ نے ان کو بڑے بڑے دلفریب خطابات دے رکھے تھے۔ شعرا کی گرما گرم صحبتوں نے مٹیا برج کو لکھنؤ بنا دیا تھا۔ واجد علی شاہ اپنے ہمراہی شعرا کو سبعہ سیارہ کہتے تھے۔ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق۔ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ درخشاں۔ غرض صولت۔ بہار۔ عیش۔ ہنر وغیرہ کی شاعری سے بنگال میں شعر و شاعری کا بہت چرچا ہُوا۔ چنانچہ داغ اور طباطبائی بھی کلکتہ آئے۔ وہاں کے مقامی شعرا میں مولوی عبدالغفور نساخ

ڈپٹی کلکٹر راج شاہی بہت ممتاز ہستی تھے۔ وہ نہایت عمدہ شاعر اور سخن شناس تھے۔ انکی بہت سی تصانیف بھی موجود ہیں ؛

شعرائے دہلی جب مرہٹوں کی بغاوتوں اور افغانوں کے حملوں سے دہلی کی سلطنت کا وقار کھو گیا۔ اور شعرا کی بیقدری ہونے لگی۔ تو وہاں کے شعرا تلاش روزگار میں دہلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئے چنانچہ فرخ آباد۔ فیض آباد۔ عظیم آباد۔ مرشد آباد۔ اور حیدر آباد غرض جہاں جس کے سینگ سمائے وہیں مقیم ہو گئے۔ فرخ آباد اور فیض آباد اور شہروں کی نسبت دہلی سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے پہلے سب وہیں جاتے تھے۔ فرخ آباد میں رئیس کم تھے۔ اس لئے فیض آباد کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ جب فیض آباد سے دار الخلافہ لکھنؤ میں منتقل ہوا تو سب نے ادھر رجوع کرنا شروع کیا ؛

فرخ آباد فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند بڑے شاعر اور موسیقی دان تھے۔ وہ سودا اور سوز کے شاگرد تھے۔ سودا نے ان کی مدح میں قصیدے بھی لکھے تھے۔ جب ان کے خاندان کا اقتدار جاتا رہا تو فرخ آباد میں شعر و شاعری کا چرچا بھی کم ہو گیا ؛

عظیم آباد مہاراجہ شتاب رائے اس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے۔ وہ شاعروں کے قدردان تھے۔ اور خود بھی شاعر تھے۔ ان کے بیٹے راجہ تخلص کرتے تھے۔ اور میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد تھے جو سودا کے معاصر تھے وہ ان دنوں عظیم آباد میں تھے۔ اشرف علی خاں فغاں بھی مہاراجہ موصوف کے دربار سے وابستہ تھے۔ میر باقر حزین شاگرد مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس اعظم سے متعلق تھے۔ گویا ان دنوں بہار میں شعرائے دہلی کی بہت قدر تھی ؛

مرشد آباد نوابان مرشد آباد بھی شعرائے دہلی کے بہت قدردان تھے۔ میر قدرت اللہ قدرت مرشد آباد ہی میں فوت ہوئے۔ سوز بھی وہاں گئے۔ اور محمد شاہ کے زمانے کے مشہور مرثیہ گو مرزا ظہور علی خلیق۔ نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلائے مرشد آباد گئے ؛

ٹانڈہ ٹانڈہ رام پور اور بریلی کے قریب واقعہ ہے۔ یہ جگہ نواب محمد یار خاں امیر کی قیام گاہ

تھی۔ نواب صاحب والئے رام پور کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاعر اور شاعر نواز بھی تھے۔ انہوں نے سودا اور سوز کو بلوایا۔ مگر وہ نہیں آئے۔ وہ قائم چاندپوری کو کہ سودا اور سوز کے شاگرد تھے۔ سَو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ اور خود بھی انہی کے شاگرد تھے۔ مصحفی۔ فدوی لاہوری۔ میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

حیدر آباد | شروع شروع میں شعرا اس طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ ایک تو وہ بہت دُور تھا۔ دوسرے مرہٹوں اور پنڈاریوں کی لُوٹ مار سے راستہ بہت خطرناک تھا۔ پھر بھی بہت سے باہمت شعرا وہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ شاہ نصیر کئی دفعہ وہاں گئے۔

فیض آباد اور لکھنؤ | انتخاب فیض آباد کے وجوہ:۔

(۱) دہلی سے فیض آباد اور مقامات کی نسبت زیادہ قریب ہے۔

(۲) شعرا کی قدر اور جگہوں کی نسبت وہاں زیادہ ہوتی تھی۔

(۳) شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ محمد شاہ بادشاہ کی بہت لاڈلی لے پالک بیٹی تھیں۔ وہ اپنے وطن (دہلی) کے شعرا کی بہت قدر کرتی تھیں۔ آصف الدولہ انہی مخدومہ کے بیٹے تھے۔

(۴) نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خان خاناں کی بیٹی منسوب تھیں۔ اس لئے دہلی کے ہر قسم کے آدمی کی فیض آباد میں قدر تھی۔ بلکہ مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی سخاوت کا شہرہ سُن کر آدھی دہلی فیض آباد چلی گئی تھی۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دار السلطنت لکھنؤ میں منتقل کیا تو یہ سب لوگ بھی وہاں چلے گئے۔ سودا۔ میر۔ سوز۔ ضاحک۔ مکین۔ ضیاء۔ فغاں۔ قائم۔ مصحفی۔ انشا۔ جرأت۔ رنگین اور قتیل وغیرہ سب اسی زمانہ میں لکھنؤ آئے تھے۔ مرزا جواں بخت ولی عہد شاہ عالم بھی تھوڑے دنوں لکھنؤ آ کر رہے تھے۔ مرزا جواں بخت کے چھوٹے بھائی مرزا سلیمان شکوہ بڑے احتشام سے لکھنؤ میں رہے تھے۔ اور شعرا کی حد سے زیادہ ہمت افزائی کرتے تھے۔

شعرائے لکھنؤ کا منتشر ہونا | لکھنؤ میں اُردو شاعری پر جدید ضرب پڑی کہ واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ ادھر دہلی میں بہادر شاہ کو قید کر کے رنگون روانہ کر دیا۔ لکھنؤ اور دہلی برباد ہو گئے

اور ایسا غدر پڑا کہ جان مال عزّت آبرو کچھ محفوظ نہ رہا۔ شعرائے دہلی اور لکھنؤ اپنی آرامگاہیں چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اکثر رام پور چل دیئے کہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا اور وہاں کے نواب شعرائے قدردان تھے۔ کچھ باہمّت لوگ حیدرآباد پہنچے۔ باقی قریب قریب کی ریاستوں میں چلے گئے۔ ان شعرا کی قدردانی کے لئے الور۔ جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ۔ اور ٹونک۔ بھوپال۔ منگرول۔ مالیر کوٹلہ اور بہاولپور کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

الور میں مہاراجہ شیودھان سنگھ حکمران تھے۔ اور ظہیر۔ تصویر۔ تشنہ۔ شاگردان ذوق اور مجروح۔ سالک غالب کے شاگرد اُن کے دربار میں بڑی عزّت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ظہیر اور ان کے چھوٹے بھائی جے پور میں بھی رہے۔ اور ارشد گورگانی مالیر کوٹلہ اور بہاولپور میں رہے۔

ٹونک | نواب محمّد علی خاں ۱۸۶۶ء میں معزول ہوئے اور ان کے بیٹے نواب محمّد ابراہیم علیخاں مسند حکومت پر بیٹھے ان کا تخلص خلیل تھا۔ پہلے بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی سے صلاح لیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مضطر خیرآبادی کے شاگرد ہوئے۔ ان کے دربار میں بہت سے شاعر تھے۔ جن میں ظہیر اور نواب سلیمان خاں اسد بہت مشہور ہیں۔ یہ دونو صاحب دیوان بھی ہیں اسد میر مظفر علی کے شاگرد تھے۔ ان کو نواب صاحب نے بڑے شوق سے بلایا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد اب تک وہاں ہیں۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی شاعر ہیں۔ اور اپنے والد کی طرح شاعر نواز ہیں۔

منگرول | منگرول کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے۔ مرکز اردو سے اس قدر دُور ہونے کے باوجود والیٔ ریاست نواب حسین میاں بہادر کی عنایات سے اُردو شاعری کا وہاں خوب چرچا ہوا۔ اسوقت کے مشہور شعرا داغ۔ تسلیم۔ جلال اور شمشاد (ناسخ کے شاگرد تھے اور لکھنؤ میں اُستاد مانے جاتے تھے) اکثر نواب صاحب کے دربار میں آتے جاتے رہے تھے لیکن دوری اور آب وہوا کی ناسازگاری کے باعث وہاں زمین گیر نہیں ہوتے تھے۔ پھر بھی نواب صاحب ماہانہ تنخواہ ان کے گھر بھیج دیتے تھے۔

بھوپال | ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بیحد دلچسپی لیتی تھیں۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی اور بہت سی درسگاہوں کے قیام کے لئے انھوں نے شاہانہ عطیئے عطا کئے۔ وہ مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں۔ بہت سی کتابیں انکی تصنیف ہیں۔ بہت سے مصنفین کو جو اپنی تصانیف خود شائع نہیں کر سکتے تھے۔ بیگم صاحبہ نہایت فراخدلی سے بڑی بڑی رقوم مرحمت فرماتی تھیں۔ سیرت نبوی مصنفۂ مولنا شبلی کے لئے جس کے باقی حصے مولنا سلیمان ندوی نے لکھے ہیں۔ وہ ایک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی تھیں۔ ان کی والدہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں۔ اردو میں پہلے شیریں اور بعد میں تاجور تخلص کرتی تھیں۔ اور فارسی میں شاہجہاں تخلص تھا۔ سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے نواب صدیق حسن خاں صاحب سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ نواب صاحب عربی فارسی کے بڑے عالم اور اپنے زمانہ کے مشہور محدث اور مفسر تھے۔ وہ مفتی آزردہ کے شاگرد تھے۔ اور تقریباً دو سو کتابوں کے مصنف تھے۔ شعرا اور علماء کے بہت قدردان تھے۔ اردو میں توفیق اور فارسی عربی میں نواب تخلص کرتے تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم دولت تخلص کرتے تھے۔ اور خوب شعر کہتے تھے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔ اس لئے مشہور شعرا اور علماء کا وہاں ہمیشہ اجتماع رہا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں صاحب مسند آرائے حکومت ہوتے ہیں۔ وہ بھی نہایت علم دوست اور قدرشناس ہیں +

رام پور | نواب یوسف علی خاں۔ نواب محمد سعید خاں کے بیٹے تھے۔ وہ بڑے علم دوست اور شاعر نواز تھے۔ خود بھی اردو و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں ناظم تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد غالب اور پھر منظفر علی اسیر کو کلام دکھاتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد وہاں کے بڑے بڑے شعرا رام پور ہی میں آ گئے تھے۔ مولنا فضل حق خیرآبادی۔ مرزا غالب۔ میر حسین تسکین۔ منظفر علی اسیر اور بہت سے باکمال علماء دربار رامپور سے

فیضیاب ہوگئے تھے۔

نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو یکجا کر کے ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی۔ جو نواب صاحب کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں پروان چڑھی۔

نواب کلب علی خاں
۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۴ھ
۱۸۳۴ تا ۱۸۸۶ء

نواب کلب علی خاں کے عہد میں اُردو شاعری نے بہت ترقی کی۔ نواب صاحب بڑے فیاض اور قدردان تھے۔ ان کی قدردانیوں نے رامپور میں بڑے بڑے ارباب کمال کو کھینچ لیا تھا جس کی نظیر ہندوستان کی کسی اور ریاست میں نہیں ملتی۔ علماء۔ حکما۔ فضلا۔ محدّث۔ مفسّر۔ مہندس۔ نثار۔ شعرا۔ خُوشنویس اور ہر قسم کی صناعت کے اہل کمال ان کے ہاں موجود تھے۔

شعرا میں مظفر علی اسیر۔ شیخ امداد علی بحر۔ امیر۔ داغ۔ جلال۔ تسلیم۔ منیر۔ قلق۔ عروج۔ صبا۔ حیا۔ جانصاحب۔ آغا جو شرف۔ انس شاگرد ناسخ۔ شاغل۔ شاداں۔ غنی۔ ضیا۔ خواجہ محمد شبیر۔ رضا وغیرہ کے علاوہ سینکڑوں مشاہیر اس چشمہ فیض سے سیراب ہو رہے تھے۔

مولانا ارشاد حسین۔ مولوی عبدالحق اور منشی امیر مینائی کے علاوہ کسی کی سَو سے زاید تنخواہ نہیں تھی۔ اور یہ سب لوگ محض شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ اپنی قابلیت کے مطابق کسی نہ کسی عہدہ پر مامور تھے۔ اکثر موقعوں پر نواب صاحب ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کر دیتے تھے۔ اور کبھی کسی کو بددل نہیں ہونے دیتے تھے۔

نواب کلب علی خاں نے درسیات مولینا فضل حق خیر آبادی سے پڑھیں۔ انہوں نے اکثر کتابیں تصنیف کیں تھیں۔ فارسی میں ان کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے۔ اُردو میں وہ اپنا کلام امیر مینائی کو دکھاتے تھے۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔ نوّاب تخلّص کرتے تھے۔ ان کو تحقیق لفظی کا بہت شوق تھا۔ اسی لئے ان کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور تراکیب سے پاک ہے۔

نئی طرز

ناسخ کی طرز کے علمبردار بحر۔ منیر۔ قلق اور اسیر تھے لیکن ان کے کلام میں طرز ناسخ کی

خوبیوں کی بجائے اس کے تمام عیوب پائے جاتے تھے۔ طرز دہلی کے پیرو داغ اور تسلیم تھے۔ داغ ذوق کے شاگرد تھے۔ انہوں نے نہایت دلکش طرز اختیار کی تھی۔ جس میں جرأت کے رنگ کی آمیزش تھی۔ اسوقت طرز داغ بہت مقبول تھی۔ تسلیم اگرچہ لکھنوی تھے۔ لیکن وہ نسیم اور مومن کی پیروی میں دہلی کی طرز کے پیرو تھے۔

لکھنؤ اور دہلی کے یہ دونو سکول آپس میں ہمیشہ مباحثے کرتے رہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی طرز کی بنیاد پڑ گئی۔ جس میں مندرجہ ذیل خصوصیات تھیں:۔

(۱) طرز ناسخ کی بیجا لفاظی اور تصنع نہیں تھی۔

(۲) لفظی تحقیق کی بدولت ایسے لفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار تھیں۔ متروک ہو گئیں تھیں۔

(۳) شعرا شاعری کے صحیح جذبات اور مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے تھے۔

(۴) اہل لکھنؤ نے طرز لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر طرز دہلی کی سادگی اور صفائی اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ طرز داغ اس وقت بہت مقبول تھی۔

امیر جو داغ کے مدمقابل تھے۔ ان کا دوسرا دیوان بھی داغ ہی کے رنگ میں ہے۔ اور ان کا دیوان "جوہر انتخاب" میر اور "گوہر انتخاب" درد کے رنگ میں ہے۔ امیر کے شاگرد ریاض اور جلیل۔ نے بھی داغ کا تتبع کیا۔ جلال پورے لکھنوی تھے۔ لیکن ان کا بھی ایک دیوان بالکل طرز دہلی میں ہے۔ امیر و جلال اپنے اصل رنگ کو بھولے نہیں تھے۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ طرز دہلی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس قدیم رنگ کا قطعی خاتمہ اسوقت ہوا جب "انجمن معیار" لکھنؤ میں قائم ہوئی۔ جس کے ماہواری رسالوں کی تحقیقات نے طرز قدیم کو لوگوں کے دلوں سے قطعی مٹا دیا ؛

فرمانروائے رامپور نواب سید حامد علی خاں صاحب نہایت روشن خیال اور علم دوست نواب تھے۔ اپنے اسلاف کرام کی طرح وہ علماء فضلا اور شعرا کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی فیاضی سے تمام قومی درسگاہیں اور مفید تحریکیں فیضیاب ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے جانشین نواب ...... بھی مردم شناس اور علم دوست ہیں ؛

امیر مینائی
۱۲۴۴ھ تا ۱۳۱۸ھ
۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد مینائی امیر تخلص خلف مولوی کرم محمد۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے تھے جن کا مزار لکھنؤ میں سرچشمۂ فیض عام ہے۔ انہوں نے درسی کتابیں مفتی سعد اللہ اور علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ امیر بڑے منکسر المزاج۔ عابد۔ زاہد اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ اور خاندان صابریہ چشتیہ کے جانشین حضرت امیر شاہ سے بیعت تھے۔ طب جفر۔ اور نجوم وغیرہ سے واقف تھے۔ نہایت ذکی طباع۔ محنتی۔ جفاکش اور وضع دار تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے۔ لیکن وہ بہت جلد اپنی قابلیت سے اُستاد سے آگے نکل گئے۔ اسوقت لکھنؤ کی فضا شعر و شاعری سے بھری پڑی تھی۔ ایک طرف شاگردان آتش و ناسخ کے مناظرے شروع تھے۔ جن میں صبا۔ خلیل۔ رند اور سحر وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ دوسری طرف انیس و دبیر کے معرکے گرم تھے۔ ان تمام چیزوں نے امیر کی شاعری کو بہت جلد نشو نما کر دیا۔ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ نے اپنے دربار میں بلا کر ان کا کلام سنا اور ان کو ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ جس کے صلے میں خلعت اور انعام دیا گیا۔ اسی وقت سے ان کی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

غدر کے بعد یہ تعلق منقطع ہو گیا۔ امیر نے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن عہدۂ صدر امینی کے لئے جج کو درخواست دینی پڑتی تھی۔ ان کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اس لئے ملازمت کے خیال کو ترک کر دیا۔ تھوڑے دنوں کی بیکاری کے بعد نواب یوسف علی خاں والئے رامپور نے ان کو طلب کیا۔ نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں کی حکومت ہوئی۔ انکی فیاضیوں نے ہندوستان کے تمام شعرا کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا چنانچہ یہی زمانہ امیر کی شاعری اور اقبال کا تھا۔ وہ نواب صاحب کے اُستاد تھے۔ اور ان کی بڑی بلند ادبی شخصیت سمجھی جاتی تھی تنخواہ معقول ملتی تھی۔ بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعر و شاعری میں مشغول رہتے تھے۔ انہوں نے ۴۳ برس عزت آبرو سے بسر کئے۔

۱۹۰۰ء میں نظام حیدرآباد کلکتہ سے واپسی پر بنارس میں ٹھہرے۔ یہاں امیر نے ایک قصیدہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ ان کو بہت پسند آیا۔ نواب صاحب نے ان کو حیدرآباد کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں وہ حیدرآباد گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کیا تھا۔ کہ بیمار ہو گئے۔ اور ۷۳ برس کی عمر تھی کہ انتقال فرما گئے۔ علالت کے زمانہ میں داغ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مہاراجہ سرکشن پرشاد اکثر عیادت کو آتے جاتے تھے۔ اپنے بعد انہوں نے قمر۔ آرزو۔ ضمیر۔ اختر چار بیٹے چھوڑے۔

تصانیف امیر بہت پرگو شاعر تھے۔ انہوں نے بعض کتابیں نثر میں بھی لکھی ہیں۔ ایک دیوان غدر میں تلف ہو گیا۔ پھر ۱۸۹۵ء میں آگ لگ گئی۔ اور اکثر تصانیف جل کر خاک ہو گئیں۔ ان کے دو دیوان مرآۃ الغیب اور صنم خانہ عاشقانہ رنگ میں "محامد خاتم النبیین" نعتیہ ہے۔ نیز امیر اللغات نہایت مشہور اور قابل قدر تصنیف ہے۔ افسوس کہ وہ نامکمل رہ گئی۔ اس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اس کی تصنیف نواب کلب علی خاں کے عہد میں شروع ہوئی تھی۔ ممالک متحدہ کے گورنر اس کے سرپرست تھے۔ امیر کی تصانیف کی تعداد تاریخ ادب اردو میں ۲۲ لکھی ہے۔

شاگرد ناظم۔ نواب۔ صفدر۔ جاہ۔ محسن کاکوروی۔ ثاقب۔ سرشار وغیرہ سینکڑوں شاگرد تھے۔ لیکن ان میں ریاض۔ جلیل۔ مضطر۔ اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

امیر کی شاعری پہلے دیوان مرآۃ الغیب میں ابتدائی کلام ہے۔ اس لئے اکثر بے مزہ اور بھدا ہے نیز اس میں ناسخ کی طرز کے مخصوص نقص یعنی جا و بیجا لفظی رعایت۔ بد نما اور رکیک تشبیہیں اور عورتوں کی آرائش کے سامان کا ذکر ہے۔ مضمون وہی فرسودہ ہیں۔ اور عبارت خوب رنگین ہے۔

دوسرا دیوان داغ کی طرز میں ہے۔ اس میں اعلیٰ تخیل۔ سلاست روانی اور دلکش عاشقانہ رنگ بھرا ہوا ہے۔ منشی صاحب کے نعتیہ اشعار اگرچہ طرز قدیم میں ہیں مگر فصاحت بلاغت۔ بلندی تخیل اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کو ہر قسم کے اصناف پر عبور ہے۔ حشو و زوائد

اور صنائع بدائع کی کثرت سے ان کا کلام پاک ہے۔ اشعار میں شگفتگی۔ نزاکت خیال۔ بلند پروازی۔ شیرینی۔ زور اور قادر الکلامی بدرجہ احسن موجود ہے۔ کہیں کہیں تصوّف کی چاشنی بھی ہے۔

اخلاق و عادات | منشی صاحب نہایت متین اور سنجیدہ تھے۔ راستباز۔ ہمدرد۔ متقی۔ پرہیزگار۔ سادہ مزاج اور محبّت کرنے والے صوفی مشرب بزرگ تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی۔ انکے تقدس اور علم و فضل اور کمالات شاعری کی بیحد شہرت تھی۔ نہایت منکسر مزاج تھے۔ اور اپنے تمام ہمعصروں سے نہایت خلوص سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے داغ سے کبھی مسابقت کی کوشش نہیں کی۔ ادبی مسائل کا نہایت آزادی اور بغیر پاسداری کے جواب دیتے تھے۔ منشی صاحب نے زبان کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ ان کا مرتبہ اور شعرا میں بہت بلند ہے۔

نمونہ کلام | ان کے اس شعر کو جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلہ میں لکھا تھا ؎

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو — ہر بات میں لذّت ہے اگر دل میں مزا ہو
آئے جو میری لاش پہ وہ طنز سے بولے — اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو
خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو — اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی
تجھ کو مانگوں میں تجھی سے کہ سبھی کچھ مل جائے — سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

داغ دہلوی ۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۵ء | نواب مرزا خاں نام تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں نواب ضیاء الدین خاں والئے لوہارو کے بھائی تھے۔ مرزا خاں چھ سات برس کے تھے۔ کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ میں پہنچے۔ اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان دنوں قلعہ میں شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا۔ اس ماحول سے ان کی طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ انہوں نے بھی شاعری شروع کردی

اور داغ تخلّص کیا۔ ذوق بہادر شاہ اور مرزا فخرو کے اُستاد تھے۔ یہ بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ ابتدا میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ فارسی کی تعلیم مولوی غیاث الدین مصنّف غیاث اللغات سے پائی تھی۔ خوشنویسی اور شہسواری وغیرہ بھی سیکھی تھی۔

شعر کا شوق جبلی تھا۔ اس لئے تھوڑے سے دنوں میں پختہ کار شاعر ہو گئے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو نے انتقال کیا۔ ابھی یہ ملال دل ہی پر تھا کہ غدر پڑ گیا۔ اور داغ دہلی چھوڑ کر نکل گئے۔ جب ہنگامہ غدر فرو ہوا تو رامپور پہنچے۔ اُسوقت نواب یُوسف علی خاں کا دور تھا۔ انہوں نے داغ کو داروغۂ اصطبل اور نواب کلب علی خاں ولیعہد بہادر کا مصاحب مقرر کیا۔ اس فرض کو انہوں نے نہایت قابلیّت سے انجام دیا۔ داغ نے اپنی عُمر کے ۲۴ سال نواب کلب علی خاں کی ملازمت میں نہایت عزّت آبرو اور عیش و آرام سے گذارے۔ وہ رامپور کو "آرام پور" کہا کرتے تھے۔ نواب صاحب کے ساتھ وہ حج اور زیارات کو بھی گئے۔ انہوں نے دہلی۔ لکھنؤ۔ پٹنہ اور کلکتہ کے سفر کئے۔ اور ان شہروں میں بڑی عزّت پائی۔

۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور داغ کو رامپور کو چھوڑ کر دہلی آنا پڑا۔ دہلی میں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد پہنچے۔ راستے میں جہاں کہیں ٹھہرتے تھے۔ سینکڑوں شاعر اُن کے شاگرد ہوتے تھے۔ افسوس کہ اسوقت حیدر آباد میں کوئی صُورت نہ بنی۔ اور داغ دہلی واپس آ گئے۔ تھوڑے عرصے بعد سر آسمان جاہ کی طلبی پر پھر حیدر آباد گئے۔ اب اعلیحضرت میر محبُوب علی خاں کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اور بیش قرار تنخواہ اور انعام و اکرام کے علاوہ "مقرّب السُّلطان۔ بُلبل ہندوستان جہان اُستاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ۔ فصیح الملک" کا معزّز خطاب عنایت ہُوا۔

تھوڑے دنوں بعد ساڑھے چار سو سے ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور بیش بہا صلے اور انعامات اس کے علاوہ ملا کرتے تھے۔ اس غیر معمولی اور عدیم النظیر عزّت افزائی سے اکثر لوگ حسد کرنے لگے۔ غرض داغ اٹھارہ سال حیدر آباد میں اسی

شان و شوکت سے رہے۔ جہاں حضور نظام سے لے کر ہر فرد بشر ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔

شاہ نصیر کی وفات کے بعد بازاری شاعری کا بازار سرد پڑ گیا تھا۔ وہ داغ کے دم قدم سے پھر گرم ہو گیا۔ حیدر آباد میں مشاعرے کثرت سے ہونے لگے اور سینکڑوں شعرا انکے شاگرد ہوئے۔ داغ کے عروج کی خاص وجہ یہ تھی۔ کہ وہ ریاست کی سیاسیات سے بالکل علیحدہ رہے اور کسی پارٹی میں شامل نہیں ہوئے۔ اس لئے وہ ہر ایک کو دل سے عزیز تھے۔ امیر مینائی حیدر آباد گئے۔ اور داغ کے پاس ٹھہرے مگر شومئی قسمت سے نظام کی ملاقات سے پہلے انتقال کر گئے۔

۱۹۰۵ء میں داغ نے فالج میں مبتلا ہو کر وفات پائی اور حیدر آباد ہی میں دفن ہوئے۔

عادات و اخلاق داغ نہایت خوش طبع۔ رنگین مزاج اور بذلہ سنج انسان تھے۔ مزاج میں خودداری تھی۔ اور خوشامد درآمد کو ناپسند کرتے تھے۔ کثیر الاحباب تھے۔ اور ہر دوست سے محبت سے ملتے تھے۔ اپنے معاصر شعرا سے بھی نہایت شگفتہ تعلقات تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی۔ ہاں معاصرین سے شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ حضور نظام ہمیشہ ان سے خوش رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ سیاسیات میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔

داغ کی شاعری داغ کی زبان میں سادگی اور انداز بیان میں شوخی اور بانکپن ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر۔ جلال اور تسلیم سے زیادہ مشہور ہوئے۔ انکی طرز خاص و عام کو مرغوب تھی۔ ان کے شاگرد پندرہ سو سے زاید تھے۔ شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے لئے انہوں نے ایک باقاعدہ دفتر کھول رکھا تھا جس میں تنخواہ دار منشی اور بعض شاگرد کام کرتے تھے۔

تصانیف داغ کے چار دیوان ہیں۔ ایک مثنوی فریاد داغ کے نام سے لکھی تھی۔ گلزار داغ اور آفتاب داغ میں زیادہ تر وہ غزلیں ہیں جو رامپور کے شاعروں میں امیر مینائی۔ تسلیم اور جلال وغیرہ کے مقابلہ میں لکھی گئی ہیں۔ اس زمانہ کا کلام بڑی جانفشانی اور بے انتہا مشاقی ظاہر کرتا ہے۔

مہتاب داغ اور یادگار داغ دکن کی تصنیف ہیں۔ اسوقت کے کلام میں بھی روانی اور فصاحت خوب ہے
آفتاب داغ اور گلزار داغ جوانی کی تصنیف ہیں۔ اس میں انہوں نے اپنے عشقیہ جذبات اور واردات قلبی کی بالکل اصلی تصویریں کھینچی ہیں۔ مہتاب داغ اسوقت کی تصنیف ہے۔ جب شباب رخصت ہو کر مزاج میں سنجیدگی اور سکون پیدا ہو گیا تھا۔ مثنوی فریاد داغ میں اپنے عشق کی داستان نہایت عمدہ شاعرانہ پیرائے میں بیان کی ہے۔ اس میں بعض اشعار تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔

قصائد میں داغ ذوق اور سودا سے بہت پیچھے ہیں۔ بلکہ امیر مینائی سے بھی کم ہیں۔ ان کے ہاں اعلیٰ تخیل اور بلند مضامین کی کمی ہے۔ اور تغزل کا رنگ غالب ہے۔ جو قصیدے کی شان کے خلاف ہے۔ داغ کی رُباعیاں بھی عاشقانہ رنگ ہی میں ہیں۔ البتہ تاریخیں بہت اچھی اور اُستادانہ ہیں۔

طرز کلام

(۱) **زبان**۔ داغ کی زبان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور تراکیب کہیں ڈھونڈھے سے نہیں ملتے۔ عبارت نہایت عام فہم ہوتی ہے۔ دُور از کار تشبیہوں مبالغوں اور حشو و زوائد سے ان کا کلام قطعی پاک ہے۔

(۲) **جذبات**۔ ان کے اشعار اصلی واقعات اور جذبات انسانی کا بالکل صحیح فوٹوگراف ہیں اس لئے وہ دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔

(۳) **تصنّع**۔ ان کا کلام تصنّع سے قطعی پاک ہے۔ جو بات کہتے ہیں۔ نہایت صفائی اور سادگی سے کہتے ہیں۔ کہ دلوں میں اُتر جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور درد کی صفائی ملی جلی ہے۔ اور خوبی محاورہ اور لطافت زبان اس پر طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے ان کو عاشقانہ شاعری کا مسلم الثبوت اُستاد مانا جاتا ہے۔

اعتراضات

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ داغ ارباب نشاط کے شاعر تھے۔ ان کے اشعار مخرب الاخلاق ہیں۔ لیکن انصاف شرط ہے۔ ان کے ہزاروں اشعار ایسے نکلیں گے۔ جو اعلیٰ درجہ کے کہے جاسکتے ہیں۔

بیشک ان کے ہاں فلسفہ بالکل نہیں۔ اور ان کا معشوق بھی بازاری معشوق ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اکثر اشعار عشق و عاشقی کے سطحی جذبات کے متحمل ہیں۔ اور ان کا رُوحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ان میں میر کا سا درد ہے۔ اور نہ غالب و مومن جیسی معنی آفرینی اور نازک خیالی ہے۔ ان کی تشبیہیں بھی نادر اور اعلیٰ نہیں۔ مگر بایں ہمہ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ہیں۔ انہوں نے زبان کی ایسی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ کہ جس کی ہر شخص کو قدر کرنی چاہیئے۔

داغ نے عربی فارسی کے مشکل الفاظ کو ترک کر کے سادے اور شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں موزوں کیئے۔ اور طویل اور مشکل بحروں میں نہایت برجستہ اور بے حشو و زوائد شعر نکالے۔ غرض شعرائے متاخرین میں داغ کا مرتبہ بلند ہے۔

شاگرد ان کے شاگرد پندرہ سَو سے زائد ہیں۔ جن میں حضور نظام نواب محبوب علی خاں آصف۔ سر اقبال۔ سائل دہلوی۔ بیخود دہلوی۔ آغا شاعر دہلوی۔ احسن مارہروی۔ نوح ناروی اور جگر مراد آبادی بہت مشہور ہیں۔

امیر اور داغ کا مقابلہ امیر اور داغ اپنے اپنے رنگ کے مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ دونوں اُستادوں نے ہم طرح غزلوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ دونوں کے شاگرد بکثرت تھے۔ دونوں کا حلقہ احباب وسیع تھا دونوں وسیع الاخلاق۔ حلیم الطبع ذہین اور بلند مرتبہ شاعر تھے۔ لیکن داغ دُنیاوی اقتدار میں امیر سے بہت بڑھ گئے تھے۔ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اسی وجہ سے ان کو شہرت اور مقبولیت زیادہ ہے۔

داغ کے کلام کو پڑھ کر عالم و عامی یکساں طور پر محظوظ ہوتے ہیں۔ لیکن جن کو داغ کے سطحی جذبات پسند نہیں آتے۔ وہ امیر کے کلام کو پسند کرتے ہیں کہ ان کے ہاں تہذیب و متانت کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے۔ بات یہ ہے۔ منشی صاحب ایک تقدس مآب بزرگ تھے۔ اور داغ نے دہلی کے قلعہ کے رنگین ماحول میں پرورش پائی تھی۔ پھر بھی داغ کے مقابلے اور دربار رام پور کے مزاج نے ایک حد تک ان کا پرانا رنگ زائل کر دیا تھا۔ منشی صاحب کا اوائل عمر کا جسقدر کلام ہے

وہ ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جب منشی صاحب نے دیکھا کہ لوگوں کو داغ کا رنگ مقبول ہے۔ تو انہوں نے بھی وہی رنگ اختیار کر لیا۔ اس سے ان کے کلام میں صفائی اور روانی پیدا ہو گئی۔ مگر پھر بھی داغ سے بہت کم رہے۔

داغ کا رنگ اگرچہ ولی کا رنگ تھا۔ لیکن انہوں نے خود اس میں بہت سی جدّتیں پیدا کی تھیں۔ یعنی انہوں نے جرأت کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان کے ساتھ سمو دیا تھا اور اسی سے اپنی خاص طرز پیدا کر لی تھی۔ جو خاص و عام کو مرغوب تھی۔ اسی طرز میں اگر کچھ کمی ہے۔ تو یہی کہ خیالات بہت سطحی ہیں۔

حقیقت میں حقیقی شعریت دونو اُستادوں کے ہاں بہت کم ہے۔ شکوہ الفاظ متانت و زبان کی پختگی کی وجہ سے امیر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے۔ قصیدہ گوئی میں بھی وہ داغ سے بہت آگے ہیں۔ عروض اور ضروریات شعری کو پوری طرح جانتے ہیں۔ منشی صاحب شاعر کے علاوہ نثار بھی تھے مصنف تاریخ ادب اُردو نے ان کو سودا اور ذوق کا ہم پلہ لکھا ہے۔ لیکن قصیدے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ امیر ان دونو بزرگوں سے بہت پیچھے ہیں۔

امیر اور داغ میں ایک فرق یہ بھی ہے۔ کہ امیر کی شاعری تو ہمیشہ ترقی کرتی رہی۔ لیکن داغ کا رنگ آخر عُمر میں کچھ ہلکا پڑ گیا۔ یہ شاید اس لئے کہ وہ حیدر آباد پہنچ کر عیش و آرام کے عادی ہو گئے تھے گویا قیام رامپور کا زمانہ داغ کی شاعری کے معراج کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ داغ امیر کی طرح علم عروض کے اُستاد نہیں تھے۔ ہاں وہ عدیم المثال غزل گو اور اپنی خاص طرز کے موجد تھے ؎

اِنتخاب کلام

وعدے پہ مری ان کی قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے اُدھر آج

لُطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم ۔۔۔ بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

جلال لکھنوی
۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء تا ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء

حکیم سیّد ضامن علی جلال۔ حکیم سیّد اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں آصف الدولہ کے مدرسے میں فارسی عربی پڑھے۔ پھر حکمت کی تکمیل کی۔ لیکن شعر و شاعری کا ایسا شوق ہوا کہ اس کو اپنا مستقل فن قرار دیا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلال سے اصلاح لیتے تھے۔ پختہ مشق ہونے کے بعد انہی کے توسط سے ان کے اُستاد رشک کے شاگرد ہوئے۔ رشک ناسخ کے بہت ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ ناسخ اپنے شاگردوں کی غزلیں انہی کو اصلاح کے لئے دے دیا کرتے تھے۔ رشک نے عراق جاتے وقت جلال کو نواب فتح الدولہ برق کے سپرد کیا۔ برق کی شاعری ان دنوں بہت زوروں پر تھی۔ روزانہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اور بحر۔ سحر۔ اسیر۔ امیر۔ قلق وغیرہ طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ ان پُرلطف صحبتوں کو ۵۷ء کے غدر نے درہم برہم کر دیا۔ گذر اوقات کے لئے جلال نے ایک دواخانہ کھول لیا تھا لیکن شوق شاعری کو پھر بھی پس پُشت نہیں ڈالا۔ رامپور میں ان دنوں نواب یوسف علی خاں حکمران تھے۔ اور جلال کے والد وہاں داستان گوئی پر ملازم تھے۔ آخر نواب صاحب کی قدردانیوں نے جلال کو بھی رامپور کھینچ بلایا۔ تھوڑے دنوں بعد نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ انہوں نے جلال کو سّو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ جلال بہت تنک مزاج اور نازک دماغ تھے۔ وہ کئی بار ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ لیکن نواب صاحب کی قدردانیوں نے کبھی ان کو رامپور سے باہر نہ جانے دیا۔ وہ تقریباً بیس سال رامپور میں رہے۔ داغ۔ تسلیم۔ اور امیر مینائی ان کے ہمعصر تھے۔ یہ لوگ برابر مشاعروں میں شریک ہوتے اور ہم طرح غزلیں لکھتے تھے نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد کونسل آف ریجنسی قائم ہو گئی۔ اور یہ صحبتیں منتشر ہو گئیں۔ منگرول (کاٹھیاوار) کے رئیس نواب حسین میاں صاحب شعرا کے بہت قدردان تھے۔ انہوں نے حکیم صاحب کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا۔ آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث حکیم صاحب لکھنؤ واپس گئے۔ لیکن نواب صاحب بدستور پچیس روپے ماہوار اور سّو روپیہ ہر مہینے قصیدے کا

صلہ حکیم صاحب کو گھر بیٹھے بھیجتے رہے۔ حکیم صاحب آخر عمر تک شعر و شاعری کرتے رہے۔ آخر ۷۶ سال کی عمر میں ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا۔

تصانیف (۱) چار دیوان (۲) سرمایہ زبان اُردو یعنی محاورات و اصطلاحات اُردو (۳) افادۂ تاریخ یعنی فن تاریخ گوئی پر ایک رسالہ (۴) منتخب القواعد یعنی ہندی الفاظ کی تحقیق (۵) تنقیح اللغات اور گلشن فیض یعنی اُردو کے ذولغات (۶) رسالہ دستور الفصحا یعنی فن عروض پر ایک رسالہ (۷) مفید الشعرا یعنی تذکیر و تانیث کی تحقیق۔

مندرجہ بالا تصانیف سے جلال کی خدمات زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ یہ کتابیں ابتدائی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن بعد کی نسل نے ان سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔

مزاج جلال مغرور متکبّر اور ہمچو من دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ غُرورِ سخن ان کو مشاعرؤں میں شرکت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ برابر کے شعرا سے ملنا عار سمجھتے تھے۔ کسی کے اشعار کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے۔ بچپن سے حجّت و تکرار کی عادت تھی۔ اساتذۂ وقت کی غلطیاں ان کے مُنہ پر نکالتے تھے۔ اس لئے معاصرین سے مناظرے اور مباحثے ہمیشہ جاری رہتے تھے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے بہت محبّت سے پیش آتے تھے۔ اور بڑی محنت سے اصلاح دیتے تھے۔ تسلیم کے شاگرد ظہیر۔ احسن نیموی نے جلال کی بے شمار غلطیاں نکالی ہیں۔ اور سینکڑوں اعتراض کئے ہیں اور ان سب کو دو کتابوں کی صورت میں چھپوا دیا ہے۔

خصوصیاتِ کلام جلال طرز لکھنؤ کے آخری چراغ تھے۔ وہ ہمیشہ اسی طرز پر قانع رہے۔ ان کے متعدد دیوانوں میں کوئی دلآویزی اور خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ ہاں زبان بے تصنّع اور بے عیب ہے۔ پھڑکتے ہوئے اشعار بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔ عام طور پر کلام پھیکا ہے۔ جذبات کی تصویریں کہیں نہیں۔ خیال آفرینی بہت کم ہے۔ بعض اشعار استادی کے درجہ سے گرے ہوئے ہیں۔ عورتوں کی آرایش کے سامان کا بیان طرز لکھنؤ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ لیکن یہ بات ان کے ہاں نہیں۔ صحت الفاظ اور محاورے کا ان کو بہت خیال ہے۔ تعقید اور نامناسب الفاظ سے

ان کا کلام پاک ہے۔ وہ بہت پُرگو شاعر ہیں۔ شاید اسی لئے کلام پھیکا ہے۔ مشہور ہے کہ پچیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلیں کہنا ان کا معمول تھا۔ وہ صحت الفاظ و صفائی محاورہ کا اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتے تھے۔ حق یہ ہے کہ وہ بہت اچھے ناقد تھے۔ دوسرے درجے کے شعرا میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

شاگرد ان کے شاگردوں میں ان کے بیٹے کمال جو رام پور میں ملازم تھے۔ میرزا ذاکر حسین یاس اور ان کے صاحبزادے آرزو۔ احسان شاہجہان پوری اور سردار اودھم سنگھ مشہور ہیں۔

آرزو لکھنوی سید انوار حسین صاحب آرزو۔ سید ذاکر حسین یاس کے بیٹے تھے۔ اور باپ بیٹے دونو جلال کے شاگرد تھے۔ آرزو پہلے امید تخلص کرتے تھے۔ وہ لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں سے ہیں۔ کمال کے بعد آرزو ہی جلال کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ فن عروض کے پورے ماہر اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں۔ انہوں نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ اور ڈرامہ نویسی کا بھی شوق ہے۔ اگرچہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ لیکن طرز دلّی والوں کی ہے۔ کلام میں سادگی روانی حلاوت اور جذبات وغیرہ موجود ہیں۔ ان کا کلام اپنے استاد جلال کے رنگ کا اچھا نمونہ ہے۔

احسان احسان علی خاں احسان قاسم علی خاں کے صاحبزادے ہیں۔ وہ اونہ ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے والد ان کو شاہجہان پور لے گئے۔ اسی لئے شاہجہانپوری کہلاتے ہیں۔ سولہ برس کی عمر سے شعر کہتے تھے۔ ابتدا میں حافظ نثار احمد خاں تائب کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں جلال کے شاگرد ہوئے۔ محکمہ بندوبست میں ملازم تھے۔ بعد میں قانونگوئی منصرمی اور پیشکاری بھی کی۔ ۱۸۹۰ء میں ملازمت چھوڑ کر شاہجہانپور میں مختار عدالت ہو گئے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے گلدستہ ارمغان کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ جو کچھ مدت بعد بند ہو گیا۔ خمکدۂ خیال یعنی ان کا دیوان اور مختلف کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ وہ ایک خوشگو شاعر ہیں۔ لیکن کوئی خصوصیت ان کے کلام میں نہیں۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ وہ ۱۸۹۱ء میں منگرول اور پھر حیدرآباد بھی گئے تھے۔

تسلیم ۱۸۲۰ء تا ۱۹۱۱ء	منشی امیر اللہ تسلیم منگلسی نام گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جو فیض آباد کے نزدیک ہے۔ ان کے والد مولوی عبد الصمد نے فیض آباد ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ وہ محمد علی شاہ

کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ اور فوج میں تیس۳۰ روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے۔ جب باپ نوکری سے علیحدہ ہوئے تو تسلیم ان کی جگہ فائز ہو گئے۔ تسلیم نے عربی فارسی اپنے والد اور مولوی سلامت اللہ رامپوری سے پڑھی تھی۔ وہ شاعری میں نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور طرز دہلی کا بڑے فخر سے تتبع کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں ؎

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

جب سلطنت کا خاتمہ ہوا تو تسلیم رامپور چلے گئے۔ کچھ عرصہ تک وہاں ملازمت کا موقعہ نہ ملا۔ غدر ختم ہونے کے بعد وہ پھر لکھنؤ آ گئے۔ اور مطبع منشی نولکشور میں بیس روپیہ ماہوار پر صحوں میں ملازم ہو گئے۔ وہ خوشنویس بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں ان سے اصلاح لیتے تھے۔ اور دس روپے ماہوار دیتے تھے۔

۱۸۷۵ء میں نواب کلب علی خاں رام پور کے نواب ہوئے۔ انہوں نے تسلیم کو بلا لیا تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ جو بعد میں پچاس تک ہو گئی۔ تسلیم عہدۂ نظارت اور پیشکاری سے ترقی کرتے کرتے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ ٹونک اور منگرول پہنچے۔ لیکن کچھ مدت بعد نواب حامد علی خاں والئے رام پور نے ان کو پھر بلا لیا اور چالیس روپے ماہوار ان کی پنشن مقرر کر دی۔ جو ان کو مرتے دم تک ملتی رہی آخر تسلیم نے اکانوے برس کی عمر میں انتقال کیا۔

تصانیف	ان کا پہلا دیوان غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ تین دیوان چھپ چکے ہیں۔ چوتھا نامکمل

کسی شاگرد کے پاس ہے۔ انہوں نے آٹھ مثنویاں کہیں اور نواب صاحب رامپور کا سفرنامہ یورپ تقریباً پچیس ہزار اشعار میں لکھا۔

انداز کلام	کلام نہایت سلیس بے تکلف اور زوردار ہے۔ تمام اصناف سخن میں مثنوی کہنے میں ان کو

اپنے ہمعصروں پر فائق ہیں۔ ان کے بعض قصیدے بھی بہت زور دار ہیں۔ غزلیں اکثر پُر معنی اور پُر لطف ہیں۔ ان کا پہلا دیوان نظم ارجمند ان کے اور دیوانوں سے بہتر ہے۔ پُر گوئی نے ان کے کلام کو پھیکا کر دیا ہے۔

تسلیم کی شہرت کے تین وجوہ۔ (۱) اُستادانہ غزلیں اور مثنویاں (۲) مومن کا کامیاب تتبع (۳) موجودہ دَور کے قابل فخر شاعر حسرت موہانی کے اُستاد۔

عام حالات تسلیم نے طویل عمر پائی تھی۔ جو مصائب و آلام کے لئے شروع سے آخر تک وقف رہی۔ تنگدستی نے اکثر فقر و فاقہ کی نوبت پہنچائی۔ لیکن قابل شاگردوں اور قدردان دوستوں نے ہمیشہ مدد کی۔ لُطف یہ ہے ان مصیبتوں نے نہ ان کے مزاج پر کوئی بُرا اثر ڈالا۔ اور نہ رشک و حسد کے جذبات کو مشتعل کیا۔ وہ نہایت ملنسار اور قانع رہے۔ اور اپنے ساتھ اُردو شاعری کے قدیمی رنگ کا خاتمہ کر گئے۔

شاگرد ان کے شاگرد بکثرت ہیں۔ لیکن حسرت موہانی۔ عرش گیاوی۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب معروف بہ بُلبل تسلیم بہت ممتاز ہیں۔

نمونۂ کلام

آبرو گر چاہتا ہے کُنج خلوت کر قبول ۔۔۔ قطرۂ نیساں صدف میں آکے گوہر ہو گیا

کچھ کہہ جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے ۔۔۔ توڑو نہ آسرا دلِ اُمیدوار کا

پسنا ستم چرخ سے اُف منہ سے نہ کرنا ۔۔۔ یہ بات مرے دل میں ہے یا برگ حنا میں

کعبے کا ارادہ کئے نکلے تو ہیں گھر سے ۔۔۔ آجائے وہ بُت سامنے اسدم تو مزہ ہو

عرش گیاوی ضمیر الدین عرش منشی بندہ علی وکیل گیا کے بیٹے ہیں۔ شروع میں اکثر اخبارات و رسائل سے تعلق تھا۔ پھر ریلوے کی ملازمت کر لی۔ پہلے شمشاد شاگرد ناسخ کے شاگرد تھے۔ پھر تسلیم کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ان کی اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلا دیوان داغ کے رنگ میں لکھا جو طبع نہیں ہُوا۔ دُوسرا دیوان تسلیم کے رنگ میں کہا۔ اور انہی سے اصلاح لی۔ تیسرا دیوان بھی ہے۔ دُو رسالے فن عروض پر اور ایک تاریخ دہلی و آگرہ "بارگاہ سلطانی" کے

نام سے لکھی ہے۔ انہوں نے کچھ مدت بہار ترنج کی ایڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔ اور اسی رنگ کے لئے مشہور ہیں۔

دربار حیدرآباد

حیدرآباد دکن ہمیشہ علوم وفنون اور شاعری کا مرکز رہا ہے۔ وہاں کے فرمانرواؤں اور رئیسوں کی سخاوت کا شہرہ سن کر ہمیشہ ہر علم و فن کے اہل کمال وہاں جمع ہوتے رہے ہیں۔ حق یہ ہے۔ کہ ہند اور بیرون ہند کے ارباب کمال کی وہاں بڑی قدردانیاں ہوئیں۔ اور خاص کر شاعری کو ہمیشہ وہاں اس لئے عروج رہا۔ کہ وہاں کے اکثر فرمانروا خود بھی شاعر تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اول
۱۶۷۱ء تا ۱۷۴۸ء

یہ بانیٔ خاندان ہیں۔ ان کا نام میر قمرالدین خاں تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ دو دیوان ان کی یادگار ہیں۔ شاکر تخلص تھا۔ اور عبدالقادر بیدل کے شاگرد تھے۔ کلام میں تصوف کا رنگ غالب تھا۔ مشہور ہے کئی زبانوں میں نظم ونثر لکھنے پر قادر تھے۔ لیکن کلام دستیاب نہیں ہوا۔

میر محبوب علی خاں
۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء
۱۲۸۶ھ تا ۱۳۳۰ھ

نواب محبوب علی خاں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ کم تین برس کی عمر میں مسند ریاست پر بیٹھے۔ ان کی تعلیم مختلف استادوں کے سپرد ہوئی۔ اور فارسی عربی۔ انگریزی پر ان کو پورا عبور تھا۔ شہسواری اور سپہ گری میں طاق تھے۔ ان کی قدردانی علوم وفنون کی وجہ سے سینکڑوں اہل کمال حیدرآباد میں جمع ہوئے۔

نواب صاحب اہل علم کی بہت قدر کرتے تھے۔ اور ان کی ہمت بڑھاتے تھے۔ مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ کا پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور زر کثیر فرہنگ کی طباعت اور اشاعت کے لئے عنایت فرمایا تھا۔ مولوی سید علی بلگرامی سے تمدن عرب اور تاریخ دکن وغیرہ لکھوائی تھی۔ مولٰنا شبلی۔ حالی۔ مولوی عبدالحق مصنف تفسیر حقانی۔ قدر بلگرامی پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولٰنا عبدالحلیم شرر۔ پروفیسر شہباز وغیرہ سینکڑوں ارباب علم نے ان کی

سرپرستی کی بدولت اپنی زندگی آرام سے بسر کی۔ داغ ان کی سرکار سے پندرہ سو ۱۵۰۰ تنخواہ پاتے تھے اور خلعت و انعام الگ ملتے تھے۔ امیر مینائی رسائی ہونے سے پہلے انتقال کر گئے۔ مگر ان کے صاحبزادے اختر مینائی اور ان کے شاگرد جلیل اب تک درباری شاعر ہیں بلکہ جلیل تو حضور نظام کے اُستاد بھی ہیں۔

میر محبوب علی خاں آصف تخلّص فرماتے تھے۔ اور اپنے اُستاد داغ کی طرز میں کہتے تھے۔ انکے ہاں حُسن الفاظ کے ساتھ حسن معنی بھی بہت کچھ جلوہ گر ہے۔ کلام نہایت فصیح بامحاورہ اور پُرلطف ہے

میر عثمان علی خاں موجودہ فرمانروائے دکن آپ عثمان تخلّص کرتے ہیں۔ شعر و شاعری میں اپنے والد کے پیرو ہیں۔ اہل سخن کے قدردان ہونے کے علاوہ بہت بڑے ناقد ہیں۔ آپ کے دربار میں نہایت بلند مرتبہ شاعر جمع رہتے ہیں۔ آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ قائم کر کے اُردو زبان پر بیحد احسان کیا ہے۔

حضرت جلیل کے شاگرد ہیں۔ ایک دیوان چھپ چکا ہے۔ کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہے۔ اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ کبھی کبھی عربی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔

مہاراجہ چندو لال ۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۵ء مہاراجہ صاحب قوم کے کھتری تھے۔ اور شاداں تخلّص کرتے تھے۔ اور شعرا کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ مدّت تک ریاست کے وزیر اعظم رہے۔ انکی فیاضیوں اور قدردانیوں سے ایران اور ہندوستان کے اکثر اہل کمال شاعر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مشہور ہے اس زمانہ میں تین سو سے زیادہ شاعر دکن میں جمع تھے۔ جن کی سَو سے ہزار تک تنخواہیں تھیں۔ ان کے محل میں ہر رات مشاعرہ ہُوا کرتا تھا۔ شاہ نصیر نے بھی اس دربار سے بیش بہا انعامات لئے تھے۔ مہاراجہ موصوف نے ذوق اور ناسخ کو بھی دعوت دی تھی لیکن حُبّ وطن نے ان کا دامن دل نہ چھوڑا۔ مہاراجہ صاحب کے اُردو فارسی کے دیوان ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سوانح عمری بھی کتاب کی صورت میں لکھے ہیں۔

راجہ گرداری پرشاد
۱۸۴۰ء تا ۱۹۱۰ء

باقی تخلص کرتے تھے۔ اور محبوب نواز راجہ بنسی دھر کے نام سے مشہور تھے۔ قوم کے سکسینہ کایستھ تھے۔ فارسی سنسکرت اور عربی کے عالم تھے۔ انہیں شعر و شاعری اور شعرا کی سرپرستی کا بہت شوق تھا۔ جب داغ حیدرآباد پہنچے تو انہوں نے انکی بہت مدد اور قدر کی۔ اکثر کتابیں انکی تصنیف ہیں۔ انہوں نے بھگوت گیتا کو بھی فارسی میں نظم کیا تھا۔

ان کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ وہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے فلسفہ اور مذہب سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ ان کی رباعیات بہت دلچسپ اور مؤثر ہیں۔ جن سے انکی علمی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شمس الدین فیض ان کے مشہور شاگرد تھے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد

آپ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ آجکل حیدرآباد کے وزیر اعظم ہیں۔ اور نہایت ممتاز شاعر اور زبردست عالم ہیں۔ شاد تخلص کرتے ہیں سلسلہ نسل دہلی کے ایک نہایت قدیمی معزز خاندان سے ملتا ہے۔ ان کے دادا مہاراجہ نرندر پرشاد۔ نواب محبوب علی خاں کے ایام طفولیت میں کونسل آف ریجنسی کے رکن تھے۔ مہاراجہ چندولال بھی اسی خاندان سے تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے عربی فارسی کی تعلیم بڑے قابل اُستادوں سے پائی ہے۔ انگریزی تلنگی۔ مرہٹی میں بھی خوب مشق رکھتے ہیں۔ شاعری میں حضور نظام نواب علی خاں کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے ان کو شاگرد خاص کا لقب دیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں ان کو عہدۂ وزارت اور راجۂ راجگان مہاراجہ بہادر کا خاندانی خطاب عنایت ہوا ۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۰ء میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور جی۔ سی۔ آئی۔ ای کے معزز خطابات سے سرفراز ہوئے ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے دست بردار ہو گئے۔ مگر تھوڑے عرصے بعد پھر یہی عہدہ آپ کے سپرد ہو گیا۔

آپ دبدبۂ آصفیہ اور محبوب الکلام کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ مہاراجہ صاحب کا کلام تصوف سے لبریز ہوتا ہے۔ اور وہ خود بھی ایک نہایت صاف دل صوفی ہیں۔ تعصبات سے ان کا دل قطعی پاک ہے۔ ان کے دیوان اُردو اور فارسی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک دیوان مخض نعتیہ ہے جس سے ان کے حقیقی جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ مہاراجہ چندولال کی طرح خوب فیاض ہیں۔ تقریباً ہم تصانیف

آپ کی موجود ہیں ۔

طرزِ کلام کلام نہایت دلچسپ اور بے تکلّف ہوتا ہے ۔ فارسی عربی اشعار کا اُردو اشعار میں ترجمہ اور تضمین بھی بہت خوب کرتے ہیں ۔ اکثر تصوّف کا رنگ غالب رہتا ہے اور کلام حسن صوری و معنوی سے مزیّن ہوتا ہے ۔

انجمن ترقّی اُردو یہ مشہور و معروف انجمن تقریباً سولہ سترہ برس سے حیدر آباد میں قائم ہے ۔ شروع سے مولوی عبدالحق صاحب بی ۔ اے اس کے سکرٹری ہیں ۔ وہ نہایت تن دہی اور جانفشانی سے اس کی نگرانی کرتے ہیں ۔ حضور نظام کی سرپرستی کی بدولت یہ انجمن زبان اُردو کی نہایت شاندار خدمات انجام دے رہی ہے ۔ ہر علم و فن کی قدیم جدید کتابیں ترجمہ ہو کر اس انجمن کے اہتمام میں شائع ہو رہی ہیں ۔ اُردو رسم الخط کی اصلاح اور ترقّی کے لئے بھی قابل اور تجربہ کار حضرات کی سب کمیٹیاں بنائی گئی ہیں ۔ انجمن ایک نہایت موقر سہ ماہی "رسالہ اردو" نکالتی ہے ۔ جس کے ایڈیٹر مولوی عبدالحق صاحب ہیں ۔ اس میں نہایت کارآمد مضامین شائع کئے جاتے ہیں ۔ انجمن نے ایک اور رسالہ سائنس بھی جاری کیا ہے ۔ جس میں محض سائنس کے متعلّق مفید مضامین ہوتے ہیں ۔

عثمانیہ یُونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی حضور نظام نے ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کو قائم کی تھی ۔ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کی تعلیم اُردو میں ہوتی ہے ۔ انگریزی بطور ثانوی زبان کے لازمی مضمون ہے ۔ تاکہ طلبا انگریزی بولنے والی دُنیا سے بھی بے خبر نہ رہیں ۔ یہ یُونیورسٹی ہندوستان میں اپنی وضع کی پہلی یونیورسٹی ہے ۔ یونیورسٹی دن بدن ترقّی کر رہی ہے ۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی اس کی حیثیت کو تسلیم کر لیا ہے ۔ گویا وہاں ڈگریوں کو وہی رُتبہ حاصل ہے ۔ جو ہندوستان کی دوسری منظور شدہ یُونیورسٹی کی ڈگریوں کو ہے ۔

دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے درسی کتابیں تصنیف کرنے کے واسطے دارالترجمہ قائم ہے یہ ادارہ یُونیورسٹی کی نگرانی میں بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے ۔ بہت قلیل مدّت میں اس ادارہ نے وہ تمام کتابیں اُردو میں تبدیل کر دی ہیں ۔ جو ایف ۔ اے اور بی ۔ اے کی جماعتوں

کے لئے درکار تھیں۔ اس میں نہایت قابل مترجم اور مصنف قابل تحسین کام کر رہے ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کی آسانی کے لئے اصطلاحات کی لغت بھی بہت محنت سے تیار کرائی ہے۔

دارالترجمہ یونیورسٹی کے کورس تیار کرنے کے علاوہ تاریخ۔ فلسفہ۔ اقتصادیات۔ ریاضی۔ طبیعیات۔ کیمیا اور قانون کی کتب کی تصنیف اور ترجمے کرتا ہے۔ فن تعلیم طب اور انجینری کی کتابیں بھی ضرورت کے وقت ترجمہ ہونگی۔

ظاہر ہے کہ دارالترجمہ زبان اُردو کی توسیع اور اشاعت کے لئے کس قدر مفید ادارہ ہے +

باب ۱۴

جدید اُردو شاعری

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرز جدید کے پیشرو قدیم زمانہ کے مرثیہ نویسوں نے موجودہ طرز جدید کے لئے ایک شارع عام طیار کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ یہی نیچرل شاعری ان کے ہاں بطور فرع کے تھی۔ اس لئے وہ اپنی طرف لوگوں کو متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے ایک نئی چیز کچھ آسانی سے مقبول نہیں ہوتی۔ پھر بڑے بڑے ضعفا اور قدامت پرست بزرگوں کے سامنے ایک بدعت کا پھولنا پھلنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔

نظیر اکبر آبادی سب سے پہلے شاعر ہیں۔ جنہوں نے مناظر قدرت واقعات اور جذبات کے سچے فوٹو کھینچے۔ ایک مضمون کو اصلی رنگ میں ادا کرنے کے لئے انہوں نے کسی قدیم بندش اور قواعد کی پرواہ نہیں کی۔ لیکن لوگوں نے ان کے اس رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ آخر اس پرانے رنگ کے بدلنے کے لئے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی۔ جو خداوند تعالیٰ نے

آزاد اور حالی کی زبردست شخصیتوں میں امانت رکھی تھی ۔

انقلاب کا اثر غدر نے لکھنؤ اور دہلی کی سلطنتیں مٹا دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا منتشر ہو گئے۔ جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں باقی رہیں۔ ان کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا۔ کہ شعرا کی سرپرستی کر سکتیں اس انقلاب نے لوگوں کے مذاق کو تبدیل کر دیا۔ لوگ نظم کی نسبت نثر کو پسند کرنے لگے۔ ریاستوں اور سلطنتوں کی تباہی نے عیش و عشرت کی انجمنیں سرد کر دیں۔ اور اب مادہ پرستی اور کاروبار کا زمانہ آ گیا۔ لوگوں کی آنکھیں خواب غفلت سے کھل گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا کے مزاج میں بھی گونہ تبدیلی ہو گئی ۔

انگریزی تعلیم کا اثر انگریزی تعلیم نے اردو نظم و نثر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس انقلاب کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ انگریزی میں ڈرامہ نظم نثر اور ہر قسم کے اصناف موجود ہیں۔ اسوقت کے لوگ زبان انگریزی سے بہت کم واقف تھے۔ لیکن ان کی دور بین نگاہوں نے محض ان چند تراجم سے جو انگریزی کے ایجاد ہوئے تھے۔ اس بات کا پتہ لگا لیا کہ ہماری زبان انگریزی زبان سے بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان کو اردو کی خامیاں اور خرابیاں دور کر کے جدتیں پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ اصلاح بہت آہستہ آہستہ عمل میں آئی۔ کیونکہ یہ کام ایک دن کا کام نہیں تھا۔ آفرین ہے ہمارے رہنماؤں پر کہ انہوں نے اپنے قدیم شعرا کے احترام میں پھر بھی فرق نہیں آنے دیا۔ اس دعویٰ کی دلیل میں سکسینا بابو نے "یادگار غالب" اور "دیوان ذوق مرتبہ آزاد" پیش کئے ہیں اور لکھا ہے۔ کہ وہ جدید رنگ کی تلقین کرنے کے باوجود قدامت پرست رہے کیونکہ ان کا مقصد اعلیٰ اردو ادب کا دائرہ وسیع کرنا اور اس کی خرابیاں دور کرنا تھا ۔

جدید رنگ کی خصوصیتیں

(۱) نئے نیچرل مضامین تاریخی۔ اخلاقی۔ سیاسی۔ موسمی۔ رزمی بزمی وغیرہ وغیرہ۔

(۲) چونکہ غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لئے تنگ تھا اس لئے مثنوی و مسدس کا استعمال زیادہ مرغوب سمجھا گیا۔ کہ اس میں قافیوں پر قابو ہوتا ہے۔

(۳) تصنع اور تکلف والے مضامین کو ترک کر دیا گیا ۔

(۴) رُباعی اور قطعات کو پسند کیا گیا کہ اس میں ہر قسم کا مضمون ادا ہو سکتا ہے۔

(۵) غزلوں کے پُرانے عشق و عاشقی کے مضامین جن میں زُلف و کاکل کا ذکر ہوتا تھا معیوب سمجھے جانے لگے۔ اور ان کی جگہ جذبات حقیقی اور واقعات اصلی کو دی گئی۔

اصناف سخن میں جدّتیں انگریزی بے قافیہ نظمیں دیکھ کر اُردو میں بھی بے قافیہ نظمیں لکھی گئیں۔ لیکن یہ طرز مقبول نہیں ہوئی۔ ابتداءً مولوی علی حیدر طباطبائی۔ مولانا شرر۔ مولانا آزاد اور محسن کاکوروی نے اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھیں۔ اور اب بھی بہت لوگ لکھتے ہیں۔ لیکن یہ طرز اُردو سے کچھ میل نہیں کھاتی اس لئے مقبول بھی نہیں ہوتی۔

مولوی عظمت اللہ نے ہندی دوہروں کی پیروی میں اُردو دوہرے لکھنے شروع کئے ان میں الفاظ اور مضامین بھی ہندی ہوتے ہیں۔ اور خوب لطف دیتے ہیں۔ مولانا حالی نے مسدّس کو مسدّس حالی لکھ کر اس قدر مقبول بنایا کہ اب ہر قسم کی نظمیں اسی صُورت میں لکھی جاتی ہیں۔ کیونکہ اسکی بحریں نہایت زوردار اور خوش آیند ہوتی ہیں۔ اور سلسلۂ بیان کو چار مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا دلچسپ اور مترنم بنا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مبالغہ آمیز باتیں ترک کر دی گئیں اور صفائی واقعیت اور سادگی کو شعر کی جان سمجھنے لگے۔

جدید رنگ کے اثرات انگریزی تعلیم نے نظم اُردو کی اس افسردگی کو دُور کر دیا۔ جو فرسودگی اور قدامت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی بدولت نظم نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا۔ نثر میں جدید فن تنقید اور ڈراما شامل ہونے سے اُردو زبان کا دائرہ بے انتہا وسیع ہو گیا۔ گویا لوگوں کا مطمع نظر وسیع ہوا۔ قدامت کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ اس سے نقصان یہ پہنچا کہ مقررہ قواعد عروض کی پابندیاں بھی اُٹھ گئیں۔ لیکن مقابلتاً فوائد نقصان سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے ہم کو ان باتوں کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔

جدید ادب اُردو کے تین طبقے

پہلا طبقہ پہلا طبقہ قدامت پسند لوگوں کا ہے۔ یہ قدیم طرز کو پسند کرتے ہیں اور طرز جدید سے متنفر ہیں۔ گویا قدما کے نقال ہیں پُرانے مضامین

بحریں اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ شعر اس لئے کہتے ہیں۔ کہ شاعری دلیل قابلیت ہے
ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ اور نہ یہ کوئی مفید خدمت زبان انجام دے سکتے
ہیں۔ ہاں یہ کہنا بیجا نہیں۔ کہ ان کے وجود سے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے ؛

دُوسرا طبقہ یہ طبقہ اوّل کی ضد ہے۔ اس کے پیرو اپنے مُلک کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے
ہیں۔ اور ہر مغربی چیز کے عاشق ہیں۔ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ مغربیت کہاں تک مشرقیت
میں سما سکتی ہے۔ نقالی ان کا اصول ہے۔ ایسے لوگوں نے بے انتہا ترجمے کر ڈالے ہیں۔ جو
غلط اور غیر معتبر ہیں۔ کیونکہ ان میں بہت سے ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اصلیّت باقی
نہیں رہتی۔ اور وہ ترجمے کرنے میں کسی اُصول کو بھی مدِ نظر نہیں رکھتے۔ اِس لئے ایک ناتکمّل
اور ناقص زبان پیدا ہو گئی ہے جس کا انداز بیان بالکل غیر مستقل ہے۔ اور حُسن الفاظ سلاست
روانی اور انداز بیان کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ؛

تیسرا طبقہ یہ طبقہ ان اعتدال پسندوں کا ہے۔ جو قدیم و جدید دونو طرزوں کی خوبیوں کو ملانا چاہتے
ہیں۔ یہ لوگ روایات قدیم کو وقعت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مگر اپنے خیالات اپنے ماحول
سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں صداقت اور واقعیت ہے۔

اس طبقے کے مشہور شعرا حالی۔ آزاد۔ شرر۔ سرشار۔ سرور۔ اسماعیل میرٹھی۔ اکبر الہ آبادی
سر اقبال اور حسرت موہانی وغیرہ ہیں ؛

حالی
۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت کے رہنے والے تھے۔ اور انصاریوں کے
معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ننھیال سید تھی۔ پدری سلسلہ خواجہ
ملک علی سے ملتا ہے۔ جو ایک مشہور عالم اور بزرگ تھے۔ اور غیاث الدین بلبن کے زمانہ
میں ہندوستان آئے تھے۔ پانی پت کے قریب چند گاؤں ان کو جاگیر ملے تھے وہ پانی پت
کے قاضی تھے۔ اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر اور عیدین کی نمازیں پڑھانا بادشاہ کی طرف
سے ان کے سپرد تھا۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ ایزد بخش غربت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور

مجنونانہ کیفیت ان پر طاری رہتی تھی۔ خواجہ صاحب نو برس کے تھے۔ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ انکے بڑے بھائی اور بہن نے ان کو تعلیم و تربیت دی۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد سید جعفر علی میر ممنون دہلوی کے بھانجے سے فارسی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ ابھی سترہ برس کی عمر تھی۔ اور درسیات ختم نہیں ہوئے تھے۔ کہ ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی گئی۔ تحصیل علوم کے شوق میں ۱۸۵۴ء میں حالی دہلی بھاگ آئے۔ اور مولوی نوازش علی سے ڈیڑھ سال عربی پڑھی۔ ۱۸۵۵ء میں اعزا کے اصرار سے پانی پت واپس چلے گئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے غدر کی وجہ سے واپس آ گئے۔ اور چار پانچ برس پانی پت میں مطالعہ میں صرف کئے پھر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر نے ان کو اپنے مصاحب کے طور پر رکھ لیا۔ نواب صاحب ایک زبردست عالم تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ حالی ان سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ اس بات کا حالی نے خود اعتراف کیا ہے۔ کہ نواب صاحب کی مصاحبت اور ملازمت سے ان کو بہت فائدہ پہنچا۔

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

نواب صاحب کی پُر لطف صحبتوں نے حالی کے شوق شاعری کو پھر زندہ کر دیا۔ اور وہ اپنی غزلیں مرزا غالب کو بغرض اصلاح بھیجنے لگے۔ حالی نواب صاحب کے پاس بحیثیت انکے مصاحب اور ان کے لڑکوں کے اتالیق کے تقریباً آٹھ برس رہے۔ ان کے انتقال کے بعد لاہور میں گورنمنٹ بک ڈپو میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنے پر ملازم ہو گئے۔ وہاں انہیں انگریزی انشاپردازی اور جدید خیالات سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی۔ جس سے اپنی زبان اور شاعری کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ لاہور میں چار برس رہے۔ پھر دہلی عربک سکول میں ملازم ہوئے۔ اس سے پہلے وہ لاہور میں آٹھ مہینے چیفس کالج میں بھی پڑھا چکے تھے۔ مگر وہ ملازمت ان کو پسند نہیں تھی دہلی میں سرسید سے ملاقات ہوئی۔

ان کی فرمائش سے مسدس حالی لکھی۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید نے علی گڑھ میں سر آسمان جاہ سے ان کی ملاقات کرائی جنہوں نے ازراہ قدردانی پچھتر روپیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ جب حالی علیگڑھ ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدر آباد گئے تو یہی تنخواہ سو روپے ماہوار ہو گئی۔ اب مولنا ملازمت سے دستکش ہو کر پانی پت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ اور تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کر لیا۔ ۱۹۰۴ء میں تعلیمی خدمات کے صلہ میں ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ آخر ستّر برس کی عمر میں ۱۹۱۴ء میں فوت ہو گئے۔

حالی نہایت خلیق اور ملنسار بزرگ تھے۔ سچے قومی جذبات ان کے دل میں موجزن رہتے تھے۔ دُنیاوی جاہ و جلال کا خیال ان کو مطلق نہیں تھا۔ فرقہ وارانہ جذبات سے بھی ان کا دل پاک تھا۔ وہ ایک سچے انشا پرداز کی طرح سادگی اور صفائی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

حالی کی شاعری پر غالب اور شیفتہ کا اثر

شادی ہونے کے بعد حالی چھپ کر دہلی بھاگ آئے تھے۔ اس زمانہ میں اکثر مرزا غالب کے پاس آتے جاتے تھے اور مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کہا کرتے تھے۔ غالب ہی کو دکھاتے تھے۔ غالب ان سے بہت خوش تھے۔ دہلی چھوڑنے کے بعد شیفتہ کے پاس تقریباً آٹھ برس رہے۔ گویا انہیں کی صحبت میں انکے کلام میں پُختگی پیدا ہوئی۔ وہ مرزا غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اور انہی کا رنگ ان پر غالب تھا۔ شیفتہ کا رنگ بھی ان کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ حالی کے کلام میں نواب صاحب کی صحبتوں کی بدولت جدّت اور تنوع پیدا ہو گیا تھا۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد حالی لاہور آ کر ملازم ہوئے۔ یہاں اگرچہ ان کا دل نہیں لگتا تھا لیکن یہی زمانہ تھا جس نے حالی کی شاعری کا رُخ نیچرل شاعری کی طرف موڑ دیا۔ وہ انگریزی شاعری کے بہت بڑے مداح تھے۔ اسکی سادگی اور صفائی اور بلند تخیئل کو بہت پسند کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں مولنا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن قائم کی جس میں نئی شان کے مشاعرے ہوتے تھے۔ انجمن کی طرف سے مختلف

مضمونوں کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ اور شعرا ان پر اشعار کہہ کر لاتے تھے۔ حالی اگرچہ اس انجمن کے بانیوں میں سے نہیں تھے لیکن اس کے جلسوں میں بہت شوق سے حصہ لیتے تھے۔ برکھارت۔ نشاط امید۔ مناظرۂ رحم وانصاف اور حُبِّ وطن پر اسی زمانے میں انہوں نے نظمیں لکھی تھیں ٭

سرسید کا اثر سرسید اس زمانہ میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے حالی سے کہا۔ مسلمانوں کے زوال کے متعلق نظم لکھ دو۔ چنانچہ مسدس حالی اسی درخواست کا نتیجہ ہے۔ جو اس قدر مقبول ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد حالی قومی شاعر مشہور ہو گئے۔ پھر انہوں نے دہلی کی تباہی اور حکیم محمود خاں کا مرثیہ لکھا۔ ان نظموں سے ایک ایسے فارمر اور خطیب مشہور ہو گئے۔ جو اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے کی کوشش میں تھا ٭

تصانیف منظوم تصانیف (۱) مثنویاں (۲) مسدس حالی (۳) شکوہ ہند (۴) کلیات حالی معہ مقدمہ شعر و شاعری (۵) مناجات بیوہ اور چپ کی داد (۶) مراثی غالب۔ حکیم محمود خاں و تباہی دہلی (۷) مجموعہ نظم حالی (۸) مجموعہ نظم فارسی۔

نوٹ۔ نثر کی تصانیف نثر کے باب میں بیان کی جائیں گی ٭

مثنویاں مناظرہ تعصب وانصاف۔ رحم وانصاف۔ برکھارت۔ نشاط امید اور حُبِّ وطن بہت مقبول مثنویاں ہیں۔ ان کی عبارت صاف اور سلیس ہے۔ نیز صنائع بدائع اور مبالغوں وغیرہ سے پاک ہیں۔ یہ اس زمانہ کی تصانیف ہیں۔ جب مولانا آزاد نے لاہور میں نئی طرز کا مشاعرہ قائم کیا تھا۔ گویا یہ نئے رنگ کی ابتدائی تصنیف ہیں۔ جس میں مولانا حالی نے کمال حاصل کیا تھا۔ پرانے شعرا کے نقطہ نظر میں زبان و تخیل کے لحاظ سے وہ اعلیٰ درجہ کی نہیں۔ مگر نئے رنگ کی رہبر ضرور ہیں ٭

مسدس حالی مولانا حالی کی یہ ایسی تصنیف ہے۔ جس کو ابھی تک روز اول جیسی مقبولیت حاصل ہے۔ اسی سے ہندوستان میں قومی نظم گوئی کی بنیاد پڑی ہے۔ مسدس حالی نے اصناف نظم میں مسدس کو مقبول کرایا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی نقل کی لیکن ویسا جوش اور زور کوئی پیدا

نہیں کرسکا۔ اس لحاظ سے اس کو الہامی کتاب کہنا بیجا نہیں۔ سرسید کہتے تھے۔ کہ اس کتاب نے صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کردیا ہے۔

مسدّس حالی میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کے کارنامے اور موجودہ پستی کا ذکر ایسے انداز میں ہے کہ پتھر کا دل بھی موم ہوجاتا ہے۔ آخر میں اپیل کی گئی ہے۔ کہ اٹھو اور کھوئی ہوئی عظمت کو پھر حاصل کرو ÷

شکوہ ہند یہ بھی مسدّس ہی کی طرز میں ہے۔ یعنی اس میں بھی اسلام کی کھوئی ہوئی عظمت اور موجودہ پستی کا ذکر ہے۔ اور سارا شکوہ ہندوستان سے گیا ہے۔ کہ تُو نے مسلمانوں کی قوت عمل چھین لی ÷

مراثی مرزا غالب اور حکیم محمود خاں صاحب کے مراثی بہت زوردار اور دردانگیز ہیں وہ شاعر کی دلی کیفیات کی سچّی تصویریں ہیں۔ اور مبالغہ اور اغراق وغیرہ سے بالکل معرّا ہیں ÷

مناجات بیوہ یہ کتاب شکوہ ہند اور مسدّس سے زیادہ دلچسپ ہے، اس کی بحر ذرا مشکل ہے اس میں بیوہ عورتوں کی حالت بہت دردناک پیرائے میں بیان کی ہے۔ جس کو سُن کر دل پھٹتا ہے اس کا ترجمہ مسدّس حالی کی طرح مختلف زبانوں میں ہوچکا ہے ÷

چپ کی داد یہ نظم مولانا نے حیدرآباد کے کسی جلسہ میں پڑھی تھی۔ اس کی زبان صاف اور سلیس ہے اور انداز بیان نہایت لطیف ہے۔ اس میں عورتوں کی خوبیوں اور انکے منصبی فرائض کا ذکر ہے ÷

دیوان حالی اس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ جس میں شاعری پر نہایت فاضلانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ دیوان میں قدیم و جدید دو نو رنگ کی نظمیں ہیں۔ جو مبالغہ اور اغراق سے معرّا ہیں۔ غزلیں سب اصناف سخن سے زیادہ ہیں۔ طرز جدید کی غزلیں الگ پہچانی جاتی ہیں۔ سب غزلیں جذبات حقیقی سے لبریز ہیں۔ قطعات مسلسل ہیں۔ رباعیات اخلاقی اور ناصحانہ ہیں۔ رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوچکا ہے۔ قصائد نئی شان کے ہیں۔ ان میں ممدوح کو اپنے فرائض منصبی سے آگاہ کیا ہے اور نصیحتیں بھی کی ہیں ÷

مقدمہ شعر و شاعری	اس میں شعر و شاعری پر نہایت فاضلانہ انداز میں بحث ہے۔ ماہیت شعر کے

متعلق مشرقی اور مغربی ناقدوں کی رائیں لکھ کر ان پر بحث و تمحیص کی ہے۔ مصنف کا اصلی منشا اصناف سخن میں اصلاح کرنا ہے۔ وہ دائرہ غزل کو وسیع کرنے کے لئے اس میں عاشقانہ فلسفیانہ مضامین کے علاوہ اخلاقی قومی اور نیچرل شاعری کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زبان غزل کو بھی تبدیل کرنے کے حامی ہیں۔ کہ زبان کا دائرہ وسیع ہو۔ اور ان قیود عروض کو بھی اُٹھا دینا چاہتے ہیں۔ جو ترقی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہو رہی ہیں۔

غزل گوئی میں ردیف و قافیہ کو مختصر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ردیف کو چھوڑ کر محض قافیہ پر قناعت کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ شعرا اپنے خیالات کا اظہار زیادہ آزادی سے کریں۔ اور سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف قافیوں میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں۔

اولیات حالی	حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں نہایت ممتاز ہے۔ سب سے پہلے انہی نے غزل اور

قصیدہ میں نیا رنگ اختیار کیا۔ اور سیاسی اور قومی نظمیں لکھیں۔ طرز قدیم یعنی تکلّف تصنّع اور خلاف واقعہ باتوں کو ترک کیا۔ اس لئے مولانا آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اُردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا چاہیئے۔

خصوصیات کلام	نیچر کی پیروی تعلّی مبالغہ اور اغراق سے احتراز زبان اور خیالات میں سادگی

اور صفائی۔ جذبات کا اثر زیادہ صنائع اور بدائع کم۔ ان کا آخر زمانہ کا کلام فلسفیانہ اور عمیق ہے۔

نقائص کلام	مولٰنا حالی کہیں کہیں قواعد عروض صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے۔

بعض اوقات انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ شاید ان سے اپنے کلام میں امتیاز پیدا کرنا مطلوب ہو۔ ان کا تخیّل کبھی بہت اعلیٰ اور کبھی محض تُک بندی ہوتی ہے۔ ایک ریفارمر اور نیشنلسٹ کی حیثیت بھی اکثر ان کے کلام کو بدمزہ کر دیتی ہے۔ لیکن ان نقایص سے انکے مرتبہ شاعری میں فرق نہیں آتا۔

آزاد دہلوی	شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کو جدید شاعری کا بانی اور ادب اُردو کا مجدّد

سمجھنا چاہیئے، وہ زمانۂ حال کے بہت بڑے ادیب۔ مشہور نثار۔ نامی گرامی نقاد۔ فن تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور انشا پرداز تھے۔ جدید فارسی کے اُستاد کامل اور فلالوجی (علم اللسنہ) کے بڑے ماہر تھے۔ زبان اُردو پر ان کے احسانات بیحد ہیں۔ اُردو شاعری اور انشا پردازی میں نئی رُوح پھُونکنے والا اگر فی الحقیقت کوئی شخص تھا۔ تو وہ مولانا ہی تھے۔ یہاں ان کی شاعری کا مختصر حال لکھا جاتا ہے۔ باقی حالات حصہ نثر میں درج ہیں +

آزاد کی شاعری

آزاد فطری شاعر تھے۔ ان کی نثر بھی نظم کی طرح شاعرانہ تخئیل رکھتی ہے۔ کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں کہی جا سکتی۔ اُستاد ذوق ان کے والد مولنا محمدؐ باقر مرحوم کے بہت گہرے دوست تھے اس لئے آزاد بھی انہی کی صحبت میں پلے بڑھے اور انہی کے شاگرد ہوئے۔ وہ اپنے اُستاد کے ساتھ بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اور اُستاد دنکے کلام کے حُسن و قبح پر تنقیدیں سُنتے تھے۔ گویا انہی صحبتوں کی برکت سے آزاد میں جذبۂ شاعری برانگیختہ ہُوا تھا۔ آزاد تقریباً چھبیس برس کے تھے۔ کہ غدر کے ہنگامے نے ان جلسوں کو منتشر کر دیا۔ دہلی سے نکل کر وہ مدتوں شمال اور جنوب میں مارے مارے پھرے۔ آخر لاہور آکر ڈاکخانہ میں مُلازم ہوئے۔ کچھ مدت بعد اپنی تعلیمی دلچسپیوں کی بدولت محکمہ تعلیم میں آگئے۔ ان دنوں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ آزاد نے ان کے ایما سے انجمن پنجاب کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی۔ جس کے جلسے ہر مہینے ہُوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے مقاصد بالکل نئے تھے۔ بجائے مصرعہ طرح کے مختلف مضامین کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اور اُردو شاعری سے بیجا مبالغہ تکلف اور فرسودہ خیالات کا نکالنا اس کا مقصد اصلی تھا۔ پُرانی روش چھُڑانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جونہی اس نئی قسم کے مشاعرے اور اس کے مقاصد کا اعلان ہُوا۔ سارے ہندوستان میں مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ آخر مولانا نے قبل اس کے کہ اس قسم کے مشاعرے شروع ہوں۔ مختلف جلسوں میں اپنے فاضلانہ لکچروں اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کو تیار کیا اور ثابت کیا کہ یہ رنگ مقبول عام ہو سکتا ہے ۱۸۶۷ء میں انجمن کے افتتاح کے موقعہ پر انہوں نے ایک نہایت فاضلانہ ایڈریس پڑھا۔ جس میں پُرانی

شاعری کے عیوب جتلا کر صاف صاف بتا دیا۔ کہ اگر اُردو شاعری کی بقا چاہتے ہو تو عروس شاعری کو تیرہ و تار رجعلوں سے نکال کر موجودہ زمانہ کی روشنی میں لاؤ۔ اور سادگی۔ واقعیت اور درد و اثر بھاشا سے سیکھو۔ اور صاف بیانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے وام لو۔

منظوم تصانیف آزاد کو شاعری کا شوق اپنے اُستاد حضرت ذوق کی خدمت میں پیدا ہُوا تھا۔ اور وہ انہی کے شاگرد تھے۔ معلوم نہیں سیکسینا بابو نے یہ کہاں سے نقل کیا ہے۔ کہ وہ اُستاد کے انتقال کے بعد حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لیتے تھے۔

آزاد کا ایّام شباب کا کلام غدر کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا تھا۔ غدر کے بعد وہ چند سال جگراؤں ضلع لدھیانہ میں رہے تھے۔ وہاں سلام اور رُباعیاں وغیرہ لکھتے رہے۔ آخر لاہور آ کر ڈاک خانہ میں مُلازم ہوئے۔ پھر محکمہ تعلیم میں آ گئے۔ اور ۱۸۷۴ء میں نئی طرز کے مشاعرے کی بُنیاد ڈالی۔ جس کی ہندوستان بھر میں مخالفت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکا۔ لیکن پھر بھی آزاد کے خیال اور کوششوں میں کوئی چیز سدِ راہ نہ ہوئی۔ وہ اکثر اُردو نظمیں انگریزی نظموں کی طرز میں لکھتے رہتے تھے۔ اور مغربی خیالات کو اُردو کے سانچے میں اس طرح ڈھالتے تھے۔ کہ ان کو انگریزی کا ترجمہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں محنت شاقہ اور صدمات نے آزاد کے دماغ کو اُلٹ دیا تھا یہی حالت بیس سال تک رہی۔ اس زمانہ میں پُرانے مشرقی خیالات پھر عود کر آئے تھے۔ اور وہ اکثر عاشقانہ غزلیں کہتے رہتے تھے۔ اسوقت کے کلام کو وہ اکثر یہ کہہ کر دریا برد کر دیا کرتے تھے۔ کہ جا اُستاد کے پاس جا۔ پھر بھی جس قدر فراہم ہو سکا مجموعہ نظم آزاد میں شائع ہو چکا ہے۔

آزاد کا قدیم و جدید رنگ جدید رنگ اختیار کرنے سے قبل آزاد پُرانے رنگ میں کہا کرتے تھے۔ اور آخر دنوں میں پھر یہی رنگ عود کر آیا تھا۔ مجموعہ نظم آزاد کے آخر میں پُرانے رنگ کے قصاید اور غزلیں موجود ہیں۔ جن میں بعض اشعار صوفیانہ دلچسپ اور خوب زوردار ہیں۔ جدید رنگ میں اُولوالعزمی کے لئے کوئی سدِ راہ نہیں"۔ ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو محنت کرو۔ معرفت الٰہی

شب قدر وغیرہ قابل تعریف اور پڑھنے کے قابل نظمیں ہیں۔

انداز کلام | (۱) مثنوی شب قدر۔ یہ ان کا شاہ کار ہے۔ اس میں مختلف قسم کے لوگوں کے شب کے اشغال نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیے ہیں۔

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے — بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے — اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر — جاتا زمین کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرے ذرے پہ افسون نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی در مضموں نئے نئے

آزاد

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں — آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورت امیدوار ہے — اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض — رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

(۲) مثنوی حب وطن۔ اس میں بعض سچے اور فرضی واقعات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کر کے اپنے مطالب کو ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خواب امن۔ نہایت زوردار مثنوی ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے۔ کہ تمدنی ترقیاں محض امن کے زمانہ میں ہو سکتی ہیں۔

(۴) مثنوی ابر کرم۔ حالی کی برکھا رت کی طرز پر ہے۔ گویا اس میں ہندوستان کی برسات کا سماں باندھا ہے۔

(۵) صبح امید۔ اس میں یہ دکھایا ہے۔ کہ زراعت۔ تجارت اور تعلیم وغیرہ کی کامیابی امید سے وابستہ ہے۔

آزاد اور حالی کا فرق

آزاد حالی کی طرح شاعری کے دلدادہ نہیں تھے۔ ان کی طبیعت عالمانہ تھی۔ وہ ایک کامل نثار اور شاعر ہونے کے علاوہ ماہر تعلیم۔ جریدہ نگار اور زبردست ناقد تھے۔ انہوں نے ضرورت زمانہ کو دیکھ کر اپنی طبیعت کو جدید رنگ سے رنگا اور اسی میں اجتہاد کا درجہ حاصل کیا۔ نظم آزاد کے شروع میں ان کا ایک لکچر بھی چھپا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اسی میں اپنے ملک اور وطن کی بہتری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے جذبات کا جس قدر اظہار نثر میں ہوا نظم میں نہیں ہوا۔ لیکن ان کی نثر پر حقیقی معنی میں شعریت کا اطلاق ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے حالی ایک قومی شاعر تھے۔ جنہوں نے تنزل اسلام کے راگ کو بڑے دردناک پیرائے میں الاپا۔ ان کی طبیعت نے یہ اثر سر سید سے لیا تھا۔ لیکن اس رنگ کو آخر تک نبھایا اور اسی کی بدولت وہ ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

مولوی صاحب ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر تھی۔ کہ سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ بعد میں ترقی کر کے فارسی کے ہیڈ مولوی ہو گئے۔ اسی ملازمت پر آگرہ اور سہارنپور میں رہ کر ۱۸۹۹ء میں پنشن لی۔ بقیہ عمر میرٹھ میں تصنیف و تالیف میں صرف کی۔ اور ادبی خدمات کے صلے میں خانصاحب کا خطاب بھی پایا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو انتقال فرمایا۔

آگرہ میں مولوی صاحب نے چند اردو ریڈریں اور پرائمریں لکھیں۔ جو عرصے تک نصاب میں داخل رہیں۔ یہ کتابیں نہایت صاف اور سادہ عبارت میں تھیں۔ مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ میں وہی تعلیمی کام کئے جو مولانا آزاد نے پنجاب میں انجام دیئے تھے۔

مولوی صاحب شاعر بھی تھے اور نثار بھی۔ سادگی اور صفائی ان کے کلام کی خصوصیت تھی۔ انہوں نے شاعری میں قدیم و جدید طرز پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اور وہ ہمیشہ صف سخن میں کچھ نہ کچھ

کہتے رہے ہیں۔ ان کی عاشقانہ۔ سیاسی اخلاقی اور نیچرل نظمیں بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مولانا شبلی کہا کرتے کہ اگر حالی کے بعد کسی نے سُننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ گویا زمانۂ حال کے شاعروں اور نثاروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

مولوی صاحب کا سارا کلام ۱۹۱۰ء میں شائع ہُوا تھا۔ ان کے ہاں تصوف کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اُردو میں بغیر قافیہ کی نظموں میں انہوں نے نہایت دل آویز طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔ علاوہ غزلیات کے اخلاقی نظمیں قصّے کہانی کے طور پر لکھی ہیں۔ جن سے نہایت عمدہ اخلاقی نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

مولوی صاحب کے ارادے بہت بلند تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ لغات اُردو کی ترتیب اور قواعد اُردو کی تکمیل نئی طرز سے کریں۔ قرآن السعدین کی تنقید وہ مکمل کر چکے تھے۔ اور امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور سوانح عمری مکمل کر رہے تھے۔ کہ راہی ملک عدم ہوئے۔

سرور جہان آبادی منشی درگا سہائے سرور بھی جدید اُردو شاعری کے ایک رکن ہیں وہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں صرف ۳۷ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

سرور کو جدید و قدیم دونوں رنگوں سے فطری مناسبت تھی۔ انہوں نے دونوں رنگوں کے عیبوں کو چھوڑ کر ان کی خوبیوں کو اختیار کیا تھا۔ ان کے کلام میں قدما کا درد و اثر اور بلند خیالی اور جدید طرز کے تازہ مضامین اور حُب الوطنی کے جذبات ملے جلے ہیں۔ ان کا کلام نہایت شُستہ اور غیر مہذب باتوں سے پاک ہے۔

سرور ہر وقت شعریت میں ڈوبے رہتے تھے۔ وہ نہایت آزاد مزاج اور رند مشرب واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ تنگی اور عسرت سے بسر کرتے تھے۔ لیکن اس سے شاعری کے شوق میں کمی نہیں ہوئی۔ مذہبی تعصبات سے انکا دل پاک تھا۔ ان کی زندگی سادگی۔ اور بے ریائی کا بہترین نمونہ تھی۔ انہیں مے نوشی کا شوق تھا۔ جو مرزا غالب کی طرح کلام میں رنگینی پیدا کرتی تھی۔ اور دُنیاوی

تفکرات سے بے نیاز رکھتی تھی۔ اسی کی بدولت ان کی قابل قدر زندگی کا قبل از وقت خاتمہ ہوگیا۔

خصوصیات شاعری | (۱) جذبات نگاری اور درد و اثر ان کے کلام کا جوہر ہے۔ حزن و یاس انکے دل کو ہمیشہ کریدتا رہتا تھا۔ دیوار کہن۔ حسرت شباب۔ اندوہ غربت۔ مرغان قفس۔ یاد طفلی۔ بلبل کا فسانہ۔ حسرت دیدار اور ماتم آرزو وغیرہ ان کی بہترین نظمیں ہیں۔

(۲) حب الوطنی بھی ان کے کلام کی ایک خصوصیت ہے۔ ایسی نظموں میں وہ تمام اہل ہند کو مخاطب کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو قومی شاعر کہنا بیجا نہیں۔ ان کی قومی نظموں میں حب وطن کا سچا جوش پایا جاتا ہے۔ بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز میں ہیں۔

(۳) سرور نے تاریخی اور مذہبی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں جذبات۔ صداقت۔ بے تکلفی۔ سادگی اور روانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ گنگا۔ جمنا۔ پدمنی۔ نورجہاں کا مزار وغیرہ اس قسم کی قابل تعریف نظمیں ہیں۔

(۴) انہوں نے ہندی الفاظ کو اپنے اشعار میں اس طرح کھپایا ہے۔ کہ محاسن شعر میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اور مذاق سلیم پر وہ گراں نہیں گذرتے۔

انگریزی نظموں کے ترجمے | سرور کی انگریزی تعلیم بہت محدود تھی۔ لیکن انہوں نے جس قدر ترجمے انگریزی نظموں کے کئے ہیں۔ ہر چند وہ لفظی نہیں۔ مگر پھر بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض نظموں میں انہوں نے محض انگریزی عنوان لے لئے ہیں۔ اور ان پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً مرغابی۔ کوئل۔ موسم سرما کا آخری گلاب۔ بچہ اور ہلال وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں جو نہایت دلکش اور دلچسپ ہیں۔

اخلاقی نظمیں | سرور نے اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن نصیحت کی روکھی باتوں میں شعر کی خوبی اور دلکشی کو کم نہیں ہونے دیا۔ زن خوش خو اور بے ثباتی دنیا وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

مختصر یہ کہ سرور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے شاعر تھے۔ انہوں نے سب اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن مسدس میں اپنی طبیعت کا خوب زور دکھایا ہے۔ ان کا

کلام جذبات نگاری - دردواثر - اعلیٰ تخئیل - شیریں بیانی - سلیس زبان اور وسیع النظری کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

ان کا کلام بہت سا ضائع ہو چکا ہے - اکثر لوگ معاوضہ دے کر ان سے نظمیں لکھواتے تھے۔ اور بعض معاوضہ بھی ہضم کر جاتے تھے - اور ان کی نظمیں اپنے نام سے چھپوا دیتے تھے ؂

اکبر الہ آبادی | سید اکبر حسین رضوی ۱۶ ر نومبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے - ان کے والدین مرفہ الحال نہ تھے - ابتدائی تعلیم انہوں نے سرکاری سکولوں میں پائی - ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کرکے نائب تحصیلدار ہو گئے - ۱۸۷۰ء میں ہائیکورٹ میں مثل خوانی کی جگہ ملی - ۱۸۷۲ء میں انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا - اور ۱۸۸۰ء تک وکالت کرتے رہے - پھر منصف ہو گئے۔ ۱۸۸۸ء میں سب آرڈی نیٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوئے - اس کے بعد ان کو خان بہادری کا خطاب ملا - اور وہ ملازمت سے دستکش ہوئے - وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے - آخر انہوں نے ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا ؂

اخلاق وعادات | نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے - ظرافت ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی - احباب ان سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے - ان کے خطوط ان کی راستبازی اور صداقت شعاری کی گواہی دیتے ہیں - وہ مذہباً سُنّی تھے - لیکن کسی مذہب سے تعصب نہیں رکھتے تھے - اور عقائد کے پکّے مسلمان تھے - آخر عمر میں اپنی اہلیہ اور بیٹے کے انتقال سے دل شکستہ ہو گئے تھے - یہ شعر اُسی زمانے کے ہیں ؎

وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں کہ آئی تھی بہار   اب تجھے پا کر میں اے بادِ بہاری کیا کروں
بزم عشرت میں بٹھانا تھا جسے وہ اُٹھ گیا   اب میں اے فردا تیری امیدواری کیا کروں

اکبر کی شاعری | اکبر کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا - ان کا ابتدائی کلام بھی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں وہ اپنا کلام آتش کے شاگرد غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے - ملازمت کے زمانہ میں انہوں نے انگریزی بھی پڑھی تھی - جس کا ان کی شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا تھا ؂

اکبر اپنی طرز کے آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم تھے۔ لسان العصر ہونے کے علاوہ وہ بےمثل شاعر۔ ناصح قوم اور صوفی صافی تھے۔ حکومت پر نہایت ظریف پیرائے میں تنقید کرتے تھے اور سیاسیات کو ظرافت میں رنگ کر اپنی بات ایسے مزے میں کہہ دیتے تھے۔ کہ دیکھنے والے مُنہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

اکبر نے خود اپنی شاعری کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن کو ہم مختصراً ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

پہلا دَور ۱۸۶۶ء تک	اس ابتدائی دَور کا کلام پُرانے رنگ میں ہے۔ یہ زمانہ ان کی نومشقی کا تھا۔ اس وقت کا کلام دہلی اور لکھنؤ کے مستند اساتذہ کی تقلید میں ہے۔ وہی فرسودہ

مضامین اور تصنّع ہے۔ مگر پھر بھی جذبات میں صفائی۔ سادگی اور روانی آنے والے خوش آیند مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

دوسرا دَور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ء تک	اس دَور میں تصنّع کی جگہ بے تکلفی نے لے لی ہے۔ اور نسبتاً اصلیت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں۔ فرسودہ مضامین اور حشو و زوائد کی

بھی معتد بہ کمی ہے۔ درد و اثر۔ بندش اور طرز ادا میں صاف فرق دکھائی دیتا ہے۔

تیسرا دَور ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۸ء تک	اس دَور میں ان کے کلام میں اُستادانہ رنگ آگیا ہے اور نومشقی کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔ ان کو اپنے کلام پر پُوری قدرت حاصل ہے۔ اگرچہ

غزلیں زیادہ لکھتے ہیں۔ لیکن پُرانے رنگ کی بجائے ان میں اخلاقی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ کلام میں ظرافت کا عنصر بڑھ رہا ہے۔ کہیں کہیں رُوحانیت اور تصوّف بھی جلوہ گر ہے۔ اس زمانہ کا کلام اُن کی پہلی اور دوسری کلیات میں داخل ہے۔

چوتھا دَور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک	اگرچہ گذشتہ دَور سے یہ زمانہ الگ نہیں۔ لیکن پھر بھی بہت ترقّی کا دَور ہے۔ اب اکبر حقیقت میں لسان العصر ہوگئے ہیں۔ اب قدیم رنگ کی

غزل گوئی گھٹتی جاتی ہے اور حقائق فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق اور ظرافت میں ترقّی ہو رہی ہے

وہ واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت بیباکی اور شوخی سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اخلاقی۔ رُوحانی اور فلسفیانہ رنگ کا زور ہے۔ عاشقانہ رنگ اگرچہ مدہم ہو چکا ہے۔ لیکن اس کو بھی بھُولے نہیں۔

اکبر کے خیالات میں اب ایسا زور پیدا ہو گیا ہے۔ کہ قواعد شعری کے قیود ٹُوٹ چکے ہیں وہ اپنے خیالات کا اظہار نئے انداز میں کرتے ہیں۔ کہیں انگریزی کے قافیے ہیں۔ اور کہیں جدید استعارے اور تشبیہیں ہیں۔ غرض اسی دور میں اکبر اپنے فن کے صناع کامل ہیں۔

پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک

اس زمانہ کا کچھ کلام کلیات سوم میں چھپ گیا ہے۔ اس دور میں عاشقانہ رنگ بہت کم ہے۔ اشعار پر ظریفانہ سیاسی۔ اخلاقی اور روحانی رنگ چڑھا ہُوا ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں اور درست کہتے ہیں۔ کہ یہ بڑھاپے کا کلام ہے۔ اس میں ایام شباب کے کلام کی سی شوخی اور جوش نہیں ہے واقعی وسیع تجربے اور طویل عُمر نے ان کے کلام کو فلسفیانہ بنا دیا ہے۔ ان کے اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ انسان ان کو اپنا دستور العمل بنا سکتا ہے۔

اس زمانہ کا کلام بہت ہے۔ اس دور میں انہوں نے بہت سے ایسے اشعار بھی لکھے ہیں۔ جن کو وہ طبع کرانا نہیں چاہتے تھے "گاندھی نامہ" اسی قبیل کی کتاب ہے۔

ان کا سارا مطبوعہ کلام تین حصّوں میں چھپا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ حضرت اکبر کے خطوط بھی چھپ چکے ہیں۔ جو ادبی حیثیت سے نہایت دلچسپ ہیں۔ اکبر کوئی نثار نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی انکے خطوط اور اودھ پنچ میں شائع شدہ ظریفانہ مضامین پڑھنے کے قابل ہیں۔

غزلیات اکبر

چستی بندش۔ روزمرہ۔ سلاست۔ روانی۔ بے تکلفی۔ بلند تخئیل۔ اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ ان کی غزلیں اخلاقی۔ روحانی۔ دُنیا کی بے ثباتی۔ ظریفانہ فلسفیانہ اور تصوفانہ مضامین سے مملو ہیں۔ حزن و یاس کے مضامین ان کے ہاں بکثرت ہیں۔ لیکن ان کی شُہرت غزلوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ظریفانہ انداز کے باعث ہے۔

رنگ قدیم

لکھا ہوا ہے جو رونا مرے مقدر میں
خیال تک نہیں آتا کبھی ہنسی کی طرف

نگاہ پڑتی ہے ان پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یہی نظر ہے کہ اب قاتل زمانہ ہوئی
یہی نظر ہے کہ اُٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

ہزار جلوۂ حُسن بُتاں ہو اے اکبر
تم اپنا دھیان لگائے رہو اسی کی طرف

رنگ متوسط

اب تو ہے عشق بتاں میں زندگانی کا مزا
جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائیگا

ہے سبب جوش جنوں کا رنج ہجراں اے حضور
آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آ جائیگا

عشق بُت میں کُفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا
جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا

تجربہ نے حُبّ دُنیا سے سکھایا احتراز
پہلے کہتے تھے فقط مُنہ سے وراب کرنا پڑا

رنگ آخر

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

اسکی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے
عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا

حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سُنے
دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا

دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اس میں
آپ اکبرؔ سے عبث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

جنون عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے
یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے

یہ سچ ہے بےخبر ہے نصف دنیا نصف دُنیا سے
کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ جشن کرتی ہے

وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبرؔ
کہ اُمید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت

اکبر کی شہرت ان کی ظرافت - بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے ان کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا - اور بہت جلد ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہنچ گیا - ظریفانہ رنگ سے ان کی طبیعت کو اوائل عمر ہی سے خاص لگاؤ تھا آخری زمانہ کے کلام میں بھی مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہیں کہیں پائے جاتے ہیں - اس کے بعد سوسائٹی کے رنگ کے ساتھ ان کے اس رنگ میں پختگی اور ترقی ہوتی گئی - ان کی شوخ طبیعت نے اپنے لئے نئے نئے راستے بنا لئے - اس رنگ میں انہوں نے ایسا کمال پیدا کیا کہ کوئی انکی نقل نہیں کر سکا۔

اکبر کے تیسرے دور کے کلام میں ظرافت اور شوخی بہت ہے - آخری عُمر کے کلام میں شوخی نسبتاً کم ہے - اور اس کی جگہ مفید اور ناصحانہ مضامین نے لے لی ہے - اس زمانہ میں انہوں نے ظرافت کو اخلاقی - سیاسی اور روحانی مسائل میں نہایت خوبصورت انداز سے ملا کر اپنے کلام کا پایہ اور بھی بلند کر دیا ہے ؀

اکبر کی ظرافت کے اجزا

(۱) جدید اور لطیف - مگر عام فہم تشبیہوں کو نہایت دلکش انداز میں بیان کر کے لطف پیدا کرتے ہیں -

(۲) غیر زبانوں کے الفاظ بطور قافیہ استعمال کرتے ہیں -

(۳) معمولی الفاظ بالکل انوکھے طریقے سے استعمال کرتے ہیں - مثلاً گٹ پٹ - فالتو -

(۴) بعض معمولی اور سبک الفاظ جو عام شعرا استعمال نہیں کرتے - ان کو وہ شعر میں نہایت خوبی اور شوخی سے صرف کرتے ہیں - مثلاً بدھو - جمن - کلو وغیرہ -

اکبر کی ظرافت کو محض تمسخر نہیں سمجھنا چاہئے - اس کی تہ میں نہایت عمیق اور لطیف معنی ہوتے ہیں - ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور ان کا مذاق سوقیانہ نہیں ہے - انکی ظرافت نہایت جامع اور وسیع ہے - واقعات حاضرہ سیاسیات مغربی طرز تعلیم اور تہذیب انکی خاص دلچسپی کی چیزیں ہیں - ہندوستانی سوسائٹی کی تعلیمی اور مذہبی خرابیوں کی خوب ظریفانہ پیرائے میں انہوں نے خبر لی ہے - غرض امیر غریب عالم جاہل اور ہر مذہب و ملت پر ان کے تیر چلتے تھے -

اکبر کی خاص اصطلاحات مس۔ شیخ۔ سید۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا۔ مسجد۔ مندر۔ بت۔ کالج۔ برہمن۔ وغیرہ وغیرہ ان کی خاص اصطلاحات ہیں۔ مس سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی۔ شیخ سے پرانے رنگ کے تنگ نظر مسلمان۔ سید سے سرسید مرحوم جو انگریزی تعلیم کے دلدادہ تھے۔ اونٹ سے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے ہندو مسلم اتحاد مراد لیتے ہیں۔

اقسام ظرافت (۱) مذہبیات (۲) سیاسیات (۳) تہذیب جدید (۴) پردہ و تعلیم نسواں (۵) ظرافت الفاظ (۶) طنزیات۔

مذہبیات

ڈاڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب — فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی — اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو
پیارا ہے ہم کو، شیخ ہمارا بُرا سہی — چاقو ولایتی نہیں دیسی چھرا سہی
نیست کس مصروف کار دیں تقاب مطمئن — یک فنا فی آلانرست و یک فنا فی الڈارون

سیاسیات

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو — ملک کو دیکھو اپنے حق پہ لڑو
کہدیا صاف ہم نے اے مہراج — ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج
ما مقیمان کوئے دلدار یم
یا ڈپوٹیشن ست یا غم میم

یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی — کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی
کامیابی کا سد بستی پہ ہر اک رستہ ہے — چونچ طوطارام نے کھولی مگر پربستہ ہے

تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے — جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے،

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات — انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

پردہ و تعلیم نسواں

پردہ اُٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں — حوریں کالج میں تو پہنچ جائینگی غلمان تو ہیں

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ، مگر ہُوا کیا — نقاب اُلٹ ہی دی اسنے کہکر کہ کر یگا مرا موا کیا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ظرافت الفاظ

عاشقی کا ہو بُرا اسنے بگاڑے سارے کام — ہم تو اے۔ بی میں رہے اغیار بی۔ اے ہوگئے

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا — ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

ح حکومت کی جب یہاں نہ رہی — حنفی نفی ہیں۔ معطل ہیں

ہر طرح اب ہے عاجزی ہم میں — اب ہمارے امام حنبلؒ[۱] ہیں

طنزیات

آنر اگر ملے جو ہے نام و نمود میں — کیا ہرج زندگی ہو اگر حال زشت میں

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ — فوٹو کوئی لگا دے جوان کا بہشت میں

استحصال بالجبر

یعنی وہ اشعار جو بہ ادنےٰ تغیر اکبر نے اپنے کرلئے ہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حال بندہ — کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

رشتۂ در گردنم افگندہ بیٹ — مے برد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست — گفت مارا خوف فیس و ٹکس زایں کار واشت

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست

بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

۱؎ انگریزی میں ہنبل کے معنی عاجز ہیں۔

اکبر کی سیاسی نظمیں اکبر کی سیاسی نظمیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا مقصد محض خوش طبعی ہے۔ دوسری وہ ہیں جن میں ظرافت کے پردے میں سیاسیات مضمر ہیں۔ ایسے اشعار کی تلخی ظرافت کی وجہ سے بالکل دُور ہو گئی ہے۔ لیکن سامع کے دل پر وہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ اکبر کو ماہر سیاسیات نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اکثر ان کے مقولوں میں اختلافات نظر آتے ہیں۔ اکبر سرکاری پنشن خوار تھے۔ اس لئے سیاسیات سے ہمیشہ اجتناب ہی کرتے تھے۔ پھر بھی جنگ عظیم اور مسجد کانپور کے بلوے کے زمانہ میں گورنمنٹ نے بعض اشعار پر ان کو متنبہ کیا تھا۔

اکبر مشرقی طرز معاشرت کے حامی اور انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں اور روحانی تعلیم کے قائل ہیں ان کے نزدیک احکام خداوندی کی بجا آوری سیاسی اور اقتصادی مشکلات کا بہترین حل ہے۔

اکبر نے کانگریس کی کارروائیوں۔ انتہا پسند جماعتوں۔ جابرانہ حکومت۔ مغربی تہذیب اور تعلیم کا خوب دلکش انداز میں خاکہ اُڑایا ہے۔ یہ مضامین نہایت نادر استعارات اور لطیف اشارات کے پردوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ جو سطحی نظروں کے لئے زعفران زار اور دوربین نگاہوں کے لئے نہایت معنی خیز ہیں۔

سوسائٹی کی نکتہ چینی اکبر کی شاعری کی نمو دنے وہ زمانہ پایا تھا۔ جب ہندوستان نیا جنم لے رہا تھا۔ گویا ہندوستانی بھائی مغربیت کے ایسے دیوانے ہو رہے تھے۔ کہ وہ ہر ہندوستانی چیز کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ اثرات مذہب اور قدیم رسم و رواج پر بھی پڑ رہے تھے۔ اس زمانہ میں چند قدامت پسند لوگ کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بنکم چندر چیٹرجی نے انگریزی تہذیب کا ناول لکھ لکھ کر خاکہ اُڑایا۔ ادھر اکبر نے نظم کا میدان سنبھالا اور انتہا پسند ہندوستانیوں کی خوب خبر لی۔ اکبر قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ اس لئے نئی تہذیب ان کو اپیل نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سر سید مرحوم سے جو مغربی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ہمیشہ چشمکیں ہوتی رہتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر سراسر مغربی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ اس کی تحصیل میں اعتدال چاہتے تھے۔ کیونکہ مذہب کو مغربی تعلیم سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا

وہ مذہب پرہزاروں تہذیبوں کو قربان کرنے کو تیار تھے۔ وہ آخرت کو دُنیا پر ترجیح دیتے تھے۔ پُرانی وضعداری۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری۔ سادگی وغیرہ کے مداح اور موجودہ زمانہ کی دہ دلی۔ خود غرضی۔ بے حمیتی۔ مغربی تعلیم۔ بے پردگی اور مادہ پرستی کے سخت نکتہ چین تھے ؂

مذہبی عقائد اکبر علاوہ شاعر ہونے کے ناصح مشفق۔ ریفارمر۔ واعظ اور فلسفی بھی تھے۔ وہ خدا کی وحدانیت کے قائل تھے۔ اور ان کا اعتقاد تھا۔ کہ مذہب کا تعلّق دل سے ہے۔ اس میں فلسفہ سائنس اور منطق کو کوئی دخل نہیں۔ وہ مذہبی تعصبّات سے بالکل بری تھے۔ لیکن مذہب کے خلاف کسی قسم کی نکتہ چینی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ اعتقاد کو مذہب کی جان خیال کرتے تھے۔ آخر عمر میں فلسفہ اور تصوّف میں بہت کہتے تھے۔ اور دُنیا کی بے حقیقتی اور ناپائیداری کا نہایت عمدہ پیرائے میں ذکر کرتے تھے ؂

نادر کاکوروی نادر علی خاں نادر بہت عمدہ کہنے والوں میں سے تھے۔ فطری رنگ میں انکی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں۔ درد۔ اثر۔ اعلیٰ تخئیل اور حُبّ وطن کے سچّے جذبات ان کے کلام کے مخصوصات میں سے ہیں۔ وہ انگریزی شعرا بائرن اور ٹامس مور کے سادے اور سلیس رنگ کو پسند کرتے تھے۔ ان کی نظمیں شمع و پروانہ۔ شعاعِ امید۔ اور مادرِ ہند وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کا انتقال پنتالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہُوا۔ جس سے ادبی دُنیا کو سخت نقصان پہنچا ؂

ضمیمہ تاریخ ادب اُردو

اصحاب ذیل کے حالات کتاب مکمل ہونے کے بعد دستیاب ہوئے اسلئے بطور ضمیمہ درج کئے جاتے ہیں:۔

نظر لکھنوی | نوبت رائے نظر لکھنؤ کے ایک معزز کایستھ خاندان سے تھے۔ جو لکھنؤ کے نوابوں کے زمانہ میں برسر اقتدار تھا۔ وہ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ اُردو فارسی اور انگریزی تعلیم سے فارغ ہو کر شاعری میں پڑ گئے۔ کیونکہ اسوقت لکھنؤ میں شاعری کا بہت زور تھا۔ ستمبر ۱۸۹۷ء میں انہوں نے لکھنؤ سے رسالہ خدنگ نظر جاری کیا۔ شروع میں اس میں محض غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ لیکن بعد میں مضامین نثر بھی نکلنے لگے تھے۔ نظر آغا مظہر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آغا صاحب کو مشاعروں کا بڑا شوق تھا۔ خدنگ میں انہی مشاعروں کی غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ غالباً یہ رسالہ ۱۹۰۵ء میں بند ہؤا تھا۔

۱۹۰۴ء میں نظر "زمانہ" کانپور کے سب ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس نے الہ آباد بلا کر رسالہ ادیب کی اڈیٹری ان کے سپرد کی۔ تقریباً دو سال تک اس عدیم النظیر رسالے کی ایڈیٹری کر کے کانپور آئے اور زمانہ کے سٹاف میں داخل ہو گئے۔ تقریباً دو سال کانپور میں رہے۔ اور ہفتہ وار آزاد کی بھی نگرانی کرتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں پھر لکھنؤ آئے۔ اب کی دفعہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر کی معرفت منشی نولکشور کے بیٹے سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے پہلے اپنے اخبار تفریح کی ایڈیٹری اور بعد میں اخبار اودھ کی ادارت ان کے سپرد کی۔ اس اخبار میں زیادہ محنت سے کام کرنے سے اور اپنے چہیتے نواسے اور پھر اکلوتی بیٹی کی موت سے انکی صحت نے جواب دیدیا۔ اب انہوں نے اودھ اخبار سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔ ان حادثات سے ان کی عمر کا

آخری حصّہ بہت تلخ کامیوں اور مالی تکلیفوں میں بسر ہُوا۔ آخر کار دمہ کے مرض میں مبتلا ہو کر ۵۶ برس کی عمر میں ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔

نظرؔ کی موت سے تمام شعرائے لکھنؤ کو بہت صدمہ ہُوا۔ اکثر نے تاریخہائے وفات لکھیں نظرؔ ایک فطری شاعر تھے۔ ان کی قدرتِ زبان اور کمالِ شاعری مسلم ہے۔ آخری زمانے کی مُصیبتوں نے ان کے کلام میں بہت زیادہ درد و گداز پیدا کر دیا تھا۔ وہ غزلیں بہت خوب کہتے تھے۔ اور اسی صنف میں اپنے ہمعصروں میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں جدید رنگ میں بھی کہنا شروع کیا تھا۔ لیکن اپنے پُرانے رنگ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکے۔ اس لئے جدید شاعری میں کامیاب نہیں ہوئے۔

شعر و شاعری کے علاوہ فنِ تنقید اور نثر نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ جدید طرزِ تنقید سے آگاہ نہیں تھے۔ لیکن ان کے ریویو اور تنقیدیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ سالہ زمانہ میں عرصے تک وہ نقاد لکھنوی کے نام سے ریویو لکھا کرتے تھے۔ معرکۂ چکبست و شرر میں جو مثنوی گلزار نسیم کے متعلق مدّت تک جاری رہا تھا۔ وہ نمایاں حصّہ لیتے رہے۔ ان مضامین سے ان کی مُنصفانہ رائے اور شاعرانہ قابلیّت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا کلام سلاست روانی اور پاکیزگی میں درگا سہائے سرورؔ کے کلام سے بہت مشابہ ہے۔ ان کے شاگردوں میں منشی بشیشر پرشاد منورؔ مشہور رہیں ؛

کلام

مدّت سے ڈھونڈتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے ۔۔۔ وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی ۔۔۔ زندہ ہوں اب کہ مُردہ مجھ کو خبر نہیں ہے
آہیں بھریں بہت کچھ، دم توڑنا ہے باقی ۔۔۔ اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہے دُنیا ہی جب نظر میں ۔۔۔ پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے

دُنیا سے جا رہے ہو کیا لیکے اے نظرؔ تم
زادِ سفر نہیں ہے۔ رختِ سفر نہیں ہے

مسدس بھی نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ مندرجہ ذیل دردناک مسدس اپنے نواسے کی موت پر کہی تھی ؎

ہُوا تمام اُمیدوں کا خاتمہ تم پر — کسی سے اب نہ توقع۔ نہ ہے کسی پہ نظر
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا۔ نہیں ہے خبر — مرے پہ دیکھئے ملتا ہے اب کفن کیونکر
کہاں گئے مری بگڑی سنبھالنے والے
پُکار لو مجھے لالہ پکارنے والے

تھمو تھمو کہ اس اُجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ — بہار پہ تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ — تمام عمر دل ناتواں ہے اور یہ داغ
فغان بُلبل جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

اسی طرح ان کا وہ مسدس بھی دل ہلا دینے والا ہے۔ جو انہوں نے افریقہ کی ستیاگرہ کے موقعہ پر کہا تھا۔

چکبست لکھنوی | پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے! وائل عُمر میں اپنے اصلی وطن یعنی لکھنؤ میں آ گئے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ جہاں ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ تھوڑی مدت میں وہ اپنی محنت اور قابلیت کی بدولت لکھنؤ کے اوّل درجے کے وکلا میں شمار ہونے لگے۔

چکبست کو شاعری کا بچپن سے بہت شوق تھا۔ کہتے ہیں نو برس کی عمر میں انہوں نے غزل کہی تھی۔ کالج کے ایام میں اکثر مشاعروں میں تمغے اور انعامات حاصل کئے تھے۔ انہوں نے آخر تک کوئی تخلّص اختیار نہیں کیا۔ ضرورت کے موقع پر اپنے خاندانی نام یعنی چکبست ہی کو استعمال کر لیتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

ذکر کیوں آئیگا بزم شعرا میں میرا — میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

شروع میں غزلیں کہا کرتے تھے۔ مگر کچھ عرصے بعد قومی۔ سیاسی۔ سوشل اور نیچرل نظمیں لکھنے لگے۔ جن میں انہوں نے واقعی کمال حاصل کیا۔ مسدس کہنے کا ان کو بہت شوق تھا۔ اور حقیقتاً اس میں بہت جوش وخروش سے کہتے تھے تخلص کے ساتھ ہی انہوں نے اُستادی اور شاگردی کے قدیم سلسلہ کو بھی خیرباد کہدیا تھا اساتذہ قدیم میں میر۔ غالب۔ انیس اور آتش وغیرہ کے کلام کو مدنظر رکھ کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اور نثر میں مولنا آزاد کے پیرو تھے۔

چکبست کا مطمح نظر بہت وسیع تھا۔ اور مغربی تعلیم نے اس پر اور بھی جلا کی تھی۔ بندش الفاظ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور ہندی الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے صرف کرتے تھے جدید رنگ کے مضامین کو صاف اور سلیس طرز میں کہنے پر قادر تھے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ؎

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروضِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

چکبست کا منظوم کلام بہت مختصر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ وہ وکالت میں مصروفیت کی وجہ سے وقت کم نکال سکتے ہوں۔ ان کا مجموعہ نظم انڈین پریس نے چھاپا ہے۔ جس پر اُردو کے محسن سر تیج بہادر سپرو نے فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے ان کی تنقیدات اور دوسرے مضامین بھی اسی پریس نے شائع کئے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں چکبست نے سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کی طرف سے "صبح امید" ماہوار رسالہ نکالا تھا۔ جس میں وہ اکثر سیاسی رنگ کے مضامین لکھتے رہتے تھے۔

چکبست جدید شاعری کے مشہور رکن تھے۔ اور روش قدیم وجدید کے جامع تھے۔ اُردو ادب کو ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن افسوس کہ انکی قابل قدر زندگی کا بہت حسرتناک طریقے سے قبل از وقت خاتمہ ہوگیا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ رائے بریلی سے کسی مقدمہ کی پیروی کر کے واپس سٹیشن پر آئے۔ جہاں ان کو فالج کا ایک شدید دورہ پڑا۔

تمام جسم بے حس وحرکت اور زبان بند ہوگئی۔ اور اسی دن سات بجے شام کو اسٹیشن پر انتقال ہوگیا۔ یہ وحشت اثر خبر سُن کر ان کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت مہاراج نرائن چکبست فوراً گئے اور لاش کو موٹر میں لکھنؤ لائے۔ اس سانحہ عظیم سے لکھنؤ بھر کو سخت صدمہ ہوا۔ عدالتیں بند کردی گئیں۔ تعزیت کے جلسے کئے گئے۔ مختلف مذہب کے شعرا نے اس ناگہانی موت پر دردناک نظمیں لکھیں۔ اور ادیبوں نے تعزیت کے مضامین سپردِ قلم کئے۔ صفی لکھنوی۔ عزیز لکھنوی۔ محشر۔ محروم اور سحر ہنگامی کی نظمیں بہت مؤثر اور درد انگیز ہیں۔

چکبست بحیثیت غزل گو چکبست غزل گوئی میں پُرانے رنگ سے بالکل علیحدہ رہے۔ انھوں نے پُرانی تشبیہات استعارات اور لوازمات غزل کو یک قلم ترک کرکے شیرینی اور صفائی کا خاص خیال رکھا۔ ان کے مجموعۂ نظم میں مشکل سے پچاس غزلیں ہونگی۔ اور وہ بھی اکثر ناتمام۔ ان میں فلسفیانہ اور نصیحت آمیز اشعار خوب ہیں۔ غزلوں سے ان کی سحر کاری اور جادو نگاری کا پُورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشان ہونا

فنا کا ہوش آنا۔ زندگی کا دردِ سر جانا — اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا — دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مرجانا

طویل نظمیں ان طویل نظموں میں مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ مقامی رنگ اور ہندی الفاظ بہت خوبصورتی سے صرف کئے گئے ہیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے ان کے کلام کو اور بھی چمکاتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی نظمیں ذیل کی پانچ قسموں میں تقسیم ہوسکتی ہیں۔ (۱) مراثی (۲) قومی اور سیاسی نظمیں (۳) سوشل نظمیں (۴) مذہبی نظمیں (۵) نیچرل نظمیں۔

مراثی اس صنف میں وہ پُرزور اور درد انگیز نظمیں شامل ہیں۔ جو ملک کے جان نثار لیڈروں کی

وفات پر لکھی گئی ہیں۔ یہ عموماً مسدّس کی شکل میں ہیں۔ اور جوش اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان سے شاعر کے اعلیٰ تخیئل کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ان کو تمام نوجوانانِ ہند کی بلند خیالیوں کا ترجمان کہیں تو بیجا نہیں۔ غور سے دیکھو ان میں انیسؔ کا رنگ کس قدر جھلکتا ہے۔

گوپال کرشن گھوکھلے کے متعلق :-

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو — مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دُنیا میں ایسے ہی غم کو — مٹا کے تجکو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے تیرے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تری چتا میں جلتا ہے

(۲) قومی نظمیں | ان میں بھی وہی درد اور وہی پاکیزگی ہے۔

وطن کا راگ :-

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا — رگوں میں خون کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا — دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

جنگِ عظیم میں جب ہندوستانی سپاہی روانہ ہوئے تو چکبست نے ان کو نہایت پُرجوش الفاظ میں اس طرح مخاطب کیا ہے

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا — طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بُنیاد مٹا کر آنا — ندیاں خُون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کیلئے
دھار تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

(۳) سوشل نظمیں | سوشل معاملات کی اصلاح میں وہ سیاسیات کی طرح میانہ روی کو پسند کرتے تھے۔

انہوں نے ۱۹۱۷ء میں ازدواج بیوہ پر "برق اصلاح" کے عنوان سے بہت عمدہ نظم لکھی تھی۔ ذیل کی نظم "پھول مالا" میں ہندوستانی عورتوں کو کس دلکش انداز میں مغربی تہذیب کی خرابیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم — تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے — خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رخ سے پردے کو اٹھایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا — اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

(۴) مذہبی نظمیں — اس صنف میں انہوں نے بڑا زور قلم دکھایا ہے۔ سری رامچندر کا بن باس۔ کشن کنہیا۔ اور گائے پر نہایت دلکش مؤثر اور مقدس نظمیں لکھی ہیں۔ ذیل کی نظم میں انیس کا رنگ ملاحظہ ہے۔

رام چندر کا بن باس کو جانا:۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام — راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کو زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

آب انگور:۔

رفیق اس کی ہے مستی - عدو شعور اس کا　　وداع ہوش کا سامان ہے ظہور اس کا
خمار مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا　　سیاہ قلب کو کردے جو ہے وہ نور اس کا

لگا دے آگ کلیجے میں جو - وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

(۵) نیچرل نظمیں | نیچرل نظمیں اگرچہ بہت کم ہیں۔ لیکن اعلیٰ تخیّل اور حسن بندش سے لبریز ہیں۔ اور پُرانی طرز سے الگ ہیں۔ ان میں "پھول"۔ "کشمیر"۔ "جلوۂ صبح" وغیرہ نہایت عمدہ اور دلکش نظمیں ہیں۔

رباعیات | چند رباعیات بھی کہیں ہیں۔ ذیل کی رُباعی اپنے حسب حال ہے ۔

بیکار تعلی سے ہے نفرت مجھ کو　　لوں داد سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی　　اک دن خود ڈھونڈھ لیگی شہرت مجھ کو

چکبست کی زبان | ان کی زبان نہایت شُستہ شیریں اور زوردار ہے۔ کلام میں لکھنؤ کا رنگ ہے۔ اکثر ہندی الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ کہ کلام کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

بحیثیت نقاد | چکبست انگریزی اور مشرقی طرز تنقید سے خوب واقف تھے۔ ادبی معاملات میں ان کی رائیں منصفانہ ہوتی تھیں۔ ذاتیات سے وہ ہمیشہ پرہیز کرتے تھے۔ خود کہا ہے ۔

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے مَیں وہ خار نہیں
وہ پھُول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

داغ اور سرشار پر ان کے مضامین ان کی علمی معلومات اور منصفانہ مزاج کا پتہ دیتے ہیں نیز معرکۂ چکبست و شرر بھی ان کی اعتدال پسندی۔ فنّی قابلیت اور متانت کا شاہد ہے۔ وہ اپنے رسالہ صبح امید میں غالب و آتش وغیرہ کے کلام کا انتخاب "عطر سخن" کے عنوان سے شائع کرتے تھے۔ وہ بھی انکی سخن فہمی اور نکتہ سنجی کا زندہ ثبوت ہے۔

بحیثیت نثار | چکبست نثر نگار بھی بہت اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اور اس میں وہ مولانا آزاد کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے مضامین اکثر صبح امید۔ کشمیری درپن۔ خدنگ نظر۔ اور زمانہ وغیرہ میں چھپا

کرتے تھے۔ ان کی عبارت نہایت متین اور زوردار ہوتی تھی۔ اور تخیل عالمانہ انداز رکھتا تھا۔ منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ۔ ستم ظریف۔ نواب سید محمد آزاد۔ جوالا پرشاد برق۔ پنڈت بشن نرائن در دیا شنکر کول۔ تربون ناتھ ہجر وغیرہ پر جو مضامین انہوں نے لکھے ہیں۔ وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر اقبال شیخ محمد اقبال سیالکوٹ میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اقبال نے کچھ مدت مکتب میں تعلیم پائی۔ پھر سکول سے میٹرک پاس کر کے مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے ایف اے کر کے بی۔ اے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے وہیں سے ایم۔ اے کیا اور یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے۔ لاہور میں ان کو علی گڑھ کالج کے مشہور پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے فخر تلمذ حاصل ہوا جس سے ان کو بہت فائدے پہنچے۔ جب پروفیسر موصوف انگلستان واپس گئے تو اقبال نے ایک نہایت مؤثر نظم "نالہ فراق" کے عنوان سے لکھی تعلیم ختم کرنیکے بعد اقبال پہلے اورینٹل کالج میں تاریخ فلسفہ اور معاشیات کے پروفیسر ہوئے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفے کے لکچرار ہو گئے۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اپنے بھائی کے مصارف پر انگلستان چلے گئے کیمبرج یونیورسٹی میں اخلاقیات کی ڈگری حاصل کر کے جرمنی گئے اور میونک میں اپنا مضمون متعلق بہ فلسفہ ایران مکمل کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری پائی۔ یہی مضمون "میٹا فیزکس آف پرشیا" کے نام سے انگلستان میں شائع ہوا۔ جرمنی سے واپس آکر بیرسٹری کی۔ اسی زمانہ میں لنڈن یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر آرنلڈ رخصت پر گئے۔ اور اقبال نے انکی قائم مقامی کی۔ انگلستان سے آکر انہوں نے لاہور میں وکالت شروع کی۔ اور باوقات فرصت شعر و شاعری بھی کرتے رہے۔ جس کا ان کو بچپن سے شوق تھا۔

اقبال کی شاعری اقبال کو شعر و شاعری کا ابتدا ہی سے شوق تھا۔ سیالکوٹ کالج میں پروفیسر میر حسن مرحوم کے فیضان صحبت میں اقبال کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔ لاہور آکر یہ شوق اور بھی ترقی کر گیا۔ اتفاق سے لاہور میں کسی مشاعرے میں مرزا ارشد گورگانی اردو کے مشہور شاعر بھی تھے۔ جب انہوں نے اقبال کا یہ شعر سنا تو پھڑک اُٹھے ؎

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے ۔۔۔ موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے

اسی عرصے میں اقبال کو ارشد سے تلمذ ہو گیا۔ مگر کچھ دنوں بعد داغ کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

۱۸۹۹ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں اپنی مشہور نظم "نالہ یتیم" پڑھ کر سنائی۔ جس سے ان کی شاعری کا شہرہ عام ہو گیا۔ اس کے بعد وہ انجمن کے جلسوں میں اپنی اکثر نظمیں پڑھتے رہے۔ اور یہ سلسلہ انگلستان جانے تک برابر جاری رہا۔ اس زمانہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا۔ اور بہت جلد کہنے کی مشق بہم پہنچائی۔ ان کا حافظہ ایسا زبردست ہے کہ اپنی بڑی بڑی نظمیں شروع سے آخر تک یاد ہیں۔ تصویر درد۔ فریاد اُمت۔ ہمارا دیس۔ نیا شوالہ۔ ترانہ وغیرہ اسی زمانے کی یادگار نظمیں ہیں۔

یورپ کے قیام کے زمانے میں اقبال نے شاعری ترک کر دی تھی۔ اور ان کا خیال تھا۔ کہ ہمیشہ کے لئے اس سے تائب ہو جائیں لیکن مشرق والوں کی خوش قسمتی سے ان دنوں سر شیخ عبدالقادر بھی وہیں تھے۔ اس ارادے کا اقبال نے شیخ صاحب سے بھی ذکر کیا۔ شیخ صاحب نے ان کو بہت کچھ قائل کیا۔ اور آخر فیصلہ اسی بات پر ٹھہرا کہ اگر پروفیسر آرنلڈ شاعری ترک کرنے کا مشورہ دیں تو شاعری چھوڑ دی جائے۔ حسن اتفاق سے پروفیسر موصوف نے کہا کہ جو وقت اقبال شاعری پر صرف کرتے ہیں۔ وہ ان کے اور ان کی قوم کے لئے بیحد مفید ہے۔ اس کے بعد اقبال اس ارادے سے تو باز رہے لیکن انہوں نے اُردو کی بجائے فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہندوستان آکر وہ فارسی اور اُردو دونوں میں کہنے لگے۔ انگلستان سے واپسی پر پین اسلامزم یعنی ملیت کا ملمع ان پر چڑھ چکا تھا۔ غالباً اسی لئے انہوں نے فارسی کو اُردو پر ترجیح دی تاکہ دُنیا بھر کے مسلمان انکے پیغام کو سمجھ سکیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

آجکل اقبال کی شُہرت ہندوستان سے نکل کر ممالک غیر میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ پہلے ہندوستان میں

وہ قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ لیکن اخوت ملی کے جذبات نے ان کو بین الاقوامی اسلامی شاعر بنا دیا۔ یورپ امریکہ اور ہندوستان کے مستشرقوں نے ایک زبان ہو کر قلم و سخنوری میں ان کا سکہ مانا ہے۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے ان کی اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ انہی علمی اور ادبی خدمات کے صلے میں ان کو سر کا معزز خطاب بھی ملا تھا۔ اور ایک زمانے میں نوبل پرائز کے مستحقین میں ان کا نام بھی لیا جاتا تھا۔

اقبال کی شاعری کے تین دور ڈاکٹر اقبال نے خود اپنی شاعری کو تین دوروں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی جب تک وہ ولایت نہیں گئے تھے۔ اسوقت تک کا کلام۔ یہ دور ان کی تیاری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ کا کلام زیادہ تر غزلوں کی صوت میں ہے۔ جس سے ان کے درخشان مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ابتدائی کلام میں الفاظ کی موسیقی اور مصوری درجۂ کمال کو نہیں پہنچی۔ مگر اس کا وجود کسی قدر خامیوں کے ساتھ ضرور موجود ہے اس زمانہ میں اقبال ملی شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہندوستان کی تمام اقوام کے ترجمان ہیں۔ انکی قومی نظمیں ہمالہ۔ ترانۂ ہندی۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت۔ نیا شوالہ وغیرہ اسی زمانے کی قابل قدر یادگاریں ہیں۔ اور انہی کی بدولت اقبال کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی تھی۔

(۲) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اس دور میں وہ یورپ میں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے بہت کم کہا ہے۔ لیکن ان سالوں میں ان کے خیالات میں زبردست تبدیلیاں ہوئیں۔ سب سے پہلے تو وہ شاعری کو چھوڑ ہی دینا چاہتے تھے۔ لیکن سر عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ کے اصرار سے انہوں نے اس شوق کو جاری رکھا۔ مگر اب بجائے اردو کے انہوں نے فارسی کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنا لیا۔ اس کی وجہ یقیناً یہی تھی۔ کہ وہ پین اسلامزم یعنی ملیت کے زبردست حامی ہو گئے تھے۔ اس لئے چاہتے تھے۔ کہ ان کے پیغام عمل سے محض ہندوستان کے برادران اسلام ہی مستفیض نہ ہوں۔ بلکہ تمام دنیا کے مسلمان بھائی ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے کلام کے رنگ میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ مغرب و مشرق کے فلسفے کے مطالعہ سے

ان کے کلام میں گہرائی اور فلسفیت غالب آگئی۔ چنانچہ ترانۂ ملّی وغیرہ اسی انداز اور اسی دور کی نظمیں ہیں۔

(۳) ۱۹۰۸ء سے اب تک یہ دور ہندوستان واپس آکر شروع ہوتا ہے۔ اس میں ان کی شاعری درجۂ کمال کو پہنچی۔ اور وطنی جذبے کی جگہ ملّت پرستی نے لے لی۔ پہلے اُردو اور فارسی دونوں میں کہا کرتے تھے۔ اب محض فارسی میں اپنے بلند اور گہرے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔[1] اس زمانہ میں اقبال محض ہندوستان کے شاعر نہیں رہے۔ بلکہ وہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کے شاعر ہیں۔ اور یہ درجہ ان کو فارسی ہی میں کہنے سے نصیب ہُوا ہے۔

اقبال کی اُردو غزلیں اور نظمیں اقبال کی شاعری کا آغاز عام شاعروں کی طرح غزل گوئی سے ہُوا تھا۔ سیالکوٹ میں ان کو پروفیسر میر حسن سے تلمذ تھا۔ لاہور میں آکر وہ ارشد گورگانی کے شاگرد ہوئے۔ اور بعد میں داغ سے باقاعدہ اصلاح لینے لگے۔ داغ کی وفات پر انہوں نے دردناک مرثیہ بھی لکھا۔ ان کی ابتدائی غزلیں کوئی خاص شان نہیں رکھتیں۔ لیکن درخشاں مستقبل کا غرور پتہ دیتی ہیں۔ تجربہ کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں پختگی تخیئل میں شستگی اور بندش میں چستی اور خوبصورتی بڑھتی جاتی ہے۔ اور اسقام کم ہوتے جاتے ہیں۔ اگرچہ غالب کی سی نزاکت خیال اور ان جیسی دلفریب ترکیبیں اقبال کے ہاں نہیں۔ لیکن متانت کلام۔ بلندئ خیال فلسفے اور تصوف میں مرزا غالب کے وہ معزز جانشین ہیں۔

سیکسینا صاحب کا خیال ہے کہ "بعض جگہ فارسیت کے غلبہ سے تصنع اور آورد بہت ہے۔ کلام کی روانی۔ الفاظ کی موسیقی۔ اثر، بلندئ خیال۔ ایقاع نظر کے محاسن سے دُور ہو جاتے ہیں"۔ یہ صریح نا انصافی ہے۔ اقبال کے کلام میں تصنع اور آورد بالکل نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ اسوقت شعر کہتے ہیں۔ جب شعر ان کو مجبور کر دیتا ہے۔ اور خود بخود زبان پر آجاتا ہے۔ ان کے اشعار ہمیشہ بلند مدارج پر فائز رہتے ہیں۔ شاید ان کے اشعار کے محاسن انہی کو نظر نہیں آتے۔ جو بینش میں نظر نہیں رکھتے۔ یا ان کے طائر تخیئل کے ساتھ پرواز

نہیں کر سکتے۔ فارسیت کے غلبہ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اقبال لفاظ شاعر نہیں ہیں۔ وہ اپنے بیدار کن خیالات کا اظہار نہایت عالمانہ زبان میں ادا کرتے ہیں۔ سیکسنہ صاحب جس قسم کی زبان کی اقبال سے توقع رکھتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ اقبال کی حیثیت ایک حدی خوان یا رہنما اور ریفامر جیسی ہے۔ ان کو اس زبان کی ضرورت نہیں۔ جو عاشقانہ شاعری میں پسند کی جاتی ہے۔ بعض زباندان ان کے کلام پر اسی نقطۂ نظر سے نکتہ چینی بھی کرتے ہیں۔ جو سراسر بے انصافی ہے۔

طویل نظمیں اقبال کی شہرت کا دار و مدار انہی نظموں پر ہے۔ یہ نظمیں ان کے سچے جذبات۔ پُر جوش طرز بیان۔ اور بلندئ خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔ ہمالہ۔ خضر راہ۔ شمع و شاعر۔ شکوہ اور جواب شکوہ وغیرہ اسی قسم کی عدیم المثال نظمیں ہیں۔

بحیثیت ہندوستانی شاعر انگلستان جانے سے پہلے اقبال کا دل وطنیت کا شیدا تھا۔ ان کی اس قسم کی شاعری سے ہندوستان کے نوجوانوں کے دلوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ہندوستان بھر میں قومی شاعر کی حیثیت سے بے انتہا مقبول و محبوب تھے۔ لیکن انگلستان کے سفر نے انکے خیالات کو ملیت پر مرتکز کر دیا۔ اور حُبّ وطن کا جذبہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتا چلا گیا۔ ان کا ترانۂ ہندی بنگالی بندے ماترم" کے مقابلے کی چیز ہے۔ اور وہ اسی طرح مقبول عام بھی ہے۔ ہمالہ۔ صدائے درد۔ تصویر درد۔ قومی گیت۔ نیا شوالہ وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

بحیثیت پین اسلامسٹ اخوت ملی کا رنگ اقبال میں انگلستان جا کر پیدا ہوا۔ اسکو پین اسلامک سوسائٹی (جس کا اقبال ہی کی تجویز سے بعد میں اسلامک سوسائٹی نام رکھا گیا تھا) کا اثر سمجھنا چاہیئے۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا۔ کہ دُنیا بھر میں جہاں جہاں مسلمان ہیں۔ ان کے دلوں میں جذبۂ اخوت پیدا کیا جائے۔ اس احساس کا ظہور تین طریقوں سے ہوتا ہے۔

(۱) کسی اسلامی قوم کی سلب آزادی پر اظہار افسوس و ہمدردی۔

(۲) ایسے اسلامی ممالک کے مستقبل کا فکر جو دول یورپ کے زیر اثر ہیں۔

(۳) اقوام یورپ پر بے اعتباری جو اسلامی زوال کی ذمہ دار ہیں۔

ڈاکٹر اقبال اس بین الملی اخوت کے خاص علمبردار تھے۔ اپنے صادقانہ اور پُرجوش خیالات کا اظہار انہوں نے اس زمانے کی نظموں میں نہایت عمدگی سے کیا ہے ؂

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی　　اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اس انقلاب سے اقبال کو نقصان تو یہ پہنچا کہ وہ ہندوستانی شاعر نہ رہے۔ اور انکی وہ شہرت جو ہندوستان میں قومی نظموں کے ذریعے ہوئی تھی۔ جاتی رہی۔ اور ان کو اس سے فائدہ یہ پہنچا کہ انکی شہرت دُنیا کے تمام اسلامی ممالک اور یورپ امریکہ میں پھیل گئی! اور اب وہ شاعرِ اسلام ہو گئے۔

اقبال کا فلسفہ

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ اقبال عام شعرا کی طرح عشق و عاشقی کے سخن سرا نہیں۔ ان کا کلام فلسفیانہ حقایق سے معمور ہے۔ ان کا فلسفہ مختصراً یہ ہے کہ اپنی ہستی پہچان اپنی ہستی ثابت کر۔ اپنے دل سے توہمات دُور کر۔ وہ مغربی مادہ پرستی کے دشمن ہیں اور اس کے حقایق سے برادران اسلام کو آگاہ کرتے ہیں۔ ان کے اشعار خوشدلی اور خودداری کی تلقین کرتے ہیں۔ اور قدیم اسلامی عظمت کو یاد دلا کر دلوں کو اُکساتے ہیں۔ اقبال کا کلام مغربی اور مشرقی فلسفہ کے زیرِ اثر ہے۔ مگر وہ خود کہتے ہیں کہ میں کسی مغربی فلسفی کا خوشہ چین نہیں ہوں۔

اقبال کا پیغام

اقبال کا پیام صادقانہ اور پُرجوش ہے۔ وہ برادرانِ اسلام کو تلقین کرتے ہیں۔ کہ اپنے اسلاف کے شاندار کارناموں کو دیکھو۔ اپنی ہستی کو پہچانو۔ اور اپنی زندگی کا ثبوت دو۔ قوتِ عمل پیدا کرو کہ جدوجہد زندگی۔ اور سستی موت ہے۔ وہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ اور نصیحت کرتے ہیں۔ کہ تم پہلے جیسی سادگی۔ سچائی۔ بے ریائی۔ شجاعت۔ ہمت۔ استقلال۔ خودداری۔ اور ہمت پیدا کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال موجودہ زمانہ کی تصویر دھیمے رنگوں میں اور گذشتہ اور آئندہ زمانے کا مرقع نہایت شوخ رنگوں میں کھینچتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اقبال کا پیغام پیغامِ عمل ہے ؂

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

کلام میں اُمید و مسرت | اقبال کا کلام ہمیشہ امید اور مسرت کے جذبات برانگیختہ کرتا ہے۔ ان کے کلام میں حزن و یاس کے مضامین نہیں ہوتے۔ اور یہی چیز ان کے کلام کو معاصرین سے ممتاز کرتی ہے ان کا خیال ہے کہ مصائب اور ناکامیاں انسان کے کیرکٹر کو پختہ کرتی ہیں۔ وہ خود بھی کبھی مایوس نہیں ہوتے اور ہمیشہ ناکامیوں کی گھٹاؤں میں اُمید کی چمک دیکھتے ہیں ع
مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

اقبال عملی شاعر ہیں | اقبال باوجود شاعر ہونے کے اشیاء کا عملی پہلو کبھی نظرانداز نہیں کرتے۔ اگرچہ ان کے خیالات بہت بلند ہیں۔ لیکن ان کے خیالات کی دُنیا میں عمل ہی عمل ہے۔ اور وہ ایک بہت بڑے عملی شاعر ہیں۔

نیچرل نظمیں | اس صنف میں اقبال کا کلام لاجواب ہے۔ وہ نظمیں جو انہوں نے قُدرتی مناظر پر لکھی ہیں۔ اپنا نظیر نہیں رکھتیں۔ چاند۔ جگنو۔ صبح کا ستارہ اور ابر وغیرہ پر ان کی نظمیں نہایت عمدہ ہیں۔ اکثر شعرائے مشرق مناظر قدرت کا ضمناً ذکر کر دیتے ہیں اور شعرائے مغرب کی طرح فطرت کے حسین مناظر میں وہ محو نہیں ہوتے۔ اقبال اس لحاظ سے اہلِ مغرب سے بہت آگے ہیں۔ اور یہی چیز ان کو مشرقی شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

اقبال کے خصوصیات شاعری | (۱) اخوتِ ملی کی تحریک۔

(۲) اسلام کے قرونِ اولٰے کی سادگی اور عظمت کے زوال کا باعث۔ عجم کی پُرتکلف تہذیب کو قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی شکایت کرتے ہیں۔

(۳) ان کا پیغام سچا اور پُرجوش ہے۔ لیکن بعض باتیں مصلحتاً تشبیہ اور تمثیل کے پردے میں کہتے ہیں۔

(۴) وہ حقیقی شاعر ہیں۔ کسی کی بیجا مدح اور ہجو نہیں کہتے۔ جب جذبات ان کو مجبور

کرتے ہیں۔ اسوقت ہی شعر کہتے ہیں۔

(۵) ان کے کلام میں ایجاز اور اختصار خوب لطف دیتا ہے۔ یعنی دریا کو کوزے میں بھر دیتے ہیں۔

(۶) ان کے اعلیٰ مضامین ذرا غور سے بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

(۷) وہ زمانہ حال کے شاعر ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے حقائق ان کے کلام میں تصوف اور اخلاق کے رموز کی طرح حسین ترین الفاظ میں موجود ہیں۔

(۸) ان کی بعض تشبیہیں بہت لطیف ہوتی ہیں۔ جگنو کے متعلق لکھتے ہیں ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غُربت میں آکے چمکا گُمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

افسوس ہے کہ اُردو ادب کا یہ درخشندہ ستارہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔ اقبال مُدت سے بیمار چلے آتے تھے۔ آخر مرگ کا پیغام آگیا۔ مُلک کو ان کی موت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ خواجہ دل محمدؔ نے بے نظیر تاریخ کہی ہے:۔

"شمع خاموش" "شمع شاعری خاموش"
۱۹۳۸ء — ۱۳۵۷ھ

فہرست مضامین حصۂ نثر

باب ۱۷

اُردو ناول کی ابتدا
شرر اور سرشار کا زمانہ

باب ۱۸

اُردو ڈراما

باب ۱۹

زبان اُردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق رائیں

تاریخ نثر اُردو

باب ۱۷

نثر اُردو کی ابتدا اور ترقی

فورٹ ولیم کالج کلکتہ

نثر اُردو کے آغاز میں تاخیر کے اسباب

شمالی ہند میں اس وقت فارسی کا عام رواج تھا۔ کیونکہ فارسی درباری زبان تھی ہر قسم کی تحریریں فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں۔ نثر نگاری میں ظہوری اور بیدل کی پیروی ہوتی تھی۔ اُردو میں بھی فارسی نثر کی اقسام یعنی مرجز۔ مقفیٰ مسجع۔ اور عاری وغیرہ رائج تھیں معمولی معمولی باتیں نہایت رنگین اور پُر تکلف عبارت میں بیان کی جاتی تھیں۔ ان دنوں نظم کا رواج عام تھا۔ کیونکہ نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ گویا نظم کی مقبولیت عام نے نثر کو گوشۂ گمنامی میں ڈال رکھا تھا۔ بس یہی اسباب اس کی ابتدائی تاخیر اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ جیسے دور دراز مقام سے منصۂ شہود پر آنے کا باعث ہوئے ؎

زبان دکنی میں قدیم اُردو نثر کی تصانیف

محققین زبان نے (جن میں مولوی عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اُردو حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری خاص طور پر قابل ذکر ہیں) کوشش کر کے دکنی کے قدیم ترین چھوٹے چھوٹے رسائل دریافت کئے ہیں۔ یہ رسائل مذہبی رنگ کے ہیں۔ لیکن اُردو نثر کے وجود کا آٹھویں صدی ہجری تک پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً خواجہ گیسو دراز گلبرگوی اور شیخ علم الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ ۱۳۹۲ء کی تصانیف وغیرہ اس امر کی کافی شہادت ہیں۔ کہ اسوقت نثر کا وجود موجود تھا ؂

دہ مجلس فضلی مصنفہ ۱۷۳۲ء

دکن کی اُردو میں شمالی ہند میں آنے سے پہلے نثر کی کتابیں موجود تھیں۔ مگر وہ قصہ کہانیوں کی صورت یا مذہبی رنگ میں ہیں۔ اور فارسی کا ترجمہ ہیں۔ انہی میں فضلی کی دہ مجلس بھی ہے۔ فضلی نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ فارسی کی روضۃ الشہدا مصنفہ ملا حسین واعظ کاشفی کا ترجمہ عام فہم زبان میں کرنے کی مدتوں سے آرزو تھی۔ مگر میرے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ کہ اس کام کی ہمت بڑھتی۔ آخر امام حسینؑ نے خواب میں ہمت بندھائی۔ فضلی نے کچھ مرثیے اور نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن ان کو شہرت نہیں ہوئی ۔

دہ مجلس اس زمانہ کی نثر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں ابتدائی خامیاں موجود ہیں یعنی عبارت پیچیدہ۔ پرتصنع اور مقفیٰ ہے ؂

سودا کے زمانہ کی نثر

اسی زمانہ کی نثر اُردو کا ایک نمونہ سودا کے کلیات کے شروع میں درج ہے جس سے اس زمانہ کی طرز کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس میں صرف ونحو کی پابندی بالکل نہیں۔ صرف ہم قافیہ الفاظ جملوں کے آخر میں دھر دیئے گئے ہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار ہے۔ گویا صرف ناموزون ہونے کی وجہ سے اس کو نثر کہا جاتا ہے۔ ورنہ نظم میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ؂

دریائے لطافت

انشا اور قتیل کی دریائے لطافت گو فارسی میں ہے۔ لیکن اس میں اس وقت کے مختلف اہل پیشہ کی بولیاں۔ رسم ورواج۔ ضرب الامثال۔ لکھنؤ اور دلی کی زبان کے فرق متروکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبانوں کے دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں داخل ہونے کے اثرات وغیرہ وغیرہ

مندرج ہیں ۔

نوطرز مرصع یعنی ترجمہ قصہ چہار درویش

نوطرز مرصع بھی اس عہد کی مشہور کتاب ہے ۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے اس کو امیر خسرو کے قصہ چہار درویش سے ۱۷۹۸ء میں اردو میں ترجمہ کیا تھا ۔ مصنف موصوف مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے ۔ انکے والد کا نام محمد باقر خاں شوق تھا ۔ مرصع رقم ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے ۔ پھر وہ جنرل سمتھ کے میر منشی ہو کر کلکتہ گئے جب جنرل موصوف ولایت گئے تو تحسین مرحوم پٹنہ آ کر وکالت کرنے لگے ۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہوئے اور یہ سلسلہ نواب صاحب کے زمانہ تک قائم رہا ۔

تحسین خوشنویس ہونے کے علاوہ منشی بھی بہت اچھے تھے ۔ چنانچہ ضوابط انگریزی یعنی گورنمنٹ ہند کے قوانین کا مجموعہ اور تاریخ قاسمی ان کی فارسی زبان کی تصانیف ہیں ۔ قصہ چہار درویش کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی عربی کے الفاظ سے مملو ہے ۔ غالباً اسی وجہ سے ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اسکا ترجمہ آسان اردو میں دوبارہ میر امن دہلوی سے کرایا تھا ۔ جو باغ و بہار کے نام سے موسوم ہے ۔

فورٹ ولیم کالج سے نثر اردو کے تعلق کے اسباب

انگریزوں نے تجارت کرتے کرتے بڑے بڑے قطعات اپنے قبضے میں کر لئے تھے ۔ ان کا انتظام کرنے کے لئے اس خطے کی زبان جاننی ضروری تھی شروع شروع میں یہ کام مترجموں سے لیا جاتا تھا ۔ لیکن اب یہ خیال پیدا ہوا ۔ کہ جب تک برسر حکومت قوم مفتوح قوم کی زبان اور روایات سے واقف نہ ہو اسوقت تک پوری طرح حکومت نہیں کیجا سکتی ۔ لہذا کورٹ آف ڈائرکٹرز نے حکام کے لئے دیسی زبانوں کی واقفیت لازمی قرار دی ۔

جب انگریزی سلطنت بہت وسیع ہو گئی تو پارلیمنٹ نے ہندوستان کی تعلیم بھی اپنے ذمہ لے لی ۔ کیونکہ حکومت کی مشین بغیر انگریزی تعلیم کے چلنی آسان نہ تھی ۔ انگریزی تعلیم نے خیالات اور زبان دونوں میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ جس کا نظم اور نثر دونوں پر اثر پڑا ۔ انقلابات سے برائیاں اور اچھائیاں دونوں آتی ہیں ۔ لیکن اس تعلیمی تغیر سے دیسی زبان کو فائدے زیادہ پہنچے اور نقصان نسبتاً کم ہوئے ۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ
۱۷۵۹ء تا ۱۸۴۱ء

جان گلکرسٹ سکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ وہ ایڈنبرا میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بحیثیت ڈاکٹر ہندوستان آئے۔ ابتدا ہی سے ان کا یہ خیال تھا کہ انگریز افسروں کو ہندوستان کی زبان ضرور جاننی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے خود سبقت کی۔ وہ ہندوستانی کپڑے پہن کر اکثر ان مقامات کی سیر کیا کرتے تھے۔ جہاں فصیح اردو بولی جاتی تھی۔ اردو کے علاوہ فارسی۔ سنسکرت اور اکثر مشرقی زبانوں سے باخبر تھے۔ ان کے شوق کو دیکھ کر اور افسروں کو بھی اردو سیکھنے کا شوق ہوا۔ اور بعد میں اس کا عام رواج ہو گیا۔

لارڈ ویلزلی اُسوقت گورنر جنرل تھے۔ انہوں نے گلکرسٹ کے ان کاموں کو مفید پا کر ان کو فورٹ ولیم کالج کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اور ان کو ہر قسم کی امداد اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کیلئے دی۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں انگریز افسروں کو دیسی زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے کھولا گیا تھا ڈاکٹر گلکرسٹ نے وہاں رہ کر اردو کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ اردو نے تھوڑے سے دنوں میں فارسی کو سرکاری دفاتر سے نکال کر اس کی جگہ خود لے لی۔

ڈاکٹر صاحب کی اردو نوازی نے ہندوستان میں خوب شہرت حاصل کی تھی۔ چنانچہ مغلیہ حکومت کے اختتام کے بعد بہت سے مشہور اہل قلم اور اہل زبان جن میں میرامن۔ افسوس۔ حسینی۔ لطف۔ حیدری۔ جوان۔ للولال جی۔ نہالچند۔ اکرم علی ولا۔ سید محمد منیر۔ سید بشیر علی افسوس۔ اور مداری لال گجراتی قابل ذکر ہیں۔ کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کو نہایت خوشی سے اپنے کالج میں جگہ دی۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کپتان روبک۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر کی خدمات بھی قابل تعریف ہیں۔

ڈاکٹر موصوف ۱۸۰۴ء میں علالت کی وجہ سے پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ لیکن اردو سے ان کو ایسا عشق تھا۔ کہ وہ ۱۸۱۶ء میں ایڈنبرا سے لندن میں آ گئے۔ اور وہاں انڈین سول سروس کے اُمیدواروں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم دینے لگے۔ ۱۸۱۸ء میں وہ اورنٹیل انسٹیٹیوٹ میں اردو کے

پروفیسر ہو گئے۔ ۱۸۲۵ء میں اس ادارہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ پرائیویٹ طور پر سال بھر شائقین کو اُردو پڑھاتے رہے۔ آخر ۸۲ برس کی عمر میں انہوں نے پیرس میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کی زبان کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے انگریزی ہندوستانی ڈکشنری اور ٹیل لنگوایسٹ۔ ہندوستانی گرامر۔ اور ہندوستانی فلالوجی وغیرہ مشہور ہیں۔

میرامن دہلوی | میرامن دہلی کے رہنے والے تھے۔ لُطف تخلص کرتے تھے۔ انکے آباؤ اجداد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں وظائف اور جاگیروں کے مالک تھے۔ احمد شاہ دُرانی کے حملۂ دہلی میں ان کی جائداد پر سورج مل جاٹ نے قبضہ کر لیا تھا۔ میرامن خود پٹنے چلے گئے۔ وہاں کچھ دنوں رہ کر کلکتہ گئے۔ جہاں نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد ہوئی۔ اس زمانہ میں میر بہادر علی حسینی کے ذریعے سے ان کی ملاقات ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ہوگئی۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش سے میرامن نے قصۂ چہار درویش کا آسان اُردو میں ترجمہ کیا جس کا تاریخی نام باغ و بہار ۱۲۱۷ھ رکھا۔ قصہ چہار درویش امیر خسرو نے اپنے مُرشد نظام الدین اولیاء کی علالت کے زمانہ میں ان کا دل بہلانے کو فارسی میں لکھا تھا۔ حضرت کی دُعا تھی۔ کہ جو بیمار اس کو سُنے گا شفا پائیگا۔

یہ قصہ اب تک مقبول ہے۔ اور بہت سی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے میر تحسین نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔ لیکن اس کی عبارت مشکل تھی۔ اس لئے مقبول نہیں ہُوا۔ پھر میرامن نے اس کو نہایت پاکیزہ زبان میں تبدیل کیا۔ بقول سرسید انکو اُردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے۔ جو میر تقی کو نظم میں تھا۔ یہ عجیب تربات ہے۔ کہ یہ کتاب انگریزوں میں بہت مقبول ہے شاید اسلئے کہ اس میں اس زمانے کے رسم و رواج کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ "گنجینہ خوبی" بھی میر امن کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب مُلّا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی کی طرز پر ہے۔ منشی کریم الدین کا خیال ہے۔ کہ ان کا کوئی دیوان بھی ہو گا لیکن ڈاکٹر فیلن نے میر امن کی زبانی بیان کیا ہے۔ کہ فن شعر میں ان کو کسی سے تلمذ نہیں تھا۔

افسوس
۱۷۳۵ء تا ۱۸۰۹ء

میر شیر علی افسوس دہلوی میر مظفر علی خاں کے بیٹے تھے۔ جو امام جعفر صادق کی اولاد میں سے تھے۔ آبا و اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ انکے بزرگ سید بدر الدین نارنول میں آ کر رہے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کے والد اور چچا آگرے سے دہلی آئے اور نواب امیر خاں کی سرکار میں بیش قرار تنخواہ پر ملازم ہوئے۔ اس زمانہ میں افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب کے انتقال کے بعد افسوس پٹنے چلے گئے۔ اور وہاں نواب میر قاسم اور میر جعفر کی سرکار میں اسلحہ خانے کے داروغہ ہوئے۔ پھر میر جعفر کی معزولی کے بعد لکھنؤ آئے اور وہاں سے حیدر آباد آ گئے۔ اور وہیں انتقال ہو گیا۔

لکھنؤ کے قیام میں افسوس کو شاعری کا شوق ہو گیا۔ وہ اپنا کلام میر حیدر علی حیران کو دکھاتے تھے۔ بعض کہتے ہیں۔ میر حسن اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں افسوس کی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے بعد ان کے بیٹے کرتے تھے۔ یہیں نواب رضا خاں نائب آصف الدولہ کی وساطت سے ان کی ملاقات کرنل سکاٹ سے ہوئی۔ کرنل سکاٹ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اور ان کو دو سو روپے ماہوار پر کلکتہ بھیج دیا۔ پانسو روپے زادِ راہ کیلئے دیئے کلکتہ پہنچ کر وہ فورٹ ولیم کالج کے سٹاف میں داخل ہو گئے۔

تصانیف (۱) ان کا ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اُردو بہت مقبول ہوا۔

(۲) آرائش محفل میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات اور فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی مختصر تاریخ ہے۔

(۳) ایک دیوان بھی ہے۔ جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کلیات سودا اپنی تصحیح سے چھپوایا۔ اور میر بہادر علی کی نثر بینظیر منشی عزت اللہ کا مذہب عشق

اور مولوی محمد اسمٰعیل کی بہار دانش کی تصنیف میں بہت مدد دی ۔

میر بہادر علی حسینی ان کے متعلق محض اتنا ہی معلوم ہے ۔ کہ فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے کتب ذیل ان کی تصنیف ہیں (۱) "اخلاق ہندی" مفرح القلوب کا یہ سلیس اُردو ترجمہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء میں کیا تھا ۔ (۲) نثر بےنظیر یعنی مثنوی میر حسن نثر میں ۔ یہ مثنوی سے دو برس قبل ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی (۳) خلاصہ گرامر گلکرسٹ صاحب (۴) ترجمہ تاریخ آسام اسکے علاوہ قصۂ لقمان اور قرآن شریف کے ایک ترجمے میں بھی انہوں نے مدد دی تھی ۔

سید حیدر بخش حیدری سید ابوالحسن کے بیٹے اور دلی کے رہنے والے تھے ۔ بزرگ نجف سے آئے تھے ۔ سید ابوالحسن اور حیدر بخش ۔ لالہ سُکھدیو رائے کے ساتھ دہلی سے بنارس گئے ۔ اور وہیں سکونت اختیار کرلی ۔ حیدری کو ان کے والد نے نواب علی ابراہیم خاں جج عدالت انگریزی مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم کے سپرد کیا کہ ان کی صحبت سے مستفیض ہوں ۔ ان کی علوم مذہبی کی تعلیم غازی پور ہی کے سپرد ہوئی ۔ جو نواب صاحب کی عدالت سے وابستہ تھے ۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں چند قابل منشیوں کی ضرورت تھی ۔ حیدری نے قصہ مہر و ماہ درخواست کے ساتھ لکھ کر ڈاکٹر گلکرسٹ کو بھیجا ۔ اس کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنے کالج میں بلا لیا ۔ انکا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا ۔ انکے بیٹے عیاں اور ممتاز بھی مشہور ہوئے ہیں ۔ ان کی اکثر تصانیف فارسی کے تراجم ہیں ۔

(۱) قصہ لیلےٰ مجنوں ۔ امیر خسرو کی مثنوی لیلےٰ مجنوں کا ترجمہ ہے ۔

(۲) طوطا کہانی ۔ سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر کیا تھا ۔

(۳) آرائش محفل ترجمہ حاتم طائی نہایت سلیس اور دلچسپ ہے (اس کو میر شیر علی افسوس کی آرائش محفل سے کوئی تعلق نہیں)

(۴) تاریخ نادری ۔ مرزا مہدی کے نادر نامہ کا ترجمہ ہے ۔

(۵) گل مغفرت ۔ یہ ان کے گلشن شہیداں یعنی ترجمہ روضۃ الشہدا کا خلاصہ ہے ۔ اس کا

دوسرا نام دہ مجلس ہے۔

(۶) گلزار دانش۔ شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اُردو ترجمہ جس میں عورتوں کے فریب کے قصّے ہیں۔

(۷) ہفت پیکر نظامی کا جواب۔

(۸) ایک دیوان چند مراثی اور ایک مجموعہ صد حکایات بھی ہے۔

مرزا کاظم علی جوان اصل میں دلّی کے باشندے تھے لیکن لکھنؤ میں آرہے تھے ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ سے انہوں نے اپنے کلام کا نمونہ نواب علی ابراہیم خاں مصنّف تذکرہ گُلزار ابراہیم کو بھیجا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں کرنل سکاٹ نے ان کو لکھنؤ سے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت دے کر بھیجا تھا۔ ۱۸۱۵ء میں فورٹ ولیم کے مشاعروں تک وہ زندہ تھے۔ کتب ذیل ان کی طرف منسوب ہے:۔

(۱) شکنتلا مصنّفہ کالیداس کا اُردو ترجمہ۔ انہوں نے برج بھاشا سے ترجمہ کیا تھا۔ (۲) ترجمہ قرآن۔ (۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلّقہ خاندان بہمنی (۴) سنگھاسن بتیسی۔ اس کی تصنیف میں لالہ للو لال بھی شریک تھے (۵) بارہ ماسہ یا دستور ہند اس میں ہندوستان کی فصلوں اور تہواروں کا ذکر ہے (۶) خرد افروز یعنی انتخاب کلام میرؔ و سوداؔ۔

نہالچند لاہوری دلّی میں پیدا ہوئے۔ مگر لاہور میں زیادہ رہے۔ اس لئے لاہوری مشہور ہوئے ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ گئے۔ جہاں کپتان ولورٹ نے ان کو ڈاکٹر گلکرسٹ سے ملایا جن کی فرمائش سے انہوں نے قصۂ تاج الملوک اور گُل بکاولی کا ۱۸۱۲ء میں فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

مظہر علی خاں ولا مرزا لُطف علی۔ المعروف مظہر علی خاں متخلّص بہ ولا سلیمان علی خاں وداد کے بیٹے اور دلّی کے رہنے والے تھے۔ مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ گلشن بیخار میں میر نظام الدین ممنون کو ان کا اُستاد لکھا ہے۔ مرزا صاحب کلکتہ کے کالج میں منشی تھے۔ ذیل کی تصانیف ان کی طرف منسوب ہیں:۔

(۱) پند نامہ سعدی کا منظوم ترجمہ مصنّفہ ۱۸۰۲ء (۲) ہفت گلشن مصنّفہ ناصر علی خاں

بلگرامی کا ترجمہ یہ اخلاق و مواعظ کی کتاب ہے۔ (۳) قصہ مادھونل و کام کنڈلا۔ برج بھاشا سے اُردو میں ڈھالا ہے۔ (۴) صورت کبیشر کی بیتال پچیسی بھاشا کا ترجمہ جو پچیس قصوں پر مشتمل ہے (۵) فارسی تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ (۶) دیوان ریختہ ۵۰۳ صفحات کا معہ سوانحعمری مصنف +

| حفیظ الدین احمد | انہوں نے خرد افروز کے نام سے ۱۸۰۳ء میں ابوالفضل کی عیار دانش کا اُردو ترجمہ

کیا۔ عیار دانش ملا حسین واعظ کاشفی کی تلخیص اور انوار السہیلی کلیلہ دمنہ عربی کا ترجمہ ہے۔ جو سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ کتنے ہی لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ لیکن بستان حکمت مترجمہ فقیر محمد گویا سب سے بہتر ہے +

| مولوی اکرام علی | انہوں نے عربی کی مشہور کتاب اخوان صفا کا صرف وہاں تک اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جہاں حیوان اور انسان کی برتری کا سوال جنوں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اسمیں تمام جانور انسان کے ظلموں کے خلاف مقدمہ پیش کرتے ہیں۔ ہر جانور اپنا اپنا بیان دیتا ہے۔ جو نہایت دلچسپ ہے۔ اس پوری کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ڈیرٹس نے کیا تھا۔ اور کپتان ٹیلر کی فرمائش سے مولوی صاحب نے اس کا کچھ حصہ سلیس اُردو میں لکھا تھا جو ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا۔

۱۸۱۴ء میں کپتان لاکٹ کی سفارش سے جو اسوقت فورٹ ولیم کالج کے اعلیٰ افسر تھے مولوی صاحب فورٹ ولیم کالج میں محافظ دفتر مقرر ہو گئے تھے +

| للولال جی | یہ گجرات کے برہمن تھے۔ لیکن شمالی ہند میں آرہے تھے۔ ہندو ہونے کے باوجود اُردو کے بڑے ماہر تھے۔ شکنتلا ناٹک۔ سنگھاسن بتیسی۔ بیتال پچیسی اور قصہ مادھونل کی تصنیف میں انہوں نے اصل مصنفین کو بڑی مدد دی تھی۔ ۱۸۱۰ء میں انہوں نے "لطائف ہندی" کے نام سے لطیف حکایات ہندی زبان میں لکھی تھیں +

| بینی نرائن | جہان تخلص کرتے تھے۔ دیوان جہان کے مصنف تھے۔ جس میں ہندوستانی شعرا کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ وہ کپتان روبک سکرٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش سے ۱۸۱۲ء میں لکھا تھا انہوں نے ایک فارسی قصے کا ترجمہ "چہار گلشن" کے نام سے بھی کیا تھا۔ یہ قصہ منشی امام بخش کی

فرمائش سے لکھا تھا۔ کپتان ٹیلر نے اس کو پسند کیا تھا۔ اور مصنف کو اس پر انعام دیا تھا۔ گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق کے مطابق انہوں نے شاہ رفیع الدین کی تنبیہ الغافلین کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اور مسلمان ہو کر مولنا سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت ہو گئے تھے۔

مرزا علی لطف کاظم بیگ خاں استرآبادی کے بیٹے تھے۔ جو نادرشاہ کے ساتھ ۱۱۵۴ھ ۱۷۴۱ء میں ہندوستان آئے۔ اور بعد میں ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربارشاہی میں داخل ہوئے لطف فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اور اپنے باپ کے شاگرد تھے۔ جو ہجر یا ہجری تخلص کرتے تھے۔ وہ اردو شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔

لطف حیدرآباد دکن جا رہے تھے۔ کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے ان کو روک لیا۔ اور تذکرۂ گلشن ہند لکھوایا۔ اس کا سن تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔ اور ماخذ نواب علی ابراہیم خاں کا تذکرہ ابراہیم ہے انہوں نے خود بھی بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ پہلے تذکرۂ گلشن ہند بالکل نایاب تھا۔ جب حیدرآباد میں طوفان آیا تو اس کی ایک جلد موسیٰ ندی میں سے کسی قدردان نے بہتی ہوئی پکڑی۔ اب ترقی انجمن اردو نے اس کو نہایت اہتمام سے چھپوایا ہے۔ اس تذکرے سے اس زمانے کی سوسائٹی اور شاعروں کے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بیانات قابل وثوق نہیں۔ اور عبارت ضرورت سے زیادہ پر تکلف۔ پر تصنع اور مسجع مقفیٰ ہے۔

مولوی امانت اللہ ان کا تخلص شیدا تھا۔ انہوں نے اخلاق جلالی کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں جامع الاخلاق کے نام سے کیا۔ ۱۸۰۶ء میں ہدایت الاسلام عربی اور اردو میں لکھی۔ جس کا ترجمہ گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں کیا۔ اور ۱۸۱۵ء میں صرف اردو کے نام سے صرف و نحو اردو کو منظوم کیا۔

اس عہد کے دیگر منشی اور نثار سید جعفر علی رواں لکھنوی۔ افتخار الدین شہرت۔ عبدالکریم خاں کریم دہلوی۔ مرزا ہاشم علی خاں عیاں۔ مرزا قاسم علی ممتاز۔ میر عبداللہ مسکین۔ مرزا جان طپش۔ مولوی خلیل علی خاں اشک۔ اور مرزا محمد فطرت وغیرہ بھی اس زمانہ کے مشہور نثار اور منشی تھے اشک نے ۱۸۰۹ء میں اکبرنامہ کا ترجمہ واقعات اکبر کے نام سے کیا جو شائع نہیں ہوا۔ طپش نے اردو

محاورات پر ایک کتاب اور ایک طویل مثنوی بہار دانش کے نام سے لکھی۔ ان کا کلیات بھی فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

تراجم قرآن اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور اُن کے صاحبزادے

مولٰنا شاہ ولی اللہ اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں گذرے ہیں۔ وہ دہلی کے مشہور محدث اور صوفی تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ازالۃ الخفاعن سیرۃ الخلفا ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

ان کے بڑے بیٹے مولٰنا شاہ عبدالعزیز زہد و تقویٰ اور علم و فضل میں اپنے والد سے کم نہیں تھے۔ ان کا ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۳ء) میں انتقال ہوا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ھ تا ۱۲۳۳ھ) (۱۷۴۹ء تا ۱۸۱۷ء) بھی بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر (۱۱۶۷ھ تا ۱۲۳۰ھ) (۱۷۵۳ء تا ۱۸۱۴ء) اپنے والد اور بھائیوں کی طرح ظاہری اور باطنی کمالات کے باعث مشہور تھے۔ انہوں نے ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں قرآن کا اُردو میں ترجمہ کیا جو نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن میں اُس کی بہت تعریف کی ہے۔ انہوں نے ایک تفسیر بھی موضح القرآن کے نام سے لکھی تھی۔ یہ تراجم اُس زمانے کے فارسی کے انحطاط اور اس انقلاب کا پتہ دیتے ہیں۔ جو اُردو میں رُونما ہونے والا تھا۔

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

مولوی عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ محدث کے پوتے تھے۔ اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے۔ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) میں سید احمد مجاہد بریلوی کے ساتھ قلعہ بالاکوٹ (پنجاب) پر جہاد میں گئے اور شہید ہو گئے۔ شاہ نصیر نے اس واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ ۔۔۔ نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان غا میں چوکڑی بھولے ۔۔۔ اگرچہ تھے دُم شملہ سے وہ شیر نیستانی

بعض لوگ ان کے مرید شاہ نصیر پر چڑھ آئے۔ ان دنوں مرزا خانی کوتوال شہر تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کو ان کے پنجے سے چھڑایا۔ رسالہ توحید۔ صراط مستقیم۔ تنویر العینین اور تقویۃ الایمان وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

ترتیب صرف و نحو و لغات اردو

کتب درسیہ اور تراجم کے ساتھ ساتھ صرف و نحو پر بھی پوری توجہ مبذول کی گئی۔ سب سے پہلے ہندوستانی گرامر ۱۷۱۵ء میں جان جوشوا کیٹلر نے تصنیف کی۔ وہ شاہ عالم اور جہاندار شاہ کے زمانے یعنی ۱۷۱۲ء میں ہالینڈ سے سفیر ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے آگرہ۔ دہلی اور لاہور کی بھی سیر کی تھی۔ ۱۷۱۶ء میں وہ اپنے ملک کی طرف سے ایران میں سفیر ہو کر گئے۔ انہوں نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت تیار کی۔ جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ کیٹلر صاحب نے تورات کے دس احکام اور لارڈز پریر کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا۔

۱۷۴۴ء میں جرمن کے پادری شلز نے ایک اور ہندوستانی گرامر "گرامٹیکا ہندوستانی کا" لاطینی میں تیار کی۔ اس میں ہندوستانی الفاظ انگریزی اور فارسی رسم الخط میں چھپے تھے۔ اسی سال مل نے ہندوستانی حروف تہجی اور ہندوستانی الفاظ پر ایک رسالہ لکھا ۱۷۴۸ء میں چھپے۔ اے فرٹز نے اسی مضمون کی ایک کتاب لکھی جسمیں ہندوستانی حروف تہجی کا دوسرے ملکوں کے حروف سے مقابلہ کیا۔ ۱۷۷۱ء میں اسی قسم کی ایک کتاب اٹالوی پادری کیسیانو بیلی گاٹی نے "الفاظ ٹیم برہمانکم" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں بھی ہندوستانی حروف ہندوستانی شکل میں چھپے۔ ۱۷۷۲ء میں ہیڈلی کی گرامر اور ۱۷۷۸ء میں پرتگالی میں "گرامٹیکا اندوستنا" چھپیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کا زمانہ تصنیف آیا جو ۱۷۸۷ء سے بیس سال تک جاری رہا۔ انہوں نے تقریباً پندرہ کتابیں صرف نحو۔ علم الالسنہ۔ لغات تراجم اور امثال وغیرہ کی تصنیف کیں۔ نیز ان کی نگرانی اور فرمائشوں پر بے شمار عمدہ اور دلچسپ ادبی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کو اس عہد کی تصنیفات کی روح رواں کہنا بالکل درست ہے۔ وہ نہایت قابل خلیق اور متواضع انگریز تھے۔ ملک کے ہر گوشے سے انکی قدردانی کی شہرت سن کر علماء اور فضلا کلکتہ میں جمع ہو رہے تھے۔ اور وہ حسب مراتب ان کی تنخواہ مقرر کر کے اپنے کالج سٹاف میں داخل کر لیتے تھے۔ انکی سب سے زیادہ مشہور تصنیف انگریزی ہندوستانی ڈکشنری اور ہندوستانی گرامر ہے۔

۱۸۰۸ء میں کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ترتیب دی۔ مولوی امانت اللہ نے ۱۸۱۰ء میں ہندوستانی صرف و نحو کو اردو میں "صرف اردو" کے نام سے نظم

کیا۔ ۱۸۱۳ء میں جان شیکسپیئر کی ہندوستانی گرامر اور ۱۸۱۷ء میں ان کی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ کپتان پرائس اور یٹس۔ گارسن ڈیٹاسی۔ ڈنکن فاربس نے زبان اور لغت کے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں۔ سر ولیم ماتیر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے بانی تھے۔ انہوں نے اور ڈاکٹر فیلن نے گرامر اور لغت کی کتب تصنیف کیں۔ پلیٹ کی گرامر ۱۸۷۴ء میں اور ڈکشنری ۱۸۸۴ء میں اور پادری کریون کی ڈکشنری ۱۸۸۱ء میں چھپیں۔ جو طلبا کے لئے از حد مفید تھیں۔

ہندوستانیوں کے مرتب کردہ لغات و کتب دیگر

ہندوستانیوں میں سب سے پہلے انشاء اور قتیل نے مل کر اردو صرف و نحو "دریائے لطافت" کے نام سے ۱۸۰۲ء میں لکھی۔ جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی۔ منشی محمد ابراہیم نے اردو کی صرف نحو تحفہ الفنسٹن ۱۸۲۳ء میں لکھی۔ مولوی احمد علی دہلوی نے اردو صرف و نحو پر رسالہ چشمۂ فیض ۱۸۴۵ء میں مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدائق البلاغت ۱۸۴۹ء میں منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی۔ شا علی بیگ۔ فیض اللہ خاں اور محمد احسن کے رسالہ جات صرف و نحو مولوی محمد حسین آزاد کی جامع القواعد۔ جلال کا گلشن فیض مطبوعہ ۱۸۸۰ء کہ اردو و ہندی الفاظ کی تحقیق کی لغت ہے۔ سب اسی زمانہ میں لکھی گئیں۔

زمانہ حال کی تصانیف میں امیر مینائی کی ناتمام امیر اللغات۔ مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ۔ مولوی نور الحسن نیر کاکوروی کی نور اللغات قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے ایک قواعد اردو ترتیب دی ہے۔ مگر پھر بھی ابھی ایک مکمل گرامر کی جگہ خالی ہے۔ اور ایک جامع لغات کی ضرورت ہے۔ جو امیر اللغات کی تکمیل سے پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے کسی دریا دل رئیس کی سرپرستی اور امداد کی ضرورت ہے[1]۔

اردو کی ترقی کے لئے عیسائی پادریوں کے کارنامے

سب سے پہلے بائبل کے ترجمے شلر اور کالنبرگ نے ۱۸۴۸ء میں کئے مرزا محمد فطرت اور کالج کے دوسرے منشیوں نے عہد جدید کا ترجمہ اردو میں کیا۔ جو ڈاکٹر ہنٹر کی نظر ثانی کے بعد ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح سیرام پور کے پادریوں نے

[1] خواجہ عبدالمجید مرحوم نے جامع اللغات ... کی کوشش سے تیار کی ...

بائیبل کے اُردو ہندی میں ترجمے کئے۔ پادری مارٹن نے عہد جدید کا ترجمہ ۱۸۱۹ء میں یونانی سے اُردو میں کیا۔ جو مرزا محمد فطرت کی نظر ثانی کے بعد نکلا۔ پوری بائیبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے ۱۸۱۹ء میں شائع کر دیا تھا۔ پادری لوگ اپنے دین کی اشاعت کے لئے ہندوستانی زبان میں تحریر و تقریر کرتے تھے۔ اس لئے ان کی تبلیغ سے بھی زبان کو بہت وسعت اور ترقی ہوئی ٭

باب ۱۶

نثر اُردو کا دور متوسط و جدید

مطبوعات لکھنؤ — اگرچہ نثر اُردو کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی۔ مگر لکھنؤ جو دہلی کی تباہی کے بعد اُردو کا مرکز بن گیا تھا۔ خدمات زبان میں کسی طرح پیچھے نہیں رہا۔ بستان حکمت۔ کلیلہ دمنہ۔ گل بکاولی۔ گلشن نوبہار۔ گل و صنوبر۔ نورتن وغیرہ بے شمار کتابوں نے جامۂ طباعت لکھنؤ ہی میں پہنا ٭

نواب فقیر محمد گویا متوفی ۱۸۵۰ء — نواب صاحب لکھنؤ کے ایک نامور رئیس اور شاہی فوج کے رسالدار تھے۔ حسام الدولہ خطاب تھا۔ اور گویا تخلص کرتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ اور خواجہ وزیر سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ ان کا دیوان ان کے مرنے کے ایک سال بعد منشی نولکشور نے چھپوایا تھا۔

ان کی مشہور تصنیف بستان حکمت انوار سہیلی کا ترجمہ ہے۔ جس کو احباب کے اصرار پر انہوں نے تیار کیا تھا۔ اس سے پہلے اس کتاب کا اُردو ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ بستان حکمت لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ موقعہ بموقعہ مترجم نے اپنی قابلیت سے بھی کام لیا ہے۔ اس میں عربی۔ فارسی الفاظ بکثرت ہیں۔ زبان بھی سلیس نہیں۔ عربی الفاظ و امثال نے عبارت کو بے مزہ

اور مشکل بنا دیا ہے۔ مگر یہ بات قابلِ تعریف ہے۔ کہ فسانۂ عجائب کی طرح مقفٰی اور مسجع نہیں۔ ایک زمانہ میں یہ کتاب بہت مقبول تھی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور
۱۲۰۱ھ تا ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء

سرور لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور نثار تھے۔ ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ انہوں نے لکھنؤ میں پرورش اور تعلیم پائی تھی۔ عربی فارسی خوب جانتے تھے۔ اور اپنے زمانہ کے مشہور خوشنویسوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس فن میں حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے۔ موسیقی بخوبی جانتے تھے۔ فنِ شعر میں میر سوز کے شاگرد آغا نوازش کے شاگرد تھے۔ حریف ظریف اور خوبصورت آدمی تھے۔ شرف الدین اور مرزا غالب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔

کہا جاتا ہے۔ وہ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ سے جلاء وطن ہو کر کانپور گئے تھے۔ کانپور سے وہ سخت بیزار تھے۔ انہوں نے فسانۂ عجائب وہیں لکھی۔ اس کے دیباچے میں میر امن پر سخت حملے کئے ہیں جن کا جواب بھی معقول دیا گیا ہے۔

۱۸۴۶ء میں سرور کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور اس سال واجد علی شاہ نے پچاس روپے ماہوار پر ان کو درباری شعرا میں داخل کر لیا۔ ۱۸۴۷ء میں انہوں نے بادشاہ کے حکم سے شمشیر خانی کا اردو ترجمہ سرورِ سلطانی کے نام سے کیا۔ اور اس اثناء میں شررِ عشق اور شگوفۂ محبت۔ بیگم بھوپال اور امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائشوں پر لکھے۔

۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ وہ اس بربادی سے تباہ حال ہو گئے۔ کچھ دنوں سید قربان علی اور منشی شیو پرشاد نے امداد کی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔ تھوڑی مدت بعد سرور کو مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ نے بنارس بلا لیا۔ جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ اس زمانہ میں سرور نے گلزارِ سرور اور شبستانِ سرور وغیرہ چھوٹی چھوٹی نظم و نثر کی کتابیں لکھیں۔

سرور کو مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ الور نے بھی بلایا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے ان کو سونے کے

گڑوں کی جوڑی دی تھی۔ سرور کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ دلّی۔ لکھنؤ۔ میرٹھ اور راجپوتانے بھی گئے تھے۔ ایک مرتبہ ان پر قتل کا الزام بھی لگایا گیا تھا۔

۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لئے کلکتہ گئے۔ جہاں واجد علی شاہ سے بھی ملے۔ کلکتہ میں آنکھوں کا علاج ناکام رہا۔ پھر لکھنؤ آکر ایک ہندوستانی ڈاکٹر کے علاج سے صحت ہوئی۔ اس کے بعد وہ بنارس گئے جہاں ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا۔

فسانۂ عجائب سرور کا سب سے بڑا کارنامہ فسانۂ عجائب ہے۔ یہ معمولی حُسن و عشق کا افسانہ ہے جس کے مضمون اور واقعات میں کوئی جدّت نہیں۔ عبارت اس زمانہ کی طرز کے مطابق مقفیٰ اور مسجع ہے۔ اور تکلف و تعقید بیجا ہے۔ اس کتاب کو زمانۂ حال کے اُصول سے جانچنا سخت غلطی ہے۔ کیونکہ مصنّف پُرانی طرز کے آدمی تھے۔ اور اس زمانہ میں یہی رنگ مقبول خاص و عام تھا۔

فسانۂ عجائب کا دیباچہ بھی نہایت قابل قدر ہے۔ اس میں اس زمانہ کی لکھنؤ کی سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اصل کتاب میں بڑی خامی یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ مصنّف کیرکٹر کو کامیابی سے بیان نہیں کر سکے۔ انہوں نے مناظر تو بہت عمدہ کھینچے ہیں۔ لیکن وہ ان میں جان نہیں ڈال سکے۔ ہر چیز خاموش نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ عالم پر بیہوشی طاری ہے۔

سرور نے فسانۂ عجائب میں جذبہ حُبّ وطن سے متاثر ہو کر اہل دہلی پر چوٹیں بھی کی ہیں جن کا جواب افسانۂ سروش سخن" میں خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی نے ۱۸۶۰ء میں دیا ہے محمد جعفر علی شیون لکھنوی نے ۱۸۸۲ء میں "طلسم حیرت" لکھ کر سروش سخن کے مطاعن کا بھی جواب دیا تھا۔

سرشار اور سرور سرشار نے مختلف کیرکٹر اور سوسائٹیوں کے نمونے دکھائے ہیں۔ اور ہر خاص و عام بات نہایت ظریفانہ انداز میں بیان کی ہے۔ جس سے رنگینی اور دلچسپی خوب پیدا ہو گئی ہے۔ برخلاف اس کے سرور کے ہاں سوسائٹی کے مرقعے کیرکٹر نگاری کے کرشمے نہیں ہیں۔ سرور دوران بیان میں ہر چیز پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن سرشار

ہر بات کی جزئیات تک بیان کر دیتے ہیں۔ شاید وہ بحیثیت ناولسٹ کے کیریکٹر نگاری اور تفصیل جزئیات کو مقدم سمجھتے ہیں۔

سرور کی تصانیف

سرور سلطانی۔ یہ شاہنامہ فردوسی کا ملخص ہے۔ طرز عبارت فسانۂ عجائب کی طرح مقفیٰ اور مسجع ہے۔ جو تاریخ کے لئے مناسب نہیں۔ اس میں ہندوستان کی تعریف قابل پڑھنے کے ہے۔ (۲) شرر عشق۔ اس میں سارس کی مادہ کا اپنے نر پرستی ہونا بیان کیا ہے (۳) شگوفۂ محبت۔ مہر چند کھتری کا پُرانا قصہ نئے انداز سے بیان کیا ہے (۴) گلزار سرور۔ فارسی کی حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ مذہبی رنگ کی کتاب ہے (۵) شبستان سرور۔ الف لیلہ کے چند قصّوں کا ترجمہ ہے مقبولیت عام کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے الف لیلہ کے ترجمے کئے ہیں منشی شمس الدین احمد نے بھی ۱۸۳۶ء میں مدراس میں حکایات الجلیلہ کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس میں صرف دو سو راتوں کی حکایتیں ہیں۔ دوسرا ترجمہ منشی عبدالکریم نے ۱۸۴۷ء میں فارسٹر کی انگریزی کی الف لیلہ سے کیا۔ جس کی زبان زیادہ سہل ہونے کی وجہ سے ادبی معیار سے گر گئی ہے۔ پھر منشی نولکشور کی فرمائش سے نسیم دہلوی۔ منشی طوطا رام شایاں اور منشی شادی لعل چمن نے چار حصّوں میں نظم میں ترجمہ کیا۔ ایک نثر کا ترجمہ منشی طوطا رام نے ۱۸۶۸ء میں شائع کیا اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں حامد علی نے ترجمہ کیا۔ پھر ۱۸۹۲ء میں شبستان حیرت کے نام سے میرزا حیرت دہلوی نے ناول کی طرز میں اس کا ترجمہ شائع کیا۔ (۶) ایڈورڈ ہفتم کی شادی کے موقعہ پر سرور نے "نثر نثرہ نثار" کے نام سے تہنیت نامہ لکھا۔ (۷) انشائے سرور یعنی سرور کے خطوط اُن کی خاص طرز میں ہیں۔

اُردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ

سرور اپنی خاص طرز تحریر میں قدیم نثاروں میں نہایت بلند مرتبے کے مالک ہیں۔ اگرچہ ان کی طرز تحریر پُر تکلّف اور پُر تصنع ہونے کی وجہ سے بعد میں متروک ہو گئی تھی۔ کیونکہ کاروباری دُنیا میں اس قسم کی رنگین مسجع اور مقفیٰ عبارت کا کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ سرور کی تصنیفات ان کے زمانے میں ادبی حلقوں میں نہایت مقبول و مرغوب تھیں اس لحاظ

سے اِن کی تصانیف اب تک قابل قدر ہیں۔ کہ ان سے اسوقت کی طرز تحریر اور سوسائٹی کے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ سرور خوشنویسی موسیقی اور شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ لیکن ان کی نثاری کے سامنے اور کمالوں نے فروغ نہیں پایا۔ ان کا دیوان نہیں ملتا۔ لیکن ان کے اشعار انکی کتابوں میں اکثر جا بجا ملتے ہیں۔ شاعری میں وہ دہلی کے متبع معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ لکھنؤ کے مبالغے اور تصنع ان کے ہاں بہت کم ہیں ÷

مرزا غالب بحیثیت نثار

پہلے ادبی دُنیا میں غالب شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ لیکن انکی تصانیف اُردو فارسی نے ان کو اُردو اور فارسی دونو کا بے مثل نثار ثابت کیا۔ ان کی نثر اُردو کی تصانیف زیادہ تر وہ خطوط رقعات۔ تقاریظ اور دیباچوں پر مشتمل ہیں۔ نیز تین مختصر رسالے لطائف غیبی۔ تیغ تیز اور نامہ غالب برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں ہیں۔ ایک ناتمام قصہ بھی ہے جو مرنے سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان سب میں ان کے وہ خطوط اور تقریظیں جو عود ہندی اور اُردوئے معلیٰ کے نام سے چھپی ہیں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ اور وہ ان کے خاص رنگ میں ہیں ÷

اُردوئے معلیٰ اور عود ہندی

مرزا غالب نے اپنے خطوط میں لکھا ہے۔ کہ وہ ۱۸۵۰ء تک فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اُردو میں خط لکھنے شروع کئے۔ جو انکے مخصوص رنگ میں ہیں۔ انہی پر جدید اُردو نثر کی بنیاد قائم ہوئی۔ آجتک بہت سے مشہور ادیبوں اور نثاروں کے خطوط چھپ چکے ہیں۔ لیکن کوئی بھی ان کی نقل میں کامیاب نہیں ہُوا۔

مرزا کے رنگ میں کسی قسم کا تکلّف اور تصنع نہیں ہے۔ عبارت کی روانی اور سلاست سے معلوم ہوتا ہے۔ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ہرچند ان کی عبارت بے تکلف اور روزمرّہ ہے۔ مگر پھر بھی ابتذال اور سوقیت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک ادبی شان نمایاں ہے۔ انکی تحریریں میں باتوں کا مزہ آتا ہے۔ بعض خطوط بالکل مکالمہ کی صورت میں ہیں۔ بعض میں مکتوب الیہ کو غائب تصوّر کر لیتے ہیں۔ اور اظہار مطلب ایسی سحر آفرینی سے کرتے ہیں۔ کہ دل لطف اُٹھاتا ہے۔ حقیقت میں

مرزا کا بڑا بھاری احسان یہ ہے۔ کہ انہوں نے نثر اُردو کو خشکی اور بدمزگی کے الزام سے بچا لیا۔

خطوط نویسی میں مرزا نے یہ خاص جدّت پیدا کی تھی۔ کہ لمبے لمبے بے معنی القاب لکھنے ترک کر دیئے تھے۔ وہ پنج آہنگ میں لکھتے ہیں "خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے۔ کہ جب خط لکھنے کیلئے قلم دکاغذ اُٹھاتا ہوں۔ تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں۔ اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب کا پُرانا طریقہ اور شُکر و شکوہ و شادی و غم کا قدیم رویہ میں نے بالکل اُٹھا دیا"۔

مرزا کے خطوط کے نمونے

(۱) آہا ہا میرا پیارا مرزا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رامپور ہے دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے۔ وہ اور کہاں ہے۔

(۲) آؤ میاں سیّد زادہ آزادہ دلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے۔ حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے۔

(۳) میری جان تو کیا کہہ رہا ہے بنیے سے سیانا سو دیوانا صبر و تسلیم۔ توکّل و رضا شیوہ صُوفیا کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا"۔

(۴) سیّد صاحب اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہمزبان کر لینا۔

مرزا کی اس جدّت سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ پُر تکلف طرز تحریر کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اگرچہ شروع شروع میں ان کے معاصرین اس بے تکلّفانہ طرز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن زمانے کے امتداد کے ساتھ یہ طرز مطبوع خاص و عام ہوگئی۔ حالیؔ۔ سرسیّد۔ مولوی ذکاءاللہ۔ آزاد۔ امیر مینائی اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کے خطوط چھپ چکے ہیں لیکن مرزا کی تحریر کی سادگی۔ دلکشی۔ شوخی ظرافت۔ جذبات نگاری اور اظہار مافی الضمیر میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں۔

مرزا نے خطوط میں اکثر اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لئے ان سے ان کی خود نوشت سوانحعمری مرتّب کی جا سکتی ہے[1]۔ ان کے خطوط ان کی جذبات زندگی کی بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ جن سے

[1] غلام رسول مہر اڈیٹر انقلاب نے حال میں مرزا کے خطوط اور کلام وغیرہ سے نہایت شاندار سوانحعمری تیار کی ہے۔

احباب اور معاصرین کے تعلقات، ان کے نظریئے۔ اور قدیم و جدید شعرا کے متعلق ان کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مذاق بھی سب سے نرالا ہے۔ اہل یورپ میں بھی اس قسم کی لطیف ظرافت مفقود ہے۔ ان کی ظرافت کی لطافت اور نزاکت کا پرتو ایڈیسن میں کسی قدر پایا جاتا ہے۔

مرزا کی تدیمی طرز تحریر مرزا اگرچہ خطوط میں سادگی اور سلاست عبارت کے دلدادہ تھے لیکن رواج زمانہ کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھتے تھے۔ مولانا حالی اسکی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ تقریظیں لکھوانے والے حضرات بغیر ان تکلفات کے خوش نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے مرزا مجبور تھے۔

نمونہ تقریظ سُبحان اللہ خدا کی کیا نظر فروز صنعتیں ہیں۔ تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں۔ جو حدائق العشاق فارسی زبان سے عبارت اُردو میں نگارش پاتا ہے...... اس مقام پر یہ ہیچ میرز جو موسوم بہ اسد اللہ خاں اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے۔ خدائے جہان آفرین سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہاں اے صاحبان فہم و ادراک سرورسہ بیان کا اُردو کی نثر میں کیا پایہ ہے۔ اور اسی بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گرانبہا پیرایہ ہے۔ مجھ کو دعویٰ تھا۔ کہ انداز بیان اور شوخی تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹا دیا۔ یہ وہ تحریر ہے۔

کتب و رسائل اسلامی سے اُردو کو تقویت مولوی سید احمد شہید بریلوی اور ان کے اُستاد شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی کوششوں سے اشاعت وہابیت کی زبردست تحریک شروع ہوئی۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت سی کتب اور رسائل لکھے گئے۔ اگرچہ وہ ہندی رنگ کے تھے۔ لیکن ان کی زبان صاف اور سلیس تھی۔ اس لئے یہ تحریک زبان کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔

مولوی سید احمد شہید بریلوی مولوی صاحب ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علوم دینیہ کی تکمیل شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی خدمت میں کی۔ وہ بہت قابل اور فصیح بیان تھے

ان کی بصیرت افروز تقریریں سُن کر لوگ بکثرت مرید ہوتے تھے۔ پہلے دہلی میں تبلیغ کرتے رہے پھر ۱۸۲۰ء میں کلکتہ گئے اور وہاں سے ۱۸۲۲ء میں حج کو چلے گئے۔ پھر قسطنطنیہ گئے۔ اور چھ برس تک ٹرکی کی سیاحت اور اپنے ہمخیالوں کی جماعت پیدا کرتے رہے۔ اسکے بعد دہلی آئے۔ یہاں کے مسلمانوں کی حالت دیکھ کر ان کے دل میں اصلاح کا خیال پیدا ہُوا۔ وہ نہایت پُر جوش مسلمان تھے۔ انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں مولوی اسمٰعیل کو ساتھ لے کر پشاور گئے۔ کہتے ہیں ان کے مرید ایک لاکھ سے زائد تھے۔ اپنے مشن میں اتنے کامیاب ہو گئے تھے۔ کہ سارا پشاور ان کے قبضے میں تھا۔ لیکن اُصولوں کی سختی کی وجہ سے افغان وعدے سے پھر گئے۔ یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب اٹک کے اس پار پہاڑوں میں جا چھپے جہاں ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے ایک دستہ کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالعزیز نے قرآن کی "تفسیر عزیزی" فارسی میں لکھی تھی۔ جس کا اب اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان کے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور مولوی سیّد عبداللہ نے اس کو ہگلی میں ۱۸۲۹ء میں چھپوایا۔ مولوی سید احمد شہید کی تنبیہ الغافلین انہی مولوی عبداللہ نے اُردو میں ترجمہ کر کے ۱۸۳۰ء میں ہگلی سے شائع کی۔ اسی طرح مولوی اسمٰعیل صاحب اور مولوی سید احمد صاحب کی تصانیف اس زمانہ میں اشاعت دین کے لئے لکھی گئی تھیں۔ لیکن زبان اُردو کو ان سے بہت تقویت پہنچی۔

چھاپہ کی ابتدا چھاپے نے بھی اُردو کی اشاعت اور ترقّی میں بہت مدد دی۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک چھاپہ خانہ کھلا جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور ان کے منشیوں کی تصانیف چھپتی تھیں۔ مگر ان کی طباعت میں روپیہ بے انتہا خرچ ہوتا۔ اور وصول کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس مطبع کو بند کرنا پڑا۔ اس زمانے کے ٹائپ کے مروّجہ حروف بھی نہایت بھدّے اور بدنما تھے۔

اسی زمانے میں سیرام پور (بنگال) کے پادریوں نے بھی ایک پریس جاری کیا۔ جس میں

مختلف ہندوستانی زبانوں کی کتابیں چھپتی تھیں۔ ۱۸۱۲ء میں اس مطبع کو آگ لگ گئی اور اکثر کتابیں جل گئیں۔ ۱۸۳۷ء میں ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ دہلی میں قائم ہوا۔ اس میں پرانی کتابیں انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کے ترجمے اور مختلف رسائل چھپتے تھے غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں بھی ایک ٹائپ کا مطبع صرف کثیر سے کھولا گیا۔ جس میں پہلے ہفت قلزم اور بعد میں مناقب الحیدریہ (عربی)، محامد حیدری (فارسی)، گلدستہ محبت (فارسی)، پنجسورہ بخط طغرا تاج اللغات (عربی) وغیرہ چھپیں۔

۱۸۳۰ء میں مسٹر آرچر نے کانپور میں لیتھو کا پریس کھول رکھا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ آکر انہوں نے ایک اور مطبع کھولا۔ اس میں ۱۸۴۳ء میں سائنس کے فوائد پر ایک کتاب چھپی۔ جو لارڈ برو ہم کی کتاب کا ترجمہ تھی۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس اردو میں ہے۔ سب سے پہلی لکھنؤ کی لیتھو کی کتاب شرح الفیہ تھی۔ ۱۸۴۰ء میں لکھنؤ میں تقریباً بارہ چھاپے خانے کھل گئے تھے۔ جن میں مطبع میر حسن۔ اور مصطفائی بہت مشہور تھے۔ ۱۸۴۹ء میں منشی کمال الدین حیدر میر منشی احمد شاہی نے خاندان شاہی کی تاریخ لکھی جو بادشاہ کو پسند نہ آئی۔ اس لئے کتاب کی طباعت روک دی گئی۔ اور مطبع کے بہت سے کارکن کانپور چلے گئے۔

اس عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے۔ کہ منشی نولکشور نے لکھنؤ میں اپنا مطبع کھولا۔ جس کی بدولت عربی فارسی سنسکرت اور ہندی کی بہت سی نایاب کتب طبع ہوئیں۔ اس مطبع نے ملک کے تمام طبقوں کو یکساں فائدے پہنچائے۔ اور اس کی بدولت تعلیم و ترقی میں بہت ارزانی ہوئی ؞

اردو رسائل اور اخبارات طباعت کی آسانیوں سے اردو میں رسائل۔ جرائد اور اخبارات بکثرت نکلنے لگے۔ گویا ہندوستانیوں پر دنیا بھر کی اقتصادی اور تمدنی معلومات کا دروازہ کھل گیا۔ اور ترقی کی راہیں فراخ ہوگئیں۔ انگریزی کتابوں کے تراجم نے یورپ کی طرز انشا پردازی کو اردو دانوں کے سامنے پیش کیا۔ جس سے نثر و نظم میں انقلاب آنے لگا۔ ۱۸۳۲ء میں سرکاری دفاتر کی زبان فارسی سے اردو ہوگئی۔ فارسی عربی وغیرہ کی مروجہ اصطلاحات اردو میں آگئیں۔ جس سے

زبان میں وسعت ہو گئی۔

مغربی طرز تحریر سے سب سے زیادہ فائدہ یہ پہنچا کہ مسجع اور مقفیٰ عبارت موقوف ہو گئی اور بجائے الفاظ کے نفس مضمون پر زور طبع صرف ہونے لگا۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے جو درسی ضرورت کے لئے کئے گئے۔ ان کی زبان نہایت صاف اور سلیس رکھی گئی۔ اُردو فارسی سے بے نیاز ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی۔ اسوقت سر سیّد نے اپنے مساعی جمیلہ سے اُردو زبان کی بہت گرانقدر خدمات انجام دیں ٭

سر سیّد احمد خاں ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء	جواد الدولہ۔ عارف جنگ۔ سر سیّد احمد خاں بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ مسلمانوں کے مصلح اعظم۔ جلیل القدر مدبّر۔ فلسفی اور مصنّف تھے۔

ان کی قابلیّت اور مقناطیسی اثر سے ہندوستان کے بہت بڑے بڑے علما و فضلا ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان کے ادبی کارناموں سے اُردو ادب مالا مال ہُوا۔ اور وہ ایک خاص طرز تحریر کے موجد بھی تھے۔

سیّد احمد دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور خاندان کے ممبر تھے۔ ان کے بزرگ عرب سے ایران ہوتے ہوئے شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور یہاں آتے ہی ممتاز عہدے پائے۔ عالمگیر ثانی نے سیّد صاحب کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ جو حُسنِ اتّفاق سے سیّد صاحب کو بھی ملا۔ سیّد صاحب کے والد میر تقی نہایت قانع بزرگ تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو عہدۂ وزارت دیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ سیّد صاحب کو ان کی والدہ عزیز النساء بیگم نے تعلیم و تربیت دی تھی۔ انہوں نے خوش قسمتی سے غالب۔ صہبائی۔ آزردہ۔ شیفتہ اور مومن وغیرہ کا زمانہ پایا تھا۔ وہ غالب کو چچا کہا کرتے تھے۔ اور ان سے بہت ارتباط رکھتے تھے۔

سیّد صاحب ۱۸۳۶ء میں دہلی میں سر رشتہ دار ہو گئے۔ ۱۸۳۹ء میں نائب میر منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہوئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دلّی کے صدر امین رہے اسی زمانہ میں انہوں نے آثار الصنادید لکھی۔ جس میں دہلی کے آثار قدیمہ علماء فضلا و شعرا کا ذکر ہے

اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اور فرنچ میں بھی ہو چکا ہے۔ اس کے بعد سید صاحب نے جلائے القلوب۔ تحفہ حسن۔ تحصیل فی جرح السائل۔ فوائد الافکار۔ قول متین۔ کلمۃ الحق۔ راہ سُنت۔ سلسلۂ ملوک ہند۔ ترجمہ کیمیائے سعادت وغیرہ تصنیف کیں۔

۱۸۵۵ء میں سید صاحب بجنور تبدیل ہو گئے۔ جہاں تاریخ بجنور لکھی۔ اور آئین اکبری کی تصحیح اور تحشی بھی کی۔ غدر ۱۸۵۷ء کی خدمات کے صلے میں سید صاحب کو ایک علاقہ دیا گیا۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۵۸ء میں "بغاوت ہند" کے نام سے ایک پمفلٹ اور "وفادار مسلمانان ہند" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۶۰ء میں ان کی تفسیر بائیبل شائع ہوئی۔ جس کو پُرانے لوگوں نے ناپسند کیا۔ لیکن اہل یورپ نے اس کی بڑی قدر کی۔

۱۸۶۲ء میں سید صاحب غازی پور بدل کر آئے۔ جہاں انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ ان کا مقصد اہل یورپ کے خیالات سے اہل ہند کو واقف کرنا تھا۔ ڈیوک آف آرگائیل اس کے پیٹرن (مربی) اور گورنر پنجاب و بنگال اس کے وائس پیٹرن تھے۔ ایک زمانہ میں یہ سوسائٹی بہت مقبول تھی۔ اس کے ممبروں نے زراعت فلاحت اور اقتصادیات پر بڑے کار آمد رسالے لکھے۔

۱۸۶۴ء میں سید صاحب علی گڑھ آئے۔ اور ان کی سوسائٹی بھی ان کے ساتھ آئی ۱۸۶۱ء میں انہوں نے ایک انگریزی سکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۴ء میں اسی قسم کا ایک اور سکول غازی پور میں قائم کیا تھا۔ اور مختلف مقامات پر انگریزی تعلیم اور اس کے فوائد پر لیکچر دیئے تھے۔

۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی اور اپنی سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ نکالا۔ جس میں ان کے اپنے مضامین نکلتے تھے۔ اور اچھے اچھے مضامین انگریزی اخباروں سے ترجمہ ہوتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ان کا تبادلہ بنارس کا ہو گیا۔ لیکن ان کی تعلیمی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ اس عرصہ میں انہوں نے گورنر جنرل کو ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے میموریل بھیجا جس سے ہمدردی ظاہر کی گئی۔ ۱۸۶۹ء میں انہوں نے "رسالہ احکام

طعام با اہل کتاب" لکھا جس سے مذہبی لوگوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور سب ان کے خلاف ہو گئے۔
۱۸۶۹ء میں وہ اپنے بیٹے مسٹر محمود (جو بعد میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے) کے ساتھ انگلستان گئے۔ وہاں کے تعلیمی تمدنی حالات دیکھنے کے بعد ان کے دل میں آکسفورڈ اور کیمبرج کالجوں کی شان کا رہائشی کالج ہندوستان میں کھولنے کا ارادہ ہوا۔ ولایت میں ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے سر ولیم میور کی لائف آف محمدؐ کا نہایت دلیرانہ جواب دیا تھا۔ وہ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان آئے۔ اور اپنا ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس میں مذہبی تمدنی اور تعلیمی مضامین نکلتے تھے۔ جن کے مطالعہ سے مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں وسعت اور ترقی ہوئی۔ اور ملاؤں کا اقتدار کم ہو گیا۔ اسی زمانہ میں سر سید نے قرآن کی تفسیر لکھی جس میں بائبل کے قصص سے بعض باتوں پر روشنی ڈالی۔ دوزخ بہشت اور معراج پر غیر اقوام کے اعتراضات کا جواب دیا۔ اور ضعیف اور غیر معتبر احادیث سے احتراز کی ہدایات کیں۔ اسی پرانے خیالات کے ملاؤں نے سر سید پر کفر۔ الحاد۔ نیچری کے فتوے لگائے۔ بہت سے اخبارات اور رسائل ان کے خیالات کا خاکہ اڑانے کے لئے نکالے گئے۔ اخبار اودھ پنچ میں ان کے خلاف ہمیشہ مضحکہ خیز مضامین نکلتے رہے۔ لیکن سر سید پر ان کا کچھ اثر نہ پڑا۔ ۱۸۷۶ء میں وہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ اور بقیہ عمر اپنے محبوب کالج کی ترقی میں صرف کر دی۔ ۱۸۹۸ء میں ایک طویل اور کامیاب زندگی بسر کر کے اس دنیا سے راہی ملک عدم ہوئے۔

سر سید کی طرز تحریر اردو جرائد نگاروں میں سر سید کا مرتبہ بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ان کی طرز تحریر زوردار صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں محض نفس مضمون پر زور دیا گیا ہے۔ سید صاحب قواعد صرف و نحو اور اصول انشا پردازی کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے اسی اجتہاد نے ان کی شہرت اور قابلیت کو چار چاند لگائے۔ ان کی طرز جدید نے بیدل اور ظہوری کی مسجع اور مقفیٰ طرز تحریر کو ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں بہت خوبیاں ہیں۔ سادہ اور سلیس عبارت لکھنے میں وہ ایسے مشاق

تھے۔ کہ ہر قسم کے دقیق ترین مضامین کو نہایت بے تکلفی اور سادگی سے لکھ دیتے تھے۔ مولٰنا حالی ان کو نثر اُردو کا مورث اعلےٰ قرار دیتے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس بے تکلّف اور سادہ طرز تحریر کا نقشِ اوّل مرزا غالب کے ہاتھوں صُورت پذیر ہُوا تھا۔ جن کو سرسیّد چچا کہا کرتے تھے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ چچا غالب ہی سے سرسید نے یہ رنگ اُڑایا ہو۔

سرسیّد کے رفقا

سرسیّد نے اپنے حواریوں کی ایک نہایت پُرجوش جماعت پیدا کرلی تھی۔ جن نے ہندوستان میں اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ ان لوگوں میں نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ مولوی چراغ علی۔ منشی ذکاء اللہ۔ مولٰنا حالی۔ شبلی نعمانی۔ مولانا نذیر احمد اور مولوی زین العابدین اپنے اپنے فن کے اُستاد تھے۔ ان تمام بزرگوں کی کوششیں مسلمانوں کی اصلاح اور ترقّی کے لئے وقف تھیں۔

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

محسن الملک نواب سیّد مہدی علی خاں بہادر اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ معمولی تعلیم کے بعد دس روپے ماہوار پر کلرک ہوئے۔ ترقّی کرکے ۱۸۵۷ء میں اہلمد پھر سررشتہ دار اور ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہوئے۔ اپنی خدمات کو نہایت قابلیّت سے انجام دینے کے علاوہ قانون مال اور فوجداری پر دو مشہور کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کا مقابلے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۷ء میں مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ انکی شہرت سُن کر سرسالار جنگ اوّل نے ان کو ۱۸۷۴ء میں حیدرآباد بُلایا اور انسپکٹر جنرل مالیات مقرر کیا۔ محکمۂ بندوبست میں مفید اصلاحیں کرنے کے علاوہ انہوں نے بجائے فارسی کے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ وہ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکرٹری اور ۱۸۸۴ء میں فنانشل اور پولٹیکل سکرٹری ہوئے۔ اور سرکار نظام سے محسن الدولہ محسن الملک میر نواز جنگ کا خطاب پایا۔ انہوں نے سفر انگلستان بھی کیا۔ آخر کار سیاسی سازشوں کے سبب آٹھ سو روپے ماہوار پر پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے۔ جہاں بقیہ عمر تعلیمی خدمات میں صرف کی۔ وہ ۱۹۰۷ء میں فوت ہوئے۔ اور سرسیّد کے برابر علی گڑھ میں دفن ہوئے۔

سرسید سے ان کے قدیمی مراسم تھے۔ مشہور ہے۔ شروع شروع میں مداخلت فی الدین کی وجہ سے سرسید کو وہ بھی کافر سمجھتے تھے۔ لیکن تبادلہ خیالات سے ان کے مداح اور معاون ہو گئے تھے۔ ان کے بہت سے مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ جو مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی قابلیت اور درد قومی کی شہادت دیتے ہیں۔ مولانا حالی کا قول ہے کہ محسن الملک مسلمانوں کے دلوں کو ان کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا کر ابھارتے تھے۔ اور جو کچھ انہوں نے سرسید کی تائید میں لکھا۔ وہ بڑے استدلال اور استناد سے لکھا۔

محسن الملک کی طرز تحریر کی مولانا شبلی نے بہت تعریف کی ہے۔ ان کی عبارت نہایت زوردار ہوتی ہے مگر پھر بھی صفائی، حسن بیان اور سلاست میں فرق نہیں آتا۔ اگر کہیں پرانی طرز پر عبارت آرائی کرتے ہیں۔ تو وہ بھی بری معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ حسن عبارت اس سے بڑھ جاتا ہے۔ وہ پرتکلف عبارت زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ اکثر ان کے مضامین آسان اور سلیس اردو میں ہوتے تھے۔ ان مضامین کے علاوہ "آیات بینات" ان کی مذہبی رنگ کی تصنیف ہے۔

نواب وقار الملک
۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۷ء

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین شیخ فضل حسین کے بیٹے تھے۔ وہ ایک کمبوہ خاندان میں امروہہ کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلے کسی سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ زمانۂ قحط میں یہاں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں۔ رفتہ رفتہ سر رشتہ دار اور منصرم صدر الصدور ہو گئے۔ اور سرسید کے ماتحت کام کرتے رہے۔ پھر سرسید کی سفارش سے حیدر آباد میں ناظم دیوانی ہوئے۔ سازشوں کی وجہ سے ان کو بھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ مگر پھر بلائے گئے۔ سرکاری کاموں میں مفید اصلاحیں کرنے کے صلے میں ان کو وقار الدولہ وقار الملک کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بقایا عمر علی گڑھ کالج کی خدمات میں صرف کی۔

نواب صاحب خلافت علی گڑھ کے خلیفہ ثانی کہلاتے تھے۔ وہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور تہذیب الاخلاق کے مہتمم بھی ہو گئے تھے۔ انہوں نے تہذیب الاخلاق میں بڑے کارآمد

مضامین لکھے۔ ان کے علاوہ "فرینچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ جس میں منشی گلزاری لال اور لالہ گنگا پرشاد نے بھی کچھ حصّہ لیا تھا۔ یہ ترجمہ سرگذشت نپولین بوناپارٹ کے نام سے ۱۸۷۰ء میں نولکشور پریس میں چھپا تھا +

مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۵ء

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ۔ سہارنپور اور پنجاب میں سرکاری ملازم رہے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ جن میں چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ وہ معمولی تعلیم کے بعد ضلع بستی کے محکمۂ خزانہ میں بیس روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۲ء میں عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ کے ڈپٹی منصرم اور پھر سیتاپور کے تحصیلدار ہوئے ۱۸۷۷ء میں سرسید کی کوشش سے حیدرآباد گئے۔ جہاں محسن الملک کی ماتحتی میں نائب معتمد مال چار سو روپے ماہوار پر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ریونیو اور پولیٹیکل سکرٹری ہوئے اور پندرہ سو روپے ماہوار تک تنخواہ لی۔

مولوی صاحب نہایت عالم فاضل بیدار مغز غیر متعصب اور دیندار شخص تھے۔ کتب بینی کا اس قدر شوق تھا۔ کہ غیر ممالک سے کتابیں منگاتے تھے۔ ابتدا سے مذہبی رنگ کی مضمون نگاری کا شوق تھا۔ اکثر پادریوں سے کامیاب مناظرے کرتے تھے۔ ان کی تصانیف بہت ہیں۔ بہت سی کتابیں انہوں نے حیدرآباد کے انتظامی معاملات کے متعلق لکھیں۔ ان کے علاوہ تحقیق الجہاد مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں کیا کیا۔ اصلاحات کیں۔ رسولؐ برحق۔ اسلام کی دنیاوی برکتیں۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولوی صاحب کے وہ مضامین جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ زوردار اور دلنشین ہیں۔ لیکن ادبی شان کے نہیں۔ ان کے خطوط "مجموعہ رسائل" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ چند انگریزی اور اُردو پمفلٹ بھی ہیں۔ جو اخلاقی مسائل پر لکھے ہیں +

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۲۷ء تا ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا سنہ ولادت (ظہور اقبال ۱۲۴۵ھ) سے نکلتا ہے ان کے والد کا نام مولانا محمد باقر تھا۔ سکینہ بانو نے باقر علی اور

باقر حسین غلط لکھا ہے۔ مولانا محمد باقر شمالی ہند میں اپنی مضمون نویسی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ اُستاد ذوق کے دلی دوست تھے۔ اسی لئے مولانا آزاد نے شروع سے ذوق کی بابرکت صحبت میں پرورش پائی۔ آزاد عربی فارسی اپنے والد سے پڑھ کر دلی کالج میں داخل ہوئے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب (رلئے بہادر) مولوی نذیر احمد۔ مولانا آزاد۔ مولانا حالی۔ مولوی ذکاءاللہ وغیرہ سب کے سب ہم مکتب تھے۔ حسن اتفاق دیکھئے یہ سارے دوست شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز ہوئے اور ادبی دُنیا میں آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکے۔

شاعری کا مولانا آزاد کو شروع سے شوق تھا۔ اور ذوق کی صحبت نے اس پر جلا کی تھی۔ وہ ذوق کے ساتھ بڑے بڑے مشاعروں میں جاتے تھے۔ اور اُستادوں کے کلام سُنتے تھے۔ اُن پُرلطف صحبتوں کو ہنگامۂ غدر نے منتشر کر دیا۔ اسوقت انکی عمر ۲۷ یا ۲۸ برس کی تھی۔ آزاد کے والد غدر میں شہید ہوئے۔ اور آزاد کو دہلی سے نکلنا پڑا۔ اسوقت بھرے گھر میں سے انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ فقط اُستاد کے کلام کے پُرزوں کو باندھا اور گھر سے نکل گئے۔ ان کا اپنا کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ اور اُستاد کے کلام کو وہ حرز جان بنائے پھرے۔

سیکسینا صاحب نے لکھا ہے کہ ہنگامہ غدر فرو ہونے کے بعد مولانا آزاد کسی فوجی سکول میں ملازم ہو گئے تھے۔ یہ بیان بالکل غلط ہے۔ وہ امن ہونے کے بعد جگراؤں گئے۔ جہاں مولوی رجب علی کے پریس میں پہلے کچھ دنوں کتابت کی اور بعد میں چار سال تک منیجر رہے۔ جگراؤں سے وہ لاہور آکر ڈاک خانہ میں سررشتہ دار ہوئے۔ یہ بھی غلط ہے۔ کہ وہ محکمۂ تعلیم میں پندرہ روپے ماہوار پر سر شتہ دار تھے۔

پنڈت من پھول ان دنوں گورنر پنجاب کے میر منشی تھے۔ مولوی رجب علی کی معرفت مولانا آزاد کی ان سے مُلاقات ہوئی۔ اور پنڈت جی کے ذریعے سے میجر فلر سے ملنا ہوا جو محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ میجر صاحب علوم مشرقی سے بہت شوق رکھتے تھے۔ انہوں نے آزاد کی زباندانی اور قابلیت علمی کو بہت پسند کیا۔ اور ان کو ابتدائی درسی کتابیں لکھنے کو دیں۔ جن کو انہوں نے

بہت محنت سے تیار کیا۔ چنانچہ اُردو کی پہلی۔ دوسری۔ تیسری کتاب اور فارسی کی پہلی۔ دوسری تیسری اور قصص ہند۔ رسوم ہنداس زمانہ کی مشہور اور مقبول تصانیف ہیں۔

اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی مشرقی علوم کی ترویج کے لئے کھولی گئی تھی۔ اور اورنٹیل کالج اس کی علوم مشرقی کی درسگاہ تھی۔ محکمۂ تعلیم نے مولانا کی خدمات اس درس گاہ کے لئے حاصل کرلیں۔ اور مولانا ادھر سے ادھر آ گئے۔ بعد میں مولانا گورنمنٹ کالج میں فارسی عربی کے پروفیسر ہو گئے اور وہیں سے پنشن پائی۔

۱۸۶۵ء میں مولانا آزاد کسی سرکاری کام کے لئے پنڈت من پھول کی معیت میں ایک سفارتی مشن پر کابل اور بخارا گئے۔ پھر ایک دفعہ ۱۸۶۵ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۸۳ء میں ایران کی سیاحت کی، اس سفر نے جدید فارسی سے ان کو آشنا کیا۔ فارسی ادب سے پہلے ہی انکو خاص دلچسپی تھی۔ فارسی زبان کے متعلق تصانیف نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔

میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم ہوئے۔ ان کو اُردو زبان سے بہت دلچسپی تھی۔ مولانا آزاد نے ۱۸۷۴ء میں ان کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ ان کی سرپرستی میں ایک ایسا مشاعرہ قائم کیا جائے جس کا مقصد اُردو شاعری کی مبالغہ آمیزی اور تصنع کو حقیقت اور اصلیت سے بدلنا ہو۔ چنانچہ یہ مشاعرہ قائم کیا گیا۔ اس میں بجائے مصرعہ طرح کے نیچرل مضامین دیئے جاتے تھے۔ جن پر شعراء طبع آزمائی کرتے تھے۔ شروع شروع میں اس جدت کی سارے ہندوستان میں مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک سال بعد یہ مشاعرہ بند کرنا پڑا۔ لیکن مولانا آزاد ہمیشہ اپنے اس مشن کی تبلیغ کرتے رہے۔ آخر کار یہ رنگ ایسا مقبول ہوا۔ کہ پُرانی شاعری کو لوگ بھول گئے۔ اور اس جدید طرز میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اتالیق پنجاب (سرکاری اخبار) کا سب ایڈیٹر پچھتر روپے ماہوار پر مقرر کر دیا تھا۔ جس کے ایڈیٹر منشی پیارے لال آشوب تھے۔ اس اخبار کے بند ہونے کے بعد پنجاب میگزین نکلا۔ آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر ہوئے۔

۱۸۸۷ء میں مولانا آزاد کو ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقعہ پر تعلیمی اور سیاسی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اس زمانے میں اپنی پیاری بیٹی کی موت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے دماغ پر سخت صدمہ پڑا۔ سیر ایران کے دیباچے میں مولانا نے لکھا ہے۔ کہ میری بیٹی تصنیف و تالیف میں میرا دایاں ہاتھ تھی۔ اس پر سفر کی تکالیف اور دماغی محنت نے دماغ کو بالکل بیکار کر دیا۔ ۱۹۱۰ء میں دکھوں بھری دنیا سے تمام علائق قطعہ کر کے آزاد بالکل آزاد ہو گئے۔ لیکن آزاد کا یہ دیوانہ پن عام قسم کا دیوانہ پن نہیں تھا۔ بیس سال تک یہی حالت جذب ان پر طاری رہی لیکن اس حالت میں بھی ان کے قلم نے دم نہیں لیا۔ اس عرصے میں انہوں نے سینکڑوں چھوٹے بڑے رسالے لکھے۔ جن میں سے جانورستان اور سپاک نماک وغیرہ چھپ چکے ہیں۔

تصانیف | فارسی ریڈریں ۳ حصے۔ اُردو ریڈریں ۳ حصے۔ اُردو کا قاعدہ۔ قواعد اُردو۔ قصص ہند۔ جامع القواعد۔ رسوم ہند۔ آبِ حیات۔ نیرنگِ خیال۔ نظمِ اُردو۔ قند پارسی۔ نصیحت کا کرن پھول۔ سخندانِ فارس۔ دیوانِ ذوق۔ دربارِ اکبری۔ نگارستانِ فارس۔ سپاک و نماک۔ جانورستان۔ مجموعہ مکتوبات وغیرہ۔

ریڈریں اور سکول کی کتابیں | ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ یہ کتابیں مبتدیوں کے لئے لکھی تھیں۔ اور حقیقتاً وہ طلباء کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ اب تک سوائے بعض سکولوں میں رائج ہیں۔ قصص ہند میں تاریخ ہند کے مشہور واقعات نہایت زوردار عبارت میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب طلبا میں بیحد مقبول ہے۔ اس کے بے شمار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بچے اس کے دلچسپ واقعات سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ اور ادبی مذاق کے لوگ اس کی طرزِ تحریر کے عاشق ہیں۔ جملوں کا توازن۔ عبارت کی چستی۔ الفاظ کی شان۔ اور پُرزور طرزِ تحریر نے اس کو تاریخی کتابوں میں ممتاز حیثیت دی ہے۔

آبِ حیات | آبِ حیات مولانا کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اس میں زبان اُردو کی تاریخ

اور مشہور شعرا کے حالات ان کے کلام کے نمونے اور ان پر دلچسپ اور فاضلانہ تنقیدیں ہیں۔
یوں تو شعرا کے بہت سے تذکرے اس سے پہلے بھی موجود تھے۔ لیکن اس سے پہلے اس قسم کا تذکرہ کسی نے نہیں لکھا تھا۔ وہ ایک خزانۂ معلومات ہے۔ جس سے بعد کے مصنّفین نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ آبحیات لکھ کر مولانا نے اُردو ادب میں ایک جدید طرز تحریر کا اضافہ کیا جو شبلی حالی کے سادہ اور عاری از زیب و زینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ثقیل اور وزنی ہے۔ وہ زوردار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے۔ اس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں۔ جو احاطۂ بیان سے باہر ہیں۔ فقط دل ہی ان سے لُطف اُٹھاتا ہے۔ اس کے بعد سکسینا صاحب نے لکھا ہے۔
"یہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا۔ غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دی ہیں! اور بعض جگہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے واقعات میں کمی بیشی اور تبدیلی تک کو جائز رکھا ہے۔ اکثر جگہ جانب داری کا الزام بھی مصنف پر عائد ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے اُستاد ذوق کی بیحد تعریف۔ اور غالب کے کمالات سے نسبتاً بے پروائی۔ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا۔ انشا کے آخری زمانے کے عبرت انگیز حالات وغیرہ بعض بیانات اگر غلط نہیں تو مشکوک ضرور ہیں۔"
واقعی کچھ مدت سے یہ خیالات یقین کی حد کو پہنچ گئے تھے۔ لیکن حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی نے اُستاد گرامی حضرت پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کی زیر نگرانی تذکرہ میر قاسم چھپوایا ہے۔ اس تذکرہ کو پڑھنے سے یہ شکوک بالکل دُور ہو جاتے ہیں۔ کہ آزاد نے واقعات میں کسی قسم کی کمی بیشی کو روا رکھا ہے۔ تذکرۂ قاسم اس زمانہ کا نہایت معتبر اور قابل اعتماد تذکرہ ہے۔ جو آب حیات کا ماخذ ہے۔ اس کے علاوہ "تذکرہ شورش سے بھی آب حیات میں بہت سے واقعات نقل کئے گئے ہیں۔ جو ابھی تک کہیں سے برآمد نہیں ہوا۔ اس تذکرے کے چھپ جانے سے آبحیات کی تاریخی خوبیاں اور بھی نمایاں ہو گئی ہیں۔ اور اب کسی کو اس قسم کے اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں رہی۔

اُستاد ذوق کو غالب سے بڑھانا بھی کسی طرح قابل اعتراض نہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں شُہرت اور مقبولیت ذوق ہی کو حاصل تھی۔ یہی بات انیس اور دبیر پر بھی صادق آتی ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے کے حالات کا ہم صحیح جائزہ نہیں لے سکتے۔ اگر ہم ان باتوں میں دخل دیں تو ہمیں کچھ کا کچھ نظر آتا ہے۔ میر تقی کے متعلق جس قدر اعتراض تھے۔ ان کے جوابات بھی تذکرہ قاسم سے مل جاتے ہیں۔ انشا کی آخری حالت کی مجالس رنگین اور تذکرہ میر قاسم سے تصدیق نہیں ہو سکی۔ امید ہے مستقبل قریب میں تذکرۂ شورش مل جائیگا۔ اور یہ بیان بھی ثبوت کو پہنچ جائیگا کیونکہ تذکرہ قاسم دیکھنے کے بعد یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولنا آزاد نے تاریخی واقعات نہایت ایمانداری سے نقل کئے ہیں۔ اور ان کی رنگینئ عبارت۔ نیز جوش اور شوق نے ایک ذراسی تبدیلی کو بھی روا نہیں رکھا۔

آگے چل کر سکینا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ اس قسم کی اگر اور بھی غلطیاں نکل آئیں تو اس سے ہماری رائے میں آب حیات کی اصل خوبی اور قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ اُردو میں تنقید کا صحیح معیار اسی کتاب سے قائم ہوا ہے۔ اور حالی کی یادگار غالب اسی کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیمی تذکرہ خزانۂ واقعات وحکایات۔ اور ناقابل تقلید کتاب ہونے کے یہ کتاب ہمیشہ آپ ہی اپنا جواب رہے گی۔

نیرنگ خیال یہ ایک بالکل جدید رنگ کی کتاب ہے۔ جس میں خیالی افسانوں اور خواب وغیرہ کے پردے میں نہایت عمدہ اخلاقی نتائج نکالے ہیں۔ یہ کتاب دو حصّوں میں ہے۔ آزاد نے اپنے قصّوں کی بنیاد زیادہ تر یونانی تصاویر پر رکھی ہے۔ اس سے ان کے یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر لیٹنر کی ترغیب سے لکھی تھی۔ اس کی عبارت اور طرز بیان نفس مضمون سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اور نثر میں نظم کا سا لُطف آتا ہے۔

سخندان فارس یہ کتاب علم فلالوجی پر اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں فارسی اور سنسکرت کو متحد الاصل ثابت کیا گیا ہے۔ ایران اور ہندوستان کے رسوم و رواج کا مقابلہ نہایت دلچسپ ہے

جو مصنف کی سیاحت ایران اور علمی مکاشفات کا پتہ دیتا ہے۔ اس کتاب کو نگارستان فارس کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ جس میں انہوں نے فارسی شعرا کے حالات اور انتقاد لکھے ہیں۔

قند پارسی اور نصیحت کا کرن پھول قند پارسی جدید فارسی کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں مولانا کے سفر ایران کے حالات بھی ملتے ہیں۔ نصیحت کا کرن پھول ایک مکالمہ ہے۔ جو نصائح کے پیرائے میں ہے۔ بچوں اور عورتوں کے لئے نہایت آسان اردو میں لکھا گیا ہے۔

دیوان ذوق اس کتاب کی ترتیب تالیف سے مولانا نے ادب اردو کی بیش بہا خدمات انجام دینے کے علاوہ اپنے اُستاد اور ان کے کلام کو گمنامی سے بچایا ہے۔ مولانا کے دلچسپ نوٹوں نے ذوق کے اشعار کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اور ان میں ایک "رومان" کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے آبحیات میں انہوں نے غدر میں اپنے بھرے گھر کے لٹنے اور تمام مال و اسباب میں سے اپنے پیارے اُستاد کے کلام کو اُٹھا لے جانے کا ذکر نہایت دردناک پیرائے میں کیا ہے۔

دربار اکبری یہ مہتم بالشان تصنیف اکبر بادشاہ کے عہد اور ان کے ارکین سلطنت کے حال میں ہے اس کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ بیکسینا صاحب کا یہ خیال غلط ہے۔ کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبری کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ کہ تمام مناظر چلتی جاتی تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔

دیگر تصانیف سپاک و نماک۔ جانورستان اس زمانہ کی تصانیف ہیں۔ جب مولانا مجذوبیت کی ادبی زندگی بسر کرتے تھے۔ سپاک و نماک میں متصوفانہ خیالات ہیں۔ لیکن اکثر جگہ غیر مربوط ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان کے شوق تصنیف و تالیف کا پتہ چلتا ہے۔ کہ تعطل دماغ بھی ان کو اس شوق سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ جانورستان بھی اس زمانے کی تصنیف ہے۔ اسمیں جانوروں کے حالات نہایت پاکیزہ اردو میں لکھے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کہیں کہیں مجذوبیت کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ فلسفۂ الہیات بھی اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔

نگارستان فارس میں رودکی سے لے کر آرزو تک شعرائے فارسی کے حالات ہیں۔ حاشیہ پر

ان کتابوں کے نام بھی درج ہیں۔ جن سے ان کے حالات اخذ کئے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پہلا نقش ہے۔ اور نظر ثانی سے محروم ہے۔ طرز تحریر سادہ ہے۔ مگر آبحیات کی سی شان نہیں۔ اس لئے اکثر لوگوں کا خیال ہے۔ کہ یہ ابتدائی تصنیف ہے یا نظر ثانی سے محروم رہ گئی ہے *

اُردو نثاروں میں آزاد کا مرتبہ اُردو نثر نگاروں میں آزاد کی شخصیت بہت نمایاں اور بلند ہے۔ وہ طرز جدید کے بانی فطری شاعری کے پیشرو شاعر۔ فارسی سکالر۔ قدیم و جدید رنگ کے ماہر۔ ماہر تعلیم اعلیٰ مضمون نگار۔ زبردست ناقد۔ اُردو فارسی کی کتابوں کے مشہور و معروف مصنّف اور اپنے زمانہ کے عدیم المثال مقرر تھے۔ مگر جس چیز نے ان کو زندہ جاوید کیا۔ وہ انکی طرز تحریر ہے۔ جس کی تقلید آجتک کوئی نہیں کر سکا۔ انکی طرز تحریر کی یہ خاص صفات ہیں۔ کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ او تر کیبیں دُور از کار تشبیہیں اور صنائع بدائع ان کے ہاں بالکل نہیں۔ ان کی عبارت میں بھاشہ کی سادگی اور بے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی حسن و خُوبصورتی ملی جلی ہے۔ انکی نثر میں ایک موسیقی ہے۔ جو دل و دماغ کو لطف اندوز کرتی ہے۔ انکی تحریریں تکلفات اور تصنعات سے پاک ہیں۔ لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ ڈی کوئینسی۔ لیمب۔ اور سٹیونسن جیسے انگریزی صاحبان طرز سے ان کا مقابلہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

مولانا آزاد اپنے زمانہ میں نہایت مقبول تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ مولانا حالی نے آبحیات اور نیرنگ خیال کی تقریظوں میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ اور جدید شاعری کا ان کو موجد لکھا ہے مولانا شبلی نے ان کی موت پر ان کو خدائے اُردو کہہ کر یاد کیا تھا۔ اور مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکا اللہ ان کے گہرے دوست اور بڑے قدردان اور مداح تھے۔

مولانا کی نثر کی دوست دشمن سبھی نے تعریفیں کی ہیں۔ شعر الہند اور گل رعنا کے مصنّف ان کی جادُو بیانی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ کہ جو واقعات آزاد نے غلط بیان کر دیئے ہیں۔ اگر ہم ان کے خلاف سندیں بھی پیش کریں۔ تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ حقیقت میں یہ تنقید سخت ترین ہے۔ کیونکہ اس سے مصنّف کی صحیح بیانی اور تاریخ دانی پر سخت حملہ ہوتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ ثابت ہو رہا ہے

کہ آزاد تاریخی واقعات بیان کرنے میں نہایت ایمانداری اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔

آزاد نہایت ظریف الطبع اور مہذب و متین تھے۔ ان کا دل تعصب سے بالکل آزاد تھا ذیل کے اشعار میں انہوں نے اپنی طبیعت کا بالکل صحیح نقشہ کھینچا ہے ؎

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں ۔ کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں
کرجاتا صاف دشمن بد بیں پہ چوٹ ہے ۔ اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے
کھوٹا اگر زبان کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

مولانا حالی حالی کے حالات حصہ نظم میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں ان کا ذکر بحیثیت نثار کے کیا جاتا ہے ان کی تصانیف نثر حسب ذیل ہیں۔ (۱) تریاق مسموم (۲) علم طبقات الارض (۳) مجلس النساء دو حصے۔ (۴) حیات سعدی (۵) مقدمہ شعر و شاعری۔ (۶) یادگار غالب۔ (۷) حیات جاوید یعنی سوانح عمری سر سید۔ (۸) مضامین حالی۔ جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

ابتدائی تصانیف پانی پت کے ایک مسلمان نے عیسائی ہو کر اسلام پر اعتراض کئے تھے۔ تریاق مسموم ان اعتراضات کے جواب میں ہے۔ اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں۔ طبقات الارض ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر لیٹز کے عہد میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی مجلس النساء لکھنے پر وائسرائے نے مولانا کو چار سو روپے انعام دیئے تھے۔ یہ لڑکیوں کے سکولوں میں بھی پڑھائی جاتی تھی۔

حیات سعدی اس کتاب میں شیخ سعدی کی مفصل سوانح عمری اور ان کے کلام پر بحث بہت دلنشین پیرائے میں لکھی ہے۔ اسی تصنیف سے مولانا نے اُردو نثاروں کی صف اول میں جگہ پائی تھی۔

مقدمہ شعر و شاعری یہ کتاب مولانا حالی کے دیوان کا مقدمہ کہلاتی ہے۔ اس تصنیف نے ادبی دُنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ مولانا کی شہرت کا یہی کتاب سنگ بنیاد ہے۔ اس کتاب کا مضمون دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مولانا نے شاعری کا آئیڈیل قائم کیا ہے۔ اس میں

مشرقی اور مغربی نقادوں کے شعر کے متعلق خیالات قلمبند ہیں۔ فن تنقید میں یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے قدیم طرز کے شعرا کے سامنے جدید طرز کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دونوں طرزوں کی خوبیاں اور برائیاں اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں۔

یادگار غالب | یہ مولانا کی سب سے ہر دلعزیز تصنیف ہے۔ غالب پر اس سے بہتر کسی اور شخص نے کتاب نہیں لکھی۔ اس میں غالب کے حالات واقعات اور ان کے لطائف ظرائف دلچسپ انداز سے بیان کئے ہیں۔ اور ان کے فارسی اور اردو کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مشکل اور پیچیدہ اشعار کو نہایت خوبصورتی سے سمجھایا ہے۔ اس تصنیف سے حالی نے حق شاگردی اسی طرح ادا کیا ہے۔ جس طرح مولانا آزاد نے دیوان ذوق مرتب کر کے کیا تھا۔

اگرچہ حالی نے نہایت منصفانہ انداز سے اپنے استاد کے کلام پر تنقید کی ہے۔ مگر پھر بھی جوش عقیدت ان کو جادۂ انصاف سے کہیں کہیں ہٹا دیتا ہے۔

حیات جاوید | یہ کتاب بھی حالی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں سرسید کے پورے سوانح عمری بیان کئے ہیں۔ بلکہ ان کے رفقا کے بھی حالات لکھے ہیں۔ اس میں مصنف نے سرسید کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس لئے مولانا شبلی کی یہ تنقید درست ہے۔ کہ اس کتاب میں تصویر کا ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ اور معایب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے۔ یا ان کی توجیہ کر دی ہے۔ بیکسینا صاحب کا یہ خیال ہے۔ کہ اس تصنیف کو اس قدر سختی سے نہیں جانچنا چاہئے۔ سوانح نگاری اردو میں ابتدائی حالت میں ہے لہذا سخت تنقیدوں سے اسکو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

طرز تحریر | مولانا کی عبارت صاف سادہ اور زوردار ہوتی ہے۔ لیکن اس میں آزاد کی نثر کی شوخی اور رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی لطیف ظرافت نہیں ہوتی۔ اگرچہ حالی نثر میں صاحب طرز نہیں لیکن بہترین نثار ہیں وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مضمون کا خیال رکھتے ہیں۔ محض لفاظی اور عبارت آرائی کہیں نہیں کرتے۔ وہ جدید نثر اردو کے زبردست حامیوں اور

غالب اور سرسیدؔ کی طرزِ تحریر کے زندہ رکھنے والوں میں سے ہیں ؞

مولانا نذیر احمدؔ
۱۸۳۱ء تا ۱۹۱۲ء

شمس العلماء مولوی نذیر احمدؔ موضع راہر ضلع بجنور میں پیدا ہوئے ان کا خاندان علم و فضل میں مشہور تھا۔ مولوی صاحب نے اپنے والد مولوی سعادت علی سے ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ پڑھا پھر دلی میں آکر ۱۸۴۵ء میں مولوی عبد الخالق کے شاگرد ہوئے۔ بعد میں انہی کی پوتی سے ان کا عقد ہوا۔ مولوی مملوک علی دلی کالج کے پروفیسر تھے۔ ان کے اصرار سے مولوی صاحب ان کے کالج میں داخل ہوئے۔ اور وہاں ادب عربی۔ فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی تکمیل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انہوں نے انگریزی بھی شروع کی۔ لیکن والدہ کی مخالفت سے چھوڑ دی۔ مولانا آزاد۔ حالی۔ منشی کریم الدین۔ مولوی ذکا اللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ کالج میں ان کے ہم مکتب تھے۔

ابتدا میں مولوی صاحب پنجاب میں پچیس روپے ماہوار پر ٹیچر ہوئے تھے۔ پھر ننانوے روپیہ پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ غدر میں ایک میم کی جان بچانے پر انہیں ایک تمغہ اور ایک معقول رقم انعام میں اور مدارس کی ڈپٹی انسپکٹری مل گئی۔ ان کے بعد ان کا تبادلہ الہ آباد ہوا۔ جہاں انہوں نے ضرورت کے لائق انگریزی بھی پڑھی۔ ۱۸۶۱ء میں وہ انڈین پینل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ ترجمہ تعزیرات ہند کے صلے میں وہ تحصیلدار ہوئے۔ اور پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ ایک نجوم کی کتاب کا اردو ترجمہ انگریزی سے کر کے انہوں نے ایک ہزار روپیہ انعام پایا۔ ان کی قابلیت کا شہرہ سن کر سالار جنگ اول نے ان کی خدمات گورنمنٹ سے مستعار لیں۔ اور آٹھ سو روپے ماہوار پر ان کو افسر بندوبست مقرر کیا۔ اسی عرصہ میں انہوں نے قرآن حفظ کیا۔ بعد میں سر سالار جنگ کے ایما پر انہوں نے انگریزی ملازمت چھوڑ کر سرکار نظام کی مستقل ملازمت کر لی۔ حیدر آباد میں ترقی کرتے کرتے مولوی صاحب اعلیٰ ممبر مال ہو گئے۔ اور سترہ سو روپے ماہوار پانے لگے۔ انکے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد بھی وہاں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے ؞

سر سالار جنگ کے حکم سے مولوی صاحب نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا۔ سر سالار جنگ کے بیٹے ان کے شاگرد تھے۔ آخر مولوی صاحب اپنے عہدے سے دستکش ہو کر دہلی میں آ رہے تھے۔ جہاں بقیہ عمر تصنیف و تالیف اور سر سیّد کے ساتھ قومی خدمات میں صرف کر کے ۱۹۱۲ء میں فوت ہوئے۔

تصانیف مولٰنا کثیر التصنیف اور سریع تصنیف تھے۔ ما یغیک فی الصرف۔ مبادی الحکمت منتخب الحکایات اور رسم الخط وغیرہ سکول کے طلبا کے لئے بہت مفید کتابیں ثابت ہوئیں۔ انہوں نے سرکاری ایکٹوں کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کئے۔ مجموعہ تعزیرات ہند اور دیگر قانونی تراجم کو انہوں نے محنت اور قابلیت سے مکمّل کر دیا۔ "افسانۂ غدر" ایڈورڈ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ان کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ جو حیدر آباد میں وہاں کے عمال کے لئے لکھیں۔

مذہبی کتب اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں اکثر مباحثے رہتے تھے۔ سر سیّد۔ مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک ان میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک عیسائی مبلّغ نے "امہات المومنین" لکھی اور اس میں ازواج مطہرات پر بیجا الزامات لگائے۔ مولوی صاحب نے اس کے جواب میں "اُمہات الامہ" لکھی۔ اس کتاب کی زبان پر اکثر لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ اس پر مولوی صاحب کی بہت بُری طرح خبر لی گئی۔ بلکہ ان پر کُفر کا فتویٰ بھی لگ گیا۔ آخر اس کی بقیہ جلدیں جلا دی گئیں اور اس کی ترمیم کر کے دوبارہ چھاپا۔

مولوی صاحب کا ترجمۂ قرآن ان کا بڑا شاندار کارنامہ ہے۔ یہ چار عالموں کی مدد سے تین سال میں پورا ہوا تھا۔ اس کی زبان بہت زیادہ با محاورہ ہے۔ اسوجہ سے اکثر مقامات پر مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ اور تشریح و تمثیل کی کثرت سے ترجمہ نے تفسیر کی شان اختیار کر لی ہے۔

آخر عمر میں مولوی صاحب نے ادعیۃ القرآن۔ دہ سورہ۔ اور الحقوق والفرائض تصنیف کیں۔ الحقوق والفرائض بہت جامع کتاب ہے۔ ان کی آخری تصنیف مطالب القرآن انکے بعد چھپی تھی

اخلاقی ناول

(۱) مراۃ العروس۔ مولوی صاحب کی یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ جس سے ان کی شہرت ہوئی۔ یہ ایک معزز مسلمان خاندان کی پرائیویٹ زندگی کا قصہ ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے۔ کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم سے کس طرح بدل گئی۔ یہ کتاب ہندو مسلمان عورتیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔ اس کی زبان بھی عورتوں کی ہے۔ جو نہایت بامحاورہ اور سلیس ہے۔ اس پر مولٰنا کو ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۲) "بنات النعش" یہ بھی مراۃ العروس کی طرح عورتوں کے لئے ہے۔ اس میں عام معلومات کی نہایت دلچسپ باتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۳) توبۃ النصوح۔ مولانا کا سب سے بہتر ناول ہے۔ نصوح ایک فاجر و فاسق شخص ہے۔ جو بیمار ہو کر تائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا لڑکا راہ راست پر نہیں آتا۔ اس میں مولانا نے اولاد کی تربیت کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔

(۴) ابن الوقت۔ اس میں ایک ہندوستانی کا ذکر ہے۔ جو غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیتا ہے اور اس کے صلے میں دولت اور بلند مرتبہ پاتا ہے۔ وہ دیسی لوگوں کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اور انگریزوں کی معاشرت کو پسند کرتا ہے۔ اس کے عزیز اس سے قطع تعلق کر دیتے ہیں جب انگریز چلے جاتے ہیں تو وہ کہیں کا بھی نہیں رہتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ اسمیں مولانا نے اپنی سرگذشت بیان کی ہے۔ غرض بڑے مزے کی کتاب ہے۔

(۵) ایامیٰ۔ اس میں مولانا نے بیوہ عورتوں کے نکاح کرنے پر زور دیا ہے۔ اور ایک بیوہ کی درد بھری داستان نہایت دردناک اور نصیحت آمیز پیرائے میں لکھی ہے۔

(۶) محصنات۔ میں تعدد ازدواج کا نقصان دکھایا ہے۔

(۷) رویائے صادقہ میں اہل اسلام کے مذہبی عقائد پر ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت میں بحث کی ہے۔

مولانا کی تمام کتابیں نہایت نصیحت آموز۔ اخلاق سکھانے والی اور دلچسپ ہیں ؂

لیکچر اور تقریریں ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد مولانا نے ایک واعظ اور لیکچرار کی زندگی شروع کر دی تھی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور۔ طبّی کالج دہلی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں وہ بڑی سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے اور سامعین کو اپنی پُر مغز اور ہنسانے رُلانے والی تقریروں سے مسحور کر دیا کرتے تھے۔ ان کا مجموعہ لیکچر چھپ گیا ہے۔ جن میں اخلاقی۔ تعلیمی۔ مذہبی اور تمدّنی مسائل پر نہایت مبسوط بحث کی گئی ہے ؂

بحیثیت شاعر آخر عمر میں مولوی صاحب کو شعر کہنے کا بھی شوق ہو گیا تھا۔ لیکن ان میں شعریت بالکل نہیں۔ اصلی جذبات شعریہ کہیں نہیں۔ ان کا کلام مجموعہ نظم بے نظیر کے نام سے چھپ گیا ہے ؂

اخلاق وعادات مولانا نہایت سادہ مزاج اور بہت ظریف الطبع تھے۔ اگرچہ اللہ نے سب کچھ ہی دے رکھا تھا لیکن زندگی نہایت سادگی سے بسر کرتے تھے۔ روپیہ جمع کرنے کا بیحد شوق تھا۔ آخر عمر میں تجارت میں بھی روپیہ لگاتے تھے۔ جس سے بہت کچھ آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ تعلیم و تعلّم کا مشغلہ انہوں نے مرتے دم تک جاری رکھا۔ علی گڑھ کالج اور سر سیّد کے وہ زبردست معاون تھے ۱۸۹۷ء میں وہ شمس العلماء ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری ملی۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری حاصل کی۔ گورنر پنجاب بحیثیت چانسلر جلسۂ تقسیم اسناد کے صدر تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب کے علم وفضل کی بہت تعریف کی ؂

طرز تحریر مولانا کی عبارت عام طور پر آسان اور سادہ ہوتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ بہت بے لطف کرتے ہیں۔ بعض مواقع پر انگریزی الفاظ اور صنائع بدائع بھی صرف کرتے ہیں۔ جو اُن کی عبارت کو بھونڈا اور غیر دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ مولانا آزاد کی سی لطافت اور شیرینی انکے ہاں نہیں ہے۔ البتہ ان کا ظریفانہ رنگ جو لطیف اور دلچسپ ہوتا ہے۔

ان کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی ظرافت میں سوقیانہ پن مطلق نہیں ہوتا۔

مولانا اپنے معاصرین میں شہرت میں سب سے سبقت لے گئے۔ وہ قوانین کے ترجمے سے گورنمنٹ سے روشناس ہوئے، قرآن کے ترجمے سے مسلمانوں میں ان کی شہرت ہوئی۔ اور اپنے اخلاقی ناولوں کی بدولت ہر گھر میں ان کا نام پہنچا۔

مولوی ذکاءاللہ ۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ ۱۸۳۲ء میں دلی پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ ثناءاللہ بہادر شاہ بادشاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے۔ مولوی ذکاءاللہ بارہ برس کی عمر میں دلّی کالج میں داخل ہوئے۔ مولانا آزاد۔ مولانا نذیر احمد وغیرہ ان کے ہم مکتب تھے۔ یہ تینوں آپس میں بہت دوست تھے۔ اور حسن اتفاق سے یہ تینوں شمس العلماء ہوئے۔

مولوی صاحب تعلیم ختم کرنے کے بعد دلّی کالج ہی میں ریاضی کے پروفیسر ہو گئے۔ سات آٹھ سال کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر بلند شہر اور مراد آباد میں گیارہ سال رہے ۱۸۶۹ء میں دلّی نارمل سکولوں کے مدرس اعلیٰ ہوئے۔ اور ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری کے لئے نامزد ہوئے۔ مگر اس عہدے کا چارج لینے سے پہلے وہ میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ جہاں ۲۶ برس ملازمت کرنے کے بعد چوبیس برس پنشن پا کر ۱۹۱۰ء میں دہلی میں فوت ہوئے۔

مولوی صاحب کو تعلیم نسواں کی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے ایک خلعت دیا۔ علمی خدمات میں پندرہ سو روپے اور خطابات خان بہادر اور شمس العلماء ملے۔ مولوی صاحب سر سید کے بہت دوست اور معاون تھے۔

تصانیف مولوی صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ ادب۔ اخلاق طبعیات۔ کیمیا اور سیاسیات وغیرہ میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پر مولانا حالی نے یہ پھبتی کہی تھی۔ کہ مولوی ذکاءاللہ کا دماغ ایک بنئے کی دکان ہے۔ جس میں ہر قسم کی جنس موجود

رہتی ہے۔ ممکن ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہو کہ بنیئے کے ہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں نہیں ہوتیں۔ بہر حال مولوی صاحب کی تحریریں نہایت صاف اور سلیس اُردو میں ہیں۔ اور عبارت آرائی اور تصنع سے پاک ہیں۔ ان کی تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ ڈیڑھ سو سے کم نہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر طلبا کے لئے لکھی ہیں۔ اس لئے ان میں ادبی شان بالکل نہیں۔ مولوی صاحب بحیثیت ریاضی دان۔ مترجم۔ اور مورخ کے مشہور رہیں۔ مگر ریاضی میں ان کا پایہ کچھ بلند نہ تھا۔ انکی کوششیں انگریزی ترجمے اور شرحیں لکھنے تک محدود تھیں۔ تاریخ ہند لکھنے میں انہوں نے بہت محنت اور جانفشانی سے کام لیا تھا۔ ان کی تاریخ ہندوستان دس جلدوں کی ضخیم کتاب ہے "مہمات عظیم" میں ان لڑائیوں کا ذکر ہے۔ جو ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں انگلستان اور دوسرے ممالک میں ہوئیں "آئین قیصری" میں ملکہ وکٹوریا کے عہد کی وہ انتظامی تبدیلیاں درج ہیں۔ جو ہندوستان میں عمل میں آئیں۔ ایک اور کتاب تین جلدوں میں ہے جسمیں وکٹوریا کے عہد کے حالات اور ترقیاں جمع کی ہیں "فرہنگ فرنگ" میں یورپین شائستگی کی تاریخ اور وکٹوریا اور ان کے شوہر کے حالات لکھے ہیں۔ مولوی سمیع اللہ کی سوانح عمری بھی انہوں نے لکھی تھی۔ آخر عمر میں تاریخ اسلام لکھ رہے تھے۔ کہ انتقال ہوگیا۔ اور وہ نا تمام رہ گئی ؎

مولوی سید احمد دہلوی | مولوی سید احمد ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عبدالرحمٰن ایک معزز خاندان سادات کے رکن تھے۔ مولوی صاحب کی تعلیم سرکاری سکول اور نارمل سکول میں ہوئی۔ ان کو بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانہ میں "طفلی نامہ" کے عنوان سے ایک فارسی نظم اور "تقویۃ الصبیان" ایک انشا کی کتاب لکھی تھی۔ ۱۸۶۸ء سے وہ فرہنگ آصفیہ کے لئے مصالح جمع کر رہے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں ان کی کتاب "کنز الفوائد" چھپی جس پر ان کو دو سو روپے انعام ملا۔ ۱۸۷۱ء میں انکی "وقائع درونیہ" شائع ہوئی اور ڈیڑھ سو روپے انعام میں ملے۔ یہ رقم انہوں نے فرہنگ آصفیہ پر صرف کی۔ اس اثنا میں ڈاکٹر فیلن انسپکٹر مدارس صوبۂ بہار نے ان کو اپنی ڈکشنری تیار کرنے کے لئے بلا لیا۔ مولوی صاحب نے

یہ کام سات برس میں ختم کیا۔ اور ساتھ کے ساتھ اپنی فرہنگ بھی تیار کرتے رہے۔ اس زمانہ میں انہوں نے ہادی النساء لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ ۱۸۷۰ء میں انہوں نے مہاراجہ الور کا سفرنامہ مرتب کیا۔ اس کے بعد وہ پنجاب بُک ڈپو کے نائب مترجم ہو گئے۔ اس زمانہ میں ان کی ذیل کی مفید تصانیف شائع ہوئیں۔

”تکمیل الکلام“ میں پیشہ وروں کی اصطلاحات ہیں۔ ”تحقیق الکلام“ میں اُردو زبان کے نکات ہیں۔ ”رس کھان“ میں ہندی دوہے پہیلیاں اور گیت ہیں۔ ”ریت بکھان“ میں ہنود کے رسم و رواج درج ہیں۔ ”ناری کتھا“ میں ہندو عورتوں کی مخصوص بولی ہے۔ قواعد اُردو۔ تعلیم نسواں۔ لغات النساء۔ تحریر النساء۔ راحت زمانی کا قصہ۔ اخلاق النساء۔ علم النساء۔ رسوم دہلی۔ سیر شملہ۔ ضرب الامثال۔ روزمرۂ دہلی۔ رسوم اعلیٰ ہندوان دہلی وغیرہ ان کی اپنی طرز میں مفید اور دلچسپ کتابیں ہیں۔

فرہنگ آصفیہ اتنی بڑی کتاب کو چھاپنا آسان کام نہیں تھا۔ حُسن اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں سر آسمان جاہ شملے آئے۔ وہاں مولوی صاحب کسی سکول میں ملازم تھے۔ انہوں نے وزیر اعظم کی معرفت اپنی فرہنگ کا مسودہ پیش کیا۔ جو سید علی بلگرامی کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اور انعام کا وعدہ ہوا۔ جب ۱۸۹۲ء میں کتاب ختم ہوئی۔ تو اس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا گیا۔ اس کی تصنیف پر مصنف کو سرکار نظام سے پانچ ہزار روپے انعام اور پچاس روپے ماہوار بطور پنشن ملے۔ گورنمنٹ پنجاب نے بھی اس کی بہت قدر کی۔ فی الحقیقت یہ کتاب لغات اُردو میں خاص درجہ رکھتی ہے۔ آجکل اس فرہنگ کے نہ ملنے سے ادبی دُنیا کو سخت بے چینی ہے۔

شبلی نعمانی
۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل تھے۔ ابتدائی کتابیں انہوں نے مولوی شکر اللہ سے پڑھیں پھر مولانا فاروق چریاکوٹی ہیڈ مولوی غازی پور سے عربی ادب اور معقولات پڑھیں۔ شوق

تعلیم میں رام پور گئے۔ اور وہاں مولوی عبدالحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین محدث سے حدیث اور فقہ کے اسباق لئے۔ پھر لاہور جاکر مولوی فیض الحسن سے حماسہ پڑھا۔ یہاں سے سہارنپور آئے اور مولوی احمد علی سے حدیث کی تکمیل کی ۱۸۷۶ء میں اُنیس سال کے تھے۔ کہ حج کو گئے۔ اور راستے میں جوش عقیدت سے ایک پُر نور فارسی قصیدہ لکھا۔ حج سے واپس آکر اعظم گڑھ میں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھا۔ شوق کُتب بینی کا یہ حال تھا۔ کہ کتب فروشوں کی دکان پر بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ اور بازار کا شور وغل ان کے انہماک میں حارج نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے ردّ وہابیہ میں چند رسالے لکھے۔ کہتے ہیں انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کر کے اعظم گڑھ میں وکالت بھی کی تھی۔ جب دل اُکتا گیا تو سرکاری ملازمت کی لیکن وہ بھی چھوڑ دی اور علمی مشاغل اختیار کر لئے۔

مولانا شبلی کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ وہ نہایت کامیاب شاعر، فلسفی، مورخ، ناقد، ماہر تعلیم، معلّم، واعظ، مصلح، جریدہ نگار، فقیہہ اور محدّث تھے۔ اور اپنے زمانے کے قابل ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

۱۸۸۲ء میں مولانا شبلی اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے علی گڑھ کالج میں ملنے گئے۔ وہاں خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر کے ذریعہ مولوی سمیع اللہ خاں سے ملے۔ جن کی معرفت سرسیّد سے ملاقات ہوگئی۔ ان دنوں کالج میں فارسی کی پروفیسری کی جگہ خالی تھی۔ مولانا نے اس کے لئے درخواست دی جو منظور ہوگئی۔ مولانا کچھ دنوں شہر میں رہے۔ اس کے بعد سرسیّد کے بنگلے کے قریب آرہے۔

قیام علی گڑھ اس زمانہ میں علی گڑھ میں بڑے بڑے ارباب کمال جمع تھے۔ مولانا شبلی کو سرسیّد اور حالی وغیرہ کی قُربت سے بہت فائدہ پہنچا۔ انہوں نے پروفیسر آرنلڈ سے فرنچ سیکھی۔ اور ان کو عربی پڑھائی۔ مولانا نے مغربی فن تنقید اگر پروفیسر موصوف سے حاصل کیا تو اکثر باتوں کے لئے پروفیسر صاحب کی "پریچنگ آف اسلام" ان کی ممنون ہے۔

ابتدائی تصانیف | ۱۸۸۴ء میں مولانا نے "مثنوی صبح امید" لکھی جس میں اسلام کی شان و شوکت موجودہ مسلمانوں کی نکبت اور فلاکت اور ان کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے سرسید کی کوششوں کا بہت پُر اثر اور زوردار الفاظ میں ذکر ہے۔

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ۱۸۸۷ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس کے پڑھی تھی اس سے ان کی تاریخی معلومات اور تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ اب ان کے دل میں خیال آیا کہ بلادِ اسلامیہ کا سفر کرکے خلفائے عباسیہ کی ایک مکمل تاریخ مرتب کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے المامون اور سیرۃ النعمان لکھی۔ الفاروق شروع کرنے والے تھے۔ کہ سفر روم و شام اختیار کیا۔ اس سفر میں پروفیسر آرنلڈ بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ۔ ایشیائے کوچک۔ اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی اس سفر کی زیادہ تر غرض یہ تھی۔ کہ الفاروق کے لئے صحیح اور معتبر مآخذ کا پتہ لگے اور بلادِ اسلامی کی شان و شوکت اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ واپس آکر انہوں نے "سفر نامہ روم و شام" چھپوایا۔ جو نہایت دلچسپ ہے۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال سے مولانا کالج سے دل برداشتہ ہو گئے۔ اور ملازمت ترک کرکے اعظم گڑھ میں آرہے۔ اب وہ الفاروق کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ایک قومی سکول کی ترقی میں بھی کوششیں کیں۔ ۱۸۹۹ء میں کشمیر گئے۔ وہاں جاکر بیمار ہو گئے۔ اور اسی حالت میں الفاروق کو مکمل کیا۔

قیام حیدر آباد | نواب وقار الامرا کی وزارت کے زمانہ میں مولانا حیدر آباد آگئے۔ اور سید علی بلگرامی کی کوشش سے دو سو روپے پر ناظم محکمہ تعلیم ہو گئے۔ بعد میں ان کی تنخواہ تین سو روپے ہو گئی تھی مولانا وہاں چار برس رہے۔ اور محکمہ تعلیم میں بہت کچھ اصلاحیں کیں لیکن سلسلۂ تصنیف و تالیف بھی برابر جاری رکھا۔ الغزالی۔ سوانح مولانا روم۔ الکلام۔ علم الکلام۔ موازنۂ انیس و دبیر وغیرہ اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔ انہوں نے حیدر آباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کھولنے کی سکیم بھی تیار کی تھی۔

ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کی تحریک کے بانی مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر اس کی تکمیل مولوی سیّد محمد علی کانپوری خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن مراد آبادی کے ہاتھوں ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق (تفسیر حقانی) نے اسکے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ سر سیّد محسن الملک اور وقار الملک بھی اسکے حامی تھے۔ اسکے مقاصد خاص طور پر یہ تھے۔ کہ عربی مدارس کے لئے ایک مفید نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا خیال رکھ کر بنایا جائے۔ اور مسلمانان ہند کے باہمی اختلافات کو دُور کیا جائے۔

مولانا شبلی کی تحریک سے ۱۸۹۵ء میں دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے۔ جن میں ضروریات زمانہ کو مدنظر رکھ کر تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں شاہجہانپور کے رؤسا نے ندوۃ العلماء کو کچھ زمینداری بطور وقف دی۔ جس کی آمدنی تقریباً سات سو روپیہ تھی۔ پھر ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد رکھی گئی۔ جس میں دس ہزار سے زائد نایاب کتابیں ہیں۔ ندوہ کی بڑھتی ہوئی تحریک کو دیکھ کر گورنمنٹ کو شبہ ہوا کہ یہ جماعت سیاسی سازشوں سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر چاروں طرف اس کی مخالفت میں رسالے نکلنے لگے۔ اور ندوہ کے مقابلے میں "جدوہ" بھی قائم ہو گیا۔

حیدر آباد سے آکر مولانا شبلی نے ندوہ کے ابتر انتظامات کو سنبھالا۔ اور بڑی کوششوں سے گورنمنٹ کے شکوک رفع کئے۔ پھر ندوہ کی مالی حالت درست کرنے کے لئے اسلامی ریاستوں میں گئے۔ چنانچہ رام پور سے پانسو۔ بھوپال سے ڈھائی سو۔ آغا خاں سے پانسو روپے سالانہ کی اعانتی رقوم مقرر ہوئیں۔ اور نواب صاحب بہاولپور کی والدہ نے پچاس ہزار روپے تعمیر عمارت کے لئے عنایت کئے۔ گورنمنٹ نے دارالعلوم کے لئے ایک وسیع قطعہ زمین دریائے گومتی کے کنارے لکھنؤ میں عطا کیا۔ اور چھ ہزار روپے سالانہ کی امداد انگریزی اور دینی علوم کی تعلیم کے لئے منظور کی۔ ۱۹۰۸ء میں گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

ندوہ کے ماتحت مولانا نے عربی فارسی کے سکالروں کے لئے ایک درجہ کھولا جس میں ریسرچ کا کام ہوتا ہے۔ ندوہ کے مقاصد ابھی تکمیل کو نہیں پہنچے۔ لیکن اس تھوڑی سی مدت میں اس نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جس میں ہر قسم کی نایاب کتابیں موجود ہیں۔ ندوہ نے قرآن نے

صحیح انگریزی ترجمے کا بھی کام اپنے ذمہ لیا۔ اور مسلمانوں کی تاریخی غلطیوں کی نہایت عمدگی سے اصلاح کی۔ قانون وقف و میراث کے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ہندوستان میں ایک مرکز قائم کیا۔ اور وہاں سے الندوہ کے نام سے سالہ بھی نکلا جس کے مدیر مولانا شبلی اور حبیب الرحمان شروانی تھے۔ اس میں بہت عمدہ مضامین نکلتے تھے +

دارالمصنفین اعظم گڑھ

سر سید کی صحبت نے مولانا کو کسی قدر آزاد خیال بنا دیا تھا۔ اس لئے ندوہ کے علما ان پر پورا اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ آخر مولانا لکھنؤ سے دل برداشتہ ہو کر اعظم گڑھ چلے آئے۔ اعظم گڑھ میں انہوں نے دار المصنفین کی بنیاد رکھی۔ اور اپنی جائداد اور باغ اسکے لئے وقف کر دیا۔ اس زمانہ میں مولانا نے "سیرۃ النبیؐ" اور شعر العجم کا پانچواں حصہ لکھا۔ اسی اثناء میں سوء اتفاق سے مولانا کی ٹانگ کو گولی لگی اور آخر کار اسے کاٹنا پڑا۔

آجکل دار المصنفین کے نگران سید سلیمان صاحب ندوی ہیں۔ اور مولانا حمید الدین۔ مولانا عبد الہادی۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی۔ پروفیسر نواب علی۔ اور مولانا عبد السلام اس کے پُرجوش کارکن ہیں۔ مولانا حمید الدین انگریزی کے علاوہ فارسی عربی ادب اور علم القران کے مُستند فاضل ہیں۔ مولانا عبد الہادی نے برکلے کے فلسفہ کا بہت سلیس اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے علاوہ فلسفہ کی اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔

دار المصنفین اُردو ادب کی نہایت شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ مگر اسکی تصانیف میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اور اس کی تمام تر توجہ علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کی طرف مبذول ہے۔ دار المصنفین کے کارکنوں کا فرض ہونا چاہئے۔ کہ وہ تمام علوم مغربی اور مشرقی کی طرف توجہ کریں۔ اور یہ خیال رکھیں کہ معمولی اُردو جاننے والے بھی انکی تصانیف سے مستفید ہوں +

خدمات شبلی

سلطان ٹرکی نے ۱۸۹۲ء میں ان کو تمغۂ مجیدی عنایت کیا۔ اور اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ مولانا الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف تعلیمی کمیٹیوں کے

بھی معزز رکن تھے ۔

اخلاق و عادات | مولانا شبلی ایک سچے ۔ راستباز ۔ خلیق اور متواضع بزرگ تھے ۔ ان کی گفتگو نہایت شیریں ۔ اور معلومات سے پر ہوتی تھی ۔ حافظہ نہایت اچھا پایا تھا ۔ روپے کو آزادی سے خرچ کرتے تھے ۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے ۔

تصانیف | ان کی تصانیف بکثرت ہیں ۔ اور حسب ذیل بہت مشہور ہیں ۔ سیرۃ النبی ۲ حصے ۔ شعر العجم پانچ حصے ۔ اورنگ زیب عالمگیر ۔ الفاروق ۔ المامون ۔ سیرۃ النعمان ۔ الغزالی الکلام ۔ علم الکلام ۔ سوانح مولانا روم ۔ موازنۂ انیس و دبیر ۔ الجزیہ ۔ مقالات شبلی ۔ رسائل شبلی ۔ دیوان شبلی ۔ مجموعہ نظم اردو وغیرہ ۔

بحیثیت مؤرخ | مولانا کا بڑا کمال یہ ہے ۔ کہ انہوں نے اسلام کی قدیمی شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید میں لکھا ۔ اپنی تاریخی تصانیف میں تجسس تلاش اور عمیق مطالعہ سے کام لیا ۔ اور جدید طرز تنقید کے مطابق بیکار چیزوں کو ترک کر دیا ۔ الفاروق ۔ المامون ۔ الغزالی ۔ سیرۃ النعمان ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں ۔ اور ان کے وسیع مطالعہ اور گہری تحقیق اور تجسس کا پتہ دیتی ہیں ۔

بحیثیت نقاد | مولانا اپنے زمانہ کے صائب الرائے ناقد تھے ۔ سیکسینا صاحب لکھتے ہیں ۔ کہ شعر العجم وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت بلاغت اور سلاست زبان کا بہترین مجموعہ ہے ۔ دو اس کی غلطیاں نکالنے سے اس کی قدر و قیمت اور مولانا کی تبحر علمی میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ سیکسینا صاحب کی یہ تنقید عجیب طرح کی ہے ۔ مستشرقین کے نزدیک تاریخی حیثیت سے شعر العجم بالکل بے وقعت ہے ۔ ہاں شعرا پر تنقیدیں واقعی نہایت دلچسپ اور عالمانہ ہیں ۔ جو مولانا کے بلند نقطہ نظر اور تبحر علمی کا پتہ دیتی ہیں ۔ "موازنۂ انیس و دبیر" بھی ان کی بہت دلچسپ کتاب ہے ۔ لیکن اس میں مولانا نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔

طرز تحریر | مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی کو پسند کرتے ہیں ۔ ان کی عبارت میں ایک قسم کی

ترڑپ ہوتی ہے۔ سر سیّد ان کو کہا کرتے تھے۔ کہ تم لکھنؤ اور دلّی والوں کے لئے باعثِ رشک ہو
ان کی نثر میں صنائع بدائع اور تکلّف بالکل نہیں ہوتا۔ بڑی قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ہر
کتاب میں مناسب حال اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی زورِ بیان کم نہیں ہوتا۔
سکینہ بنا صاحب لکھتے ہیں۔ جن کی زبان کو آزاد کی اُردو کا چٹخارہ ہے۔ ممکن ہے! انکو
مولانا کا رنگ رُوکھا پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو۔ مگر کاروباری نثر کا وہ بے مثل نمونہ ہے
جو دَورِ موجودہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا کے نثر میں ہم کو نیشنلیزم کی رُوح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال
یہ ہے کہ علوم مشرقی کو وہ مغربی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اور نہایت بلند نظری سے ہر شعر کو
جانچتے ہیں۔ اور اس کو نہایت ہی دلنشین انداز میں لکھتے ہیں۔

| سید سلیمان ندوی | مولانا سید سلیمان مولانا شبلی کے جانشین اور عربی فارسی کے زبردست عالم ہیں۔

مولانا شبلی ان سے بہت محبّت کرتے تھے۔ اور وہ بھی اپنی قابلیت کے باعث مولانا
کے دوسرے شاگردوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ سلیمان صاحب نے مولانا کے بعد
ان کی روایات کو زندہ رکھا۔ دار المصنفین انہی کی نگرانی میں عربی فارسی کی نایاب کتابوں کے
ترجمے اور مفید کتابیں تصنیف و تالیف کر رہا ہے۔ مولانا معارف کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ جو
اُردو زبان کا نہایت بلند پایہ رسالہ ہے۔ وہ بلاد اسلامیہ کا سفر کر چکے ہیں۔ سیرۃ النبی جس کے
دو حصّے مولانا شبلی نے لکھے تھے۔ اس کے باقی حصّے اسی شان سے مولانا لکھ رہے ہیں۔ اس کے
علاوہ سیرۃ العائشہ۔ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ اور عرب و ہند کے تعلقات آپکی نہایت
مقبول اور مفید تصانیف ہیں۔

| عبد السلام ندوی | مولانا عبد السلام دار المصنفین کے پُرجوش کارکن ہیں۔ ان کے اعلیٰ درجے کے
مضامین معارف میں اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ سیرۃ عمر بن العزیز۔ اسوۂ صحابیات۔ شعر الہند ہر دو
حصّے۔ ابن یمین وغیرہ ان کی تصانیف ہیں سُنا ہے۔ وہ مولانا شبلی کے حالات بھی مرتب

کر رہے ہیں۔

شعر الہند۔ اپنی نوعیت کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس میں نظم اُردو پر ایک خاص نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں اکثر لوگوں کا ذکر نہیں۔ جنہوں نے زبان کی ترقی میں بیحد کوششیں کی ہیں۔ سکسینا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ کتاب کا نام اسم غیر مسمّٰی ہے۔ بہر حال اس میں بعض خاص خاص باتیں ایسی ہیں۔ جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں +

عبدالماجد دریا آبادی

مولانا عبدالماجد بی۔ اے مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر کے فرزند ہیں۔ آپ ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ گھر میں ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم سے فراغت پا کر سیتا پور ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ انٹرنیس پاس کرکے کیننگ کالج لکھنؤ میں چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کے لئے علی گڑھ گئے۔ لیکن والد کے انتقال کے سبب مطالعہ جاری نہ رکھ سکے۔ اور لکھنؤ چلے آئے۔ لکھنؤ میں سلسلۂ تصنیف و تالیف جاری کیا۔ ۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ حیدر آباد دکن سے تعلّق ہو گیا۔ لیکن کچھ مدّت بعد ملازمت ترک کر دی۔ اب بھی نظام گورنمنٹ سے وظیفہ پاتے ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ ادبی خدمات عثمانیہ یونیورسٹی کی کرتے رہتے ہیں۔ مولانا سیاسیات سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور سیاسی حلقوں میں عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار اخبار "سچ" آپکی ادارت میں نکلتا ہے۔

فلسفہ جذبات۔ رُوح الاجتماع۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ مکالمات برکلے۔ پیام امن۔ بحر المحبت (مثنوی مصحفی) زود پشیماں (ناٹک) سائیکلوجی آف لیڈرشپ (انگریزی) تصوف و اسلام۔ فلسفیانہ مضامین۔ وغیرہ اُن کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔ جن کی وجہ سے اُن کو ادبی دُنیا میں خاص شہرت حاصل ہے۔

مولانا کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہے۔ اور فلسفیانہ مضامین اور ترجمے کرنے کا ان کو خاص ملکہ ہے۔ کبھی کبھی تفنّن طبع کے لئے وہ سیاسی چیزوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے

ہیں۔ چنانچہ "زود پشیماں" اسی قسم کا ناٹک ہے۔ جو سٹیج کے لائق نہیں۔ لیکن نہایت دلچسپ ہے شعر بھی کبھی کبھی کہتے ہیں۔ جو اکثر متصوفانہ رنگ میں ہوتے ہیں۔ ان کے علمی ادبی۔ اور فلسفیانہ مضامین علمیت۔ اور سنجیدگی اور اعتدال پسندی میں یکتا ہوتے ہیں۔ اور اکثر بلند پایہ رسائل اور جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ ان کی ذات ادب اُردو کے لئے باعث فخر ہے۔ اور انکی تصانیف سے اُردو اور اُردو دان پبلک کو بہت فائدے پہنچ رہے ہیں۔

جدید علوم کی ترویج دلّی کالج کا قیام

۱۸۲۷ء میں دلّی کالج میں انگریزی کی تعلیم کے لئے ایک درجہ کھولا گیا انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کے باوجود ۱۸۳۱ء میں وہاں تین سو طلبا انگریزی پڑھتے تھے۔ پہلے مدرسہ اجمیری دروازے کے قریب تھا۔ مگر جب ترقی ہوئی تو ۱۸۴۳ء میں کشمیری دروازہ شاہی کتب خانہ میں آگیا۔ چونکہ عام جذبات انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ اس لئے طلباء سے فیس نہیں لی جاتی تھی۔ بلکہ انگریزی تعلیم کا شوق پیدا کرنے کیلئے اچھے اچھے وظائف دیئے جاتے تھے۔ دلی کالج میں ریاضی کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی۔ اسوقت انگریزی ادب اور زبان کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر طلبا مغربی علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ تھے۔ انگریزی تعلیم زیادہ تر لکچروں کے ذریعے ہوتی تھی۔ کیونکہ انگریزی کتابیں دقت سے ملتی تھیں۔ لکچروں کو طلبا بہت دلچسپی سے سنتے تھے۔ ریاضی کے مسائل اور کیمیاوی۔ طبیعی۔ برقی اور مقناطیسی تجربے دیکھ کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ہم ایک نئی علمی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ محیّر العقول انکشافات کے خواب دیکھ رہے تھے۔ کہ ہنگامہ غدر نے سب کھیل بگاڑ دیا۔

پروفیسر رام چندر لکچرار ریاضی۔ پنڈت اجودھیا پرشاد۔ اور مسٹر ٹیلر پرنسپل کالج طلباء کی تعلیم و ترقی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ مولانا امام بخش صہبائی عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب۔ مولانا آزاد۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ سرسید۔ اور مولوی ذکاءاللہ وغیرہ نے اسی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ ان لوگوں نے زبان۔ ملک اور قوم کی نہایت قابل قدر خدمات

انجام دیں۔ اور ہندوستان میں اپنا نام روشن کیا۔ ان کے علاوہ مولوی شہامت علی ریاست اندور کے وزیر اعظم ہوئے۔ ڈاکٹر مکند لال شمالی ہند کے نہایت مشہور ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر چمن لعل بھی بہت مشہور تھے۔ وہ غدر میں مارے گئے۔

۱۸۴۲ء میں دلّی کالج کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن کھولی گئی۔ جس کی روح رواں پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی تھے۔ اس انجمن کی کوششوں سے اکثر مفید کتابوں کے انگریزی سے اُردو میں ترجمے ہوئے جو طلباء کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ اس انجمن کی تقلید میں آگرہ۔ بنارس۔ اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی اس قسم کی کتابیں تیار ہوئیں۔ ان ترجموں اور تالیفوں سے اُردو نثر صاف اور بے تکلّف ہو کر اس قابل بن گئی۔ کہ اس میں کاروباری دُنیا کی باتیں لکھی جا سکیں۔

۱۸۶۴ء میں رائے بہادر پیارے لال آشوب نے دلّی میں ایک اور ادبی سوسائٹی کی بُنیاد ڈالی۔ جس کے وہ خود سیکرٹری تھے۔ اس سوسائٹی کے انتظام میں بڑے مفید اور کار آمد لیکچر دیئے گئے۔ سکسینا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ ماسٹر پیارے لال آشوب مولنا حالی کو اکثر چیزیں ترجمہ کر کے دیتے تھے۔ کہ وہ ان کو اُردو کا جامہ پہنائیں۔ اور انہی کی توجّہ اور مدد سے آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری شروع کی۔

پروفیسر رامچندر پروفیسر صاحب دلّی کالج میں ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے۔ وہ ٹیلر صاحب پرنسپل کے اثر سے عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے دلّی کالج کے انگریزی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ بہت ذہین اور عقلمند تھے۔ ریاضی کا ایک نیا مسئلہ دریافت کرنے کی وجہ سے یورپ کے مشہور مہندسوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا آزاد۔ نذیر احمد اور ذکاءاللہ وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ مولوی ذکاءاللہ چونکہ ریاضی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے اس لئے پروفیسر صاحب کے بہت محبوب شاگرد تھے۔

پروفیسر رامچندر نہایت بیخوف راستباز۔ اور راسخ الاعتقاد شخص تھے۔ عیسائی

ہونے کی وجہ سے تمام برادری نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھانے سے ان کے مزاج میں تُندی پیدا ہوگئی تھی۔ جو اکثر مباحثے اور مناظرے کی صُورت اختیار کر لیتی تھی۔ پھر بھی رحمدل اور معاملہ کے پکے تھے۔ غدر میں ان کے ایک شاگرد نے بروقت اطلاع دے کر ان کی جان بچائی۔ چنانچہ وہ چند دن کسی مکان میں چھُپے رہے۔ پھر وہاں سے بھیس بدل کر شہر سے باہر چلے گئے۔ جب امن قائم ہُوا تو واپس آئے۔ اور اپنی کوششوں سے بعض دوستوں کو بھی شہر میں بلوا لیا۔ کہتے ہیں پروفیسر صاحب ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر تعلیمات بھی ہو گئے تھے۔

"تذکرۃ الکاملین" ان کی تصنیف ہے۔ اس میں یونان اور روما کے مشہور فلاسفروں اور شعراء کے حالات انگریزی اور عربی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے ہیں۔ اس میں ہندوستانی فلاسفروں اور شاعروں مثلاً والمیک۔ شنکراچارج اور بھاسکر جوتشی وغیرہ کے حالات بھی لکھے ہیں۔ اُصول علم ہیئت اور عجائب روزگار بھی انہی کی تصنیف ہیں ان کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔

مولوی امام بخش صہبائی صہبائی قدیم دلّی کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر تھے۔ فارسی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ نہایت روشن خیال اور قابل عالم تھے۔ سرسیّد کو آثار الصنادید کی تصنیف میں انہوں نے بڑی مدد دی تھی۔ طلبا پر بہت گہرا اثر رکھتے تھے۔ فن شعر میں بھی اُستاد مشہور تھے۔ قلعہ کے اکثر شاہزادے ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ وہ زمانۂ غدر میں مارے گئے۔ اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ متعدد کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔

مولوی غلام امام شہید مولوی صاحب مولوی غلام محمد کے بیٹے تھے۔ اور امیٹھی ضلع لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ نعت بہت اچھی کہتے تھے۔ اس لئے مداح نبیؐ اور عاشق رسولؐ کے لقب سے مشہور تھے۔ قتیل اور مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ اور فارسی نظم و نثر آغا سیّد اسمٰعیل مازندرانی کو دکھاتے تھے۔ پہلے الہ آباد میں پیشکار تھے۔ ملازمت سے

دستکش ہونے کے بعد ریاست حیدرآباد سے ایک معقول رقم بطور پنشن مقرر ہوگئی تھی۔ لکھنؤ۔ حیدرآباد۔ مراد آباد۔ رام پور اور آگرے میں ان کے شاگرد بکثرت تھے۔ حیدرآباد کے رؤساء ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ مجموعہ میلاد شریف۔ انشاء بیخزاں اور چند قصائد و غزلیات ان سے یادگار ہیں انہوں نے تاج گنج آگرہ کا حال پرانے رنگ کی نثر میں خوب لکھا ہے۔

منشی غلام غوث بیخبر | ان کے بزرگ اپنے وطن کشمیر میں معزز عہدوں پر سرفراز تھے۔ ان کے والد خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت اور وہاں سے نیپال آئے۔ اور وہیں خواجہ غلام غوث ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ خواجہ صاحب چار برس کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ بنارس آئے وہاں قدیم رنگ کی تعلیم پاکر ۱۸۴۷ء میں اپنے ماموں خان بہادر سید محمد خاں میر منشی گورنر ممالک مشرقی وشمالی کے ماتحت ملازم ہوگئے۔ قلعہ گوالیار کی جنگ میں ان کے ماموں کو اعزازی خلعت ملا تھا۔ ماموں کے انتقال کے بعد وہ میر منشی ہوگئے ۱۸۸۵ء میں نہایت قابلیت سے فرائض منصبی ادا کر کے ملازمت سے دستکش ہوئے۔ خواجہ صاحب نے خان بہادری کے خطاب کے علاوہ بہت سے انعام خلعت اور طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ وہ مرزا غالب کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ فغان بیخبر اور خونابۂ جگران کی بیش بہا تصانیف ہیں۔ وہ عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے۔ لیکن تقریظیں غالب کی طرح قدیم رنگ میں ہیں انہوں نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

سید علی بلگرامی | شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی بلگرام کے مشہور خاندان سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سالار جنگ کے خرچ پر انگلستان گئے جہاں انہوں نے ہندوستان سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی۔ وہ سنسکرت فارسی عربی کے علاوہ بنگلہ۔ مرہٹی اور تلنگی بھی خوب جانتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے بھی زبردست معاون تھے۔

تمدن عرب اور تمدن ہند ان کی بیحد مشہور کتابیں ہیں۔ جو انہوں نے حضور نظام کے

حکم سے لکھی تھیں۔ تمدّن عرب ڈاکٹر لیبان کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک ڈاکٹری کی کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

سید حسین بلگرامی آنریبل نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سی۔ آئی۔ ای۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے بڑے بھائی تھے۔ علمی اور ادبی قابلیت میں اگرچہ چھوٹے بھائی سے چھوٹے تھے لیکن پبلک اور سیاسی زندگی میں ان سے یقیناً افضل تھے۔ وہ عرصہ دراز تک حیدرآباد میں معزز عہدوں پر سرفراز رہے۔ پھر سیکرٹری آف سٹیٹ کی کونسل میں چلے گئے۔

انہوں نے کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔ صرف چند علمی مضامین ہیں۔ جو ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ دائرۃ المعارف جس کا مقصد کمیاب اور مفید عربی کتابیں شائع کرنا تھا۔ انہی کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ انہوں نے بہت سا وقت قرآن کے انگریزی ترجمہ پر بھی صرف کیا۔ مگر افسوس کہ وہ ناتمام رہ گیا۔

مولوی عزیز مرزا مولوی عزیز مرزا بی۔ اے اپنے زمانہ کے مشہور نثاروں میں سے تھے انہوں نے ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کیا۔ وہ حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر رہے۔ آخر میں ہوم سیکرٹری بھی ہو گئے تھے۔ فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد اپنا وقت علمی مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ گلگشت فرنگ یعنی اردو ترجمہ سفر نامہ انگلستان نواب فتح نواز جنگ مہدی حسن سیرۃ المحمود یعنی شاہان بہمنی کے مشہور وزیر خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں کے حالات زندگی اور کالیداس کے مشہور ڈرامے "وکرم اروسی" کا اردو ترجمہ ان کی تصانیف ہیں۔

مولوی صاحب کو پرانے سکّے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کا مجموعہ سکہ جات بہت اعلیٰ درجے کا خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے مضامین "خیالات عزیز" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ علی گڑھ کالج اور مسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ملازمت کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے سکرٹری ہوئے۔ اور اپنے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیئے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ ان کی تحریریں نہایت سلیس اور دلکش ہیں۔ اور

بیجا لفاظی اور طوالت سے معرا ہیں۔

مولوی عبدالحق مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقیٔ اُردو کے آنریری سیکرٹری اور رسالہ اُردو کے قابل ایڈیٹر ہیں۔ مولوی صاحب انجمن ترقیٔ اُردو کی رُوح ہیں۔ دکن میں ان کی محنت اور جانفشانی سے زبان اُردو بیحد ترقی کر رہی ہے۔ ان کی زیر نگرانی نہایت مفید تراجم تالیفات تصنیفات اور نایاب عربی فارسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اکثر مطبوعات پر وہ نہایت مفید اور فاضلانہ مقدمے لکھتے ہیں جن سے ان کی تحقیقات علمی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اکثر مضامین رسالہ اُردو اور دوسرے جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مولوی صاحب منکسر المزاج اور خاموش کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی تنقیدیں نہایت عالمانہ اور منصفیانہ ہوتی ہیں۔ اُردو نثر لکھنے والوں میں ان کا رُتبہ بہت بلند ہے ان کی تحریریں نہایت سادہ اور عام فہم ہوتی ہیں۔ زبان پر ان کو پُوری قدرت حاصل ہے۔ سیکسینا صاحب کے نزدیک ان کی طرز تحریر حالی سے ملتی ہے۔ بلکہ زمانہ حال کی ضرورتوں اور جدّت طرازیوں کا خیال کیا جائے تو ان سے بہتر ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم سلیم صاحب بھی موجودہ زمانے کے نامور نثاروں میں سے تھے۔ ان کے والد حاجی مولوی فیروز الدین اپنے وطن پانی پت میں شاہ شرف علی قلندر کے مزار کے متولّی تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سلیم لاہور گئے۔ وہاں عربی کی تکمیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کی۔ اور معقول و منقول مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھے۔ انٹرنس اور منشی فاضل بھی پاس کیا۔ ابتدا میں قانون کی طرف خیال تھا۔ لیکن ریاست بہاولپور کے محکمہ تعلیم میں کوئی جگہ مل گئی۔ پھر رام پور ہائی سکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے کچھ دنوں بعد اُن کے مربّی اور قدردان جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کا ناگوار حادثہ پیش آیا۔ جس سے دل برداشتہ ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ اور پانی پت آ کر مطب اور دواخانہ کھول لیا۔ مولانا حالی کی وساطت سے سرسید سے ملاقات ہو گئی۔ اور وہ ان سے مل کر اس قدر خوش ہوئے کہ اپنا

پرائیویٹ سکرٹری بنا لیا سلیم صاحب سرسید کی زندگی بھر ان کے ساتھ رہے۔ وہ سرسید کی تصنیفات اور مضمون نگاری میں بہت اعانت کرتے تھے۔

سرسید کے بعد انہوں نے رسالہ معارف نکالا جو کچھ مدت کامیابی سے چلا۔ پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے علی گڑھ گزٹ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مگر تھوڑے دنوں بعد بوجہ علالت دست بردار ہو گئے۔ اس کے بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر ہوئے۔ مگر مسجد کانپور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے پر یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی۔ پھر زمیندار اخبار کے چیف ایڈیٹر ہوئے۔ لیکن اس کی ضمانت ضبط ہو جانے سے ان کا تعلق بھی منقطع ہو گیا۔

مضمون نگاری اور ترجمے کی شہرت سے ان کو دار الترجمہ حیدرآباد میں بلایا گیا۔ جہاں انہوں نے وضع اصطلاحات تصنیف کی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو پہلے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اُردو ہوئے۔ اور چار برس بعد پروفیسر ہو گئے۔

سلیم مرحوم کی طرز تحریر نہایت زوردار سلیس اور معنی خیز ہے۔ ان کے ہاں کہیں کہیں جذبات نگاری کے مرقعے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ غیر مانوس عربی فارسی الفاظ کے شائق نہیں۔ بلکہ مولانا حالی کی طرح شیریں اور سُریلے الفاظ اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں وضع اصطلاحات ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے "تُلسی داس کی شاعری" اُردو دیومالا اور "عرب کی شاعری" پر اعلےٰ درجے کے مضامین انہوں نے رسالہ اُردو میں لکھے تھے۔

شیخ عبدالقادر | خان بہادر سر عبدالقادر ادب اُردو کے مستقل محسنوں میں سے ہیں۔ آپ لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد لدھیانہ کے محکمۂ مال میں ملازم تھے۔ شیخ صاحب پندرہ برس کے تھے۔ کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۸۹۴ء میں فورمین کرسچین کالج لاہور سے بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور پنجاب آبزرور کے ایڈیٹوریل سٹاف میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں چیف ایڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں اخبار سے قطع تعلق کر کے بیرسٹری کے لئے انگلستان گئے۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ممالک یورپ اور بلاد اسلامی کی سیر کر کے ہندوستان واپس آئے۔ پہلے دو برس دہلی

میں بیرسٹری کی پھر لاہور آگئے۔ ۱۹۱۱ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل ہوگئے۔ اور ۱۹۲۰ء میں یہ عہدہ ترک کر کے لاہور میں پھر وکالت شروع کی۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے عارضی جج ہوئے۔ پھر ایک سال تک اڈیشنل جج بھی رہے۔

۱۹۲۳ء میں لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور پھر ڈپٹی پریزیڈنٹ اور پریزیڈنٹ بھی ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیمات ہوئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں بین الاقوامی لیگ کے ساتویں اجلاس میں ہندوستان کی طرف سے نمائندہ ہو کر جینوا گئے۔ شیخ صاحب موصوف آج کل انگلستان میں ہیں۔ اور اپنے فرائض منصبی نہایت نیکنامی سے ادا کر رہے ہیں۔ ۱؎ پبلک اور گورنمنٹ کے نزدیک نہایت عزیز اور محترم ہیں۔

شیخ صاحب کو زبان اُردو کے ساتھ ایک خاص لگاؤ ہے۔ ایک زمانہ میں اپنے زمانۂ حال کے شعرا اور نثاروں پر انگریزی میں ایک لکچروں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جو کتاب کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ اور ادبی دُنیا میں بیحد مقبول ہیں۔

۱۹۰۱ء میں شیخ صاحب نے رسالہ "مخزن" جاری کیا۔ ۱۹۱۱ء تک آپ خود ہی اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس رسالہ کے ذریعے انہوں نے اُردو ادب کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں جو اُردو زبان کی تاریخ میں سُنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان کے رسالے میں ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ شیخ صاحب نے اپنے حُسن اخلاق سے ہر خیال کے ادیبوں کو اُردو زبان کی خدمت کے لئے اس طرح اپنا ہم خیال کر لیا تھا۔ کہ اس کی نظیر ہندوستان میں کوئی دوسرا رسالہ پیش نہیں کر سکا۔

شیخ صاحب کے زمانے کے مخزن کے چیدہ چیدہ مضامین انتخاب مخزن کے نام سے کئی جلدوں میں چھپے ہیں۔ نیز شیخ صاحب کے اپنے مضامین بھی الگ شائع ہوگئے ہیں۔ جو بیش قیمت معلومات اور پُر لطف خیالات کا مجموعہ ہیں۔ اور اپنی سادہ اور دلچسپ طرز تحریر کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہیں ؎

۱؎ شیخ صاحب موصوف انڈیا کونسل کے ممبر [illegible]

پنڈت منوہر لال زتشی پنڈت صاحب ۱۸۷۶ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت کنہیا لال وہاں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں ملازم تھے۔ ۱۸۸۸ء میں والد کا انتقال ہوا۔ ۱۸۹۴ء میں انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۸۹۵ء میں ٹریننگ کا امتحان پاس کر کے کسی سکول میں ٹیچر ہو گئے۔ ۱۹۰۲ء میں ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ اور اول رہے۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۱ء تک ٹریننگ کالج الہ آباد میں پروفیسر رہے۔ اس مدت میں انگریزی اُردو رسالوں میں عالمانہ مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں ہیڈ ماسٹر رہنے کے بعد انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ ایک سال بنارس یونیورسٹی کے رجسٹرار اور ایک سال ٹریننگ کالج الہ آباد کے پرنسپل بھی رہے۔ ۱۹۱۹ء میں لوکل گورنمنٹ کے انڈر سیکرٹری اور ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے لئے قائم مقام اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات ہوئے۔ جوبلی کالج لکھنؤ کے پرنسپل بھی رہے۔ گلدستہ ادب اور ایجوکیشن ان برٹش انڈیا ان کی تصنیف ہیں۔ ان کے علاوہ غالب اور چکبست پر نہایت فاضلانہ مضمون بھی لکھے تھے۔ اکثر ادبی مباحثوں میں بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے۔ کُتب بینی کا بہت شوق تھا۔ بہت منصف مزاج اور غیر جانب دار نقاد تھے۔ اور کبھی کبھی پُرانے رنگ اور زمانہ حال کے زبردستی کے شاعروں کی خوب خبر لیتے تھے "

منشی دیا نرائن نگم منشی دیا نرائن نگم ۱۸۸۲ء میں کانپور میں ایک معزز کایستھ خاندان میں پیدا ہوئے ان کے دادا منشی شیو سہائے مشہور وکیل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیئرمین تھے۔ نگم صاحب نے ۱۸۹۹ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے بی۔ اے کیا۔ اور اسی سال اپنا مشہور معروف پرچہ "زمانہ" نکالا۔ ۱۹۱۲ء میں "آزاد" جاری کیا جو چند روز روزانہ رہ کر ہفتہ وار ہو گیا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہو گئے تھے۔

نگم صاحب معاشی۔ سیاسی۔ علمی۔ ادبی۔ تعلیمی اور اخباری مشاغل میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ اصلاح معاشرت کے معاملات میں نہایت آزاد خیال اور سیاسیات میں اعتدال پسند ہیں۔ رسالہ "زمانہ" ان کو بہت محبوب ہے۔ وہ اب تک نہایت کامیابی سے جاری ہے۔

اور نگم صاحب اپنا عزیز وقت اور روپیہ اس پر بے دریغ صرف کرتے ہیں۔ اس رسالے کے ذریعہ سے وہ اُردو ادب کی جلیل خدمات انجام دے رہے ہیں۔ "زمانہ" کی بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس میں ہندو مسلمان برابر کا حصّہ لیتے ہیں۔ اور اعلیٰ درجے کے علمی ادبی مضامین اس میں نکلتے رہتے ہیں۔ ان کے اپنے مضامین نہایت عمدہ اور غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ نگم صاحب ہندوستانی اکاڈیمی کے بھی پُر جوش ممبر ہیں۔

لالہ سری رام دہلوی لالہ سری رام ایم۔ اے دہلی کے ایک مشہور خاندان سے تھے۔ جس کا سلسلہ اکبر کے وزیر راجہ ٹوڈر مل سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگ سلاطین مغلیہ کے عہد میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے تھے۔ ان کے والد آنریبل رائے بہادر مدن گوپال ایم۔ اے بار ایٹ لا، اور عم بزرگوار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کو کون نہیں جانتا۔ آشوب فن تعلیم کے ماہر اور آزاد اور حالی کے دوست تھے۔

لالہ سری رام ۱۸۷۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں پاکر اپنے والد کے ساتھ لاہور گئے۔ وہاں ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں ایم۔ اے اور منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف ہوئے۔ لاہور اور امرتسر میں چند سال منصفی کی۔ آخر دمہ کی شدت سے ۱۹۰۱ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ بقیہ عمر علمی مشاغل اور جائداد کے انتظام میں صرف کی۔ وہ نہایت قابل۔ خوش تقریر۔ خلیق اور ملنسار تھے۔ ان کا خاندان ہمیشہ سے علم و فضل پبلک خدمات اور سخاوت و امارت کی وجہ سے مشہور رہے۔ لالہ صاحب کی لائبریری میں نادر قلمی کتابوں اور دیوانوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔[۱]

لالہ صاحب تذکرہ ہزار داستان المعروف خمخانۂ جاوید کے مصنف ہیں۔ اس تذکرے کی چار ضخیم جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اور ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اس کی ترتیب میں انہوں نے بیحد محنت اور روپیہ صرف کیا ہے۔ اس تذکرہ کو اگر نظم اُردو کی انسائیکلوپیڈیا یعنی قاموس الاعظم کہیں تو بیجا نہیں۔ اس کے ذریعے سے سینکڑوں گمنام شاعر روشناس

۱؎ یہ کتابیں لالہ کے انتقال کے بعد [illegible]

ہوئے۔ جن میں سے بعض کا ذکر ہم تک نہ پہنچتا تو کوئی ہرج نہ تھا۔ انداز بیان اس قدر مہذب ہے کہ اچھوں کا تو ذکر ہی کیا بُروں کو بھی بُرا نہیں کہا۔ بعض جگہ کچھ غلط بیانیاں بھی ہو گئی ہیں۔ جن کی بعض لوگوں نے تصحیح کر دی ہے اتنی بڑی کتاب میں غلطیاں ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ فاضل مصنف نے نہایت محنت سے ہر شاعر کے چوٹی کے اشعار منتخب کئے ہیں۔ عبارت بھی نہایت سلیس اور با محاورہ ہے۔

لالہ صاحب نے ۱۸۹۸ء میں دیوان انور اور ۱۹۰۲ء میں مہتاب داغ اور ضمیمہ مہتاب داغ بھی نہایت عمدگی سے شائع کیا تھا۔

دیگر نثاران اُردو آجکل نامور اُردو نثاروں کی بہت کثرت ہے۔ ان کے حالات لکھنے کے لئے ایک علیحدہ تذکرے کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہاں ان کے نام ہی لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) پنڈت بشن نرائن دَر۔ وہ شاعر بھی تھے۔ اور اُردو اور انگریزی میں نہایت فاضلانہ تنقیدیں لکھا کرتے تھے۔ سرشار کے متعلّق ان کے مضامین اور شیخ عبد القادر کے نیو سکول آف اُردو لٹریچر پر ان کی تقریظ بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔

(۲) مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ ڈپٹی کلکٹر۔ نہایت خوشگو شاعر اور سخن سنج ہیں ان کا کلام نہایت صاف اور زور دار ہوتا ہے۔ میر اور سودا کے متعلق ان کے مضمون نہایت عمدہ ہیں۔ سکسینا صاحب نے بھی ان سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

(۳) احسن مارہروی۔ فن تنقید میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ دیوان ولی کو نہایت قابلیّت سے مرتب کیا ہے "اُردو شکر" ان کی تصنیف ہے۔ اس میں نظم اُردو کی درجہ بدرجہ ترقیوں کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے۔ ان کے خیالات آزاد اور زبان زوردار ہوتی ہے۔ لیکن ذاتیات کی بحث بدمزگی پیدا کر دیتی ہے۔

(۴) حامد اللہ افسر۔ رشید احمد صدیقی۔ سیّد مسعود حسن رضوی۔ عبد المجید سالک۔ پروفیسر نامی۔ پروفیسر ضامن علی لکچرار اُردو الہ آباد یونیورسٹی اُردو زبان کے نہایت اعلیٰ درجے

کے ادیب ہیں۔

(۵) حسرت موہانی۔ نظم اُردو اور فن تنقید میں عدیم المثال ہیں۔ ان کے خیالات اکثر طبع زاد اور مؤثر ہوتے ہیں۔

(۶) سلطان حیدر جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہیں۔

(۷) سید سجاد حیدر بلدرم۔ افسانہ نما نثر بہت خوب لکھتے ہیں۔ ان کی عبارت نہایت دلچسپ اور دلفریب ہوتی ہے۔ ترکی بھی جانتے ہیں۔ خیالستان ان کی مشہور تصنیف ہے چند اور کتابوں کے بھی مصنّف ہیں۔

(۸) مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار۔ اخبار نویسی میں خاص شُہرت رکھتے ہیں۔ زبردست مضمون نگار اور محسن زبان ہیں۔ ان کی اکثر تصانیف چھپ چکی ہیں۔ نظم بھی بہت خوب کہتے ہیں۔

(۹) مولانا ہاشمی فرید آبادی۔ بہت سی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ ادبائے دکن میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱۰) مہدی حسن۔ بہت اچھے لفظی مصوّر اور صاحب طرز تھے۔ افادات مہدی کے نام سے ان کے مضمون چھپ گئے ہیں۔ افسوس کہ جوانی میں فوت ہو گئے ؛

جدید نثر اُردو کی دو طرزیں زمانہ حال میں ادیبوں نے اسقدر طرزیں اختیار کی ہیں۔ کہ ان پر رائے زنی کرنی بہت دشوار ہے۔ یہاں صرف دو مخصوص طرزوں کا ذکر کیا جاتا ہے ؛

پہلی طرز
عربی اُردو اور ہندی اُردو

اکثر لوگ اپنی عبارت میں عربی فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ اس لئے استعمال کرتے ہیں۔ کہ عبارت شاندار معلوم ہو۔ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ سر سید اور ان کے رفقا نے سیدھی سادی عبارت لکھنی شروع کی۔ تھوڑی مدّت بعد یہ طرز جدّت پسند طبیعتوں کو روکھی پھیکی معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ انہوں نے اس میں رنگینی اور علمیّت ظاہر کرنے کے لئے عربی فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کرنے شروع

کردیئے۔ اس طرز کو سرسید کی طرز کا ردِ عمل کہا جا سکتا ہے۔

سیلینا صاحب کے نزدیک اس طرز کے مخترع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں میں وہ خرابیاں اور لغزشیں مطلق نہیں ہوتیں۔ جو ان کے مقلدوں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ یہ طرزِ تحریر ان لوگوں کو نہایت مرغوب ہے۔ جو مذہب کے دعویدار ہیں۔

اس مذہبی طرز کے مقابلے میں ہندوؤں نے بھی ایک نئی طرز اختیار کی۔ جس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت استعمال کرنے شروع کیئے۔ لیکن خدا کا شکر ہے۔ اس قسم کی تحریریں ایک مختصر جماعت تک محدود ہیں۔ اور بہی خواہانِ اُردو اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

دوسری طرز خیالی یعنی ٹیگوری اُردو

یہ طرز سر رابندرا ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف گیتان جلی کے تتبع میں اختیار کی گئی ہے۔ لیکن نقالوں کی تحریروں میں سوائے تسلسل الفاظ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ نہ تو تصوّف سے واقف ہیں اور نہ حقیقی تخیئل کو جانتے ہیں ان کی تحریریں عام طور پر مطلق العنان ہوتی ہیں۔ اور مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اس قسم کی نثر افسانہ سے شروع ہوئی ہے۔ اس طرز سے بہت سے لوگ بے تکلفانہ نثار بن بیٹھے جس سے ادب اُردو کو کچھ نہ کچھ ضرور فائدہ پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ طرز اب بالکل غیر مقبول ہو گئی ہے۔

پُرانی اخباری دُنیا

۱۸۳۶ء میں پریس کو آزادی ملی۔ ۱۸۳۶ء میں مولانا آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے دلّی سے اُردو کا سب سے پہلا اخبار جاری کیا۔ یہ ادبی شان کا پرچہ تھا۔ اس میں ذوق۔ غالب۔ مومن اور معاصرین کی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ کبھی زبان اور محاورات کی بحث پر بھی مضامین چھپتے تھے۔ اُستاد ذوق کی وفات کی تاریخیں اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ بھی مسلسل اس میں چھپا تھا۔

۱۸۶۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ ریاستوں میں بھی مقبول تھا۔ مہاراجہ کشمیر و پٹیالہ اس کی اور اس کے مالک کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے

ہفتہ وار تھا۔ پھر دو مرتبہ ہو کر تین بار نکلنے لگا۔ آخر میں اس کو انہی لوگوں کے ہاتھوں زوال ہُوا جو اس میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے یہاں سے کام سیکھ کر دوسرے پرچے نکالنے شروع کر دیئے۔ منشی نولکشور بھی اس کے سٹاف میں تھے۔

پھر شعلہ طور اور مطلع نور کانپور سے پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے۔ اشرف الاخبار دہلی سے، وکٹوریا سیالکوٹ سے۔ قاسم الاخبار بنگلور سے۔ کشف الاخبار بمبئی سے۔ کارنامہ لکھنؤ سے اور جریدۂ روزگار مدراس سے نکلے۔ مگر تھوڑی تھوڑی مدّت بعد بند ہوتے گئے۔

اودھ اخبار منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں جاری کیا جو اب تک نکلتا ہے۔ اور اپنے صُوبے کے اعلیٰ درجے کے اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔ شروع میں اس میں محض خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جو انگریزی اخباروں اور تاروں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ اس کی کوئی خاص پالیسی بھی نہیں تھی وہ محض سیاسی شورش کے خلاف تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر روزانہ ہو گیا اس کا سٹاف بھی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ شمس الاخبار مدراس اس کا معاصر تھا۔ جو مسلمانوں کا اخبار تھا۔ وہ تھوڑی مدّت چل کر بند ہو گیا۔ اخبار عام لاہور سے پنڈت مکند رام نے نکالا تھا۔ پہلے وہ کوہ نور میں ملازم تھے۔ یہ پرچہ مدتوں گورنمنٹ میں مقبول رہا۔ اسکی خصوصیت یہ تھی۔ کہ اس کی کم قیمت نے لوگوں کے دلوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا۔ اسکی زبان اخباری تھی۔ اور اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی تھی پہلے یہ پرچہ ہفتہ وار تھا۔ پھر سہ روزہ اور دو روزہ ہو گیا تھا۔

"اودھ پنچ" ہندوستان کا مشہور ظرافت کا پرچہ لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں جاری ہُوا۔ وہ ہر بات نہایت آزادی سے ظریفانہ انداز میں لکھتا تھا۔ اس کی انشاپردازی اعلےٰ درجے کی ہوتی تھی۔ وہ کسی خاص فرقہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ منشی سجاد حسین اس کے قابل ایڈیٹر تھے اس اخبار کی سینکڑوں نے نقالی کی لیکن اس معیار پر کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس پرچے نے اخباری دُنیا میں ترقی کے نئے راہ کھول دیئے۔

۱۸۸۳ء میں ہندوستانی لکھنؤ سے نکلا۔ یہ پہلا پرچہ تھا۔ جو سیاسیات پر بڑے زور سے بحث کرتا تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر سہ روزہ ہو گیا۔ اس کی زبان میں ادبیت نہیں تھی۔ اسی شان کا دوسرا پرچہ لاہور سے رفیق ہند نکلتا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں لاہور سے مولوی محبوب عالم نے پیسہ اخبار نکالا۔ جو ارزاں قیمت اور عمدگی مضامین کے باعث مدتوں مقبول رہا۔

ادبی اُردو رسالے

ادبی رسالوں میں مولانا شرر کا دلگداز بہت پُرانا رسالہ ہے۔ جو ابھی نکل رہا ہے۔ زمانہ کانپور سے منشی دیانرائن نگم نکالتے ہیں۔ ادیب الہ آباد کا نہایت عمدہ رسالہ تھا۔ مگر تھوڑی مدت بعد بند ہو گیا۔ الناظر مولانا ظفر الملک کا نہایت آزاد خیال پرچہ ہے۔ ہزار داستان لاہور میں صرف افسانے نکلا کرتے تھے۔ شباب اُردو اور ہمایوں ابتک لاہور سے نکل رہے ہیں۔ نگار کو مولانا نیاز فتح پوری آجکل لکھنؤ سے شائع کرتے ہیں۔ اُردو ادب کا سب سے سستا اور عمدہ پرچہ مولانا تاجور کا ادبی دُنیا ہے۔ جو لاہور سے بڑی شان و شوکت سے نکلتا ہے۔

موجودہ دَور میں ہمایوں لاہور۔ معارف اعظم گڑھ اور اُردو اورنگ آباد کا بہترین ادبی رسالہ ہے۔ سہیل علی گڑھ سے بہت درخشندہ مستقبل لے کر نکلا تھا۔ لیکن تھوڑی مدت بعد بند ہو گیا۔ ایک زمانہ میں مولانا حسرت موہانی کا اُردوئے معلّٰی بھی بہت پایہ کا پرچہ تھا۔

سب رسائل کے نام گنوانا بہت مشکل کام ہے۔ اکثر رسائل بڑی آب و تاب سے نکلتے رہتے ہیں۔ اور بہت جلدی ناکامیاب ہو کر بند ہو جاتے ہیں۔ اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کے حالات لکھنے کی ان تنگ صفحات میں گنجائش نہیں۔ ادبی رسالوں کے ایڈیٹروں میں مولانا ظفر الملک بشیر احمد ایڈیٹر البشیر۔ اور علامہ تاجور نجیب آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اخباروں کے ایڈیٹروں کے متعلق مولوی محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور نے "اخبار نویسوں کے حالات" کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے۔ جو قیمتی معلومات سے لبریز ہے۔

باب ۱۷

اردو ناول کی ابتدا

شرر اور سرشار کا زمانہ

اُردو کے پُرانے قصے | افسانے اور قصے سُننے کا شوق انسان کے دل میں بہت مدتوں سے ہے۔ جب اُردو زبان نے مستقل حیثیت اختیار کی تو اس میں بھی افسانوں اور قصوں کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ بہت سے قصے فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئے۔ بعض سنسکرت سے براہ راست اُردو میں تبدیل ہوئے۔ بعض عربی کے ذریعے آئے۔ یا دونوں زبانوں کے قصوں سے گھٹا بڑھا کر اخذ کئے گئے۔

ان قصوں میں شجاعت۔ جنّوں اور پریوں کے ذکر ہیں۔ بعض اخلاقی ہیں۔ اور بعض مخرب الاخلاق انداز بیان سب کا ایک ہی طرح پر ہے۔ واقعات بھی تقریباً یکساں ہیں۔ عجائب و غرائب کا ذکر عام طور پر ہر ایک میں ہے۔ انسان دیو پریاں آپس میں بے تکلفانہ ملتے ہیں۔ جادو کا بیان بھی ہر جگہ موجود ہے۔ انداز بیان عام طور پر سادہ ہے کیریکٹر نویسی قطعی نہیں۔ حُسن و عشق کے حالات جادوگروں اور جنّوں کی لڑائیاں۔ آدمیوں کا جانوروں کے قالب میں جانا عام طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ غرض ہر قصہ روزمرہ کے واقعات سے خالی ہے۔ جدّت کہیں نام کو نہیں۔ اکثر یہ قصے فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئے۔ اور اب مطبع نولکشور میں بڑی آب و تاب سے چھپتے ہیں۔

اقسام قصص | (۱) الف لیلہ (۲) بوستان خیال (۳) داستان امیر حمزہ معہ طلسم ہوشربا (۴) قصہ حاتم طائی و باغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصے مثلاً گُل بکاولی۔ کلیلہ دمنہ۔ بیتال پچیسی

سنگاسن بتیسی وغیرہ ۔

مطبع نولکشور لکھنؤ اس قسم کے قصے اکثر مطبع نولکشور میں چھپے ہیں۔ اس مطبع کے بانی منشی نولکشور تھے جو ۱۸۳۶ء میں بستوئی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا آگرے میں سرکاری خزانچی تھے۔ اور والد منشی جمنا داس کچھ کاروبار کرتے تھے منشی نولکشور خود ساختہ آدمی تھے۔ ان کو اخبارات کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک مدت تک ہر سکھ رائے کے ماتحت اخبار کوہ نور لاہور میں کام کرتے رہے۔ جہاں انہیں پریس کا تجربہ ہوا۔ غدر کے بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ میں انہوں نے سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی میں مطبع نولکشور جاری کیا۔ جو بہت جلد ایشیا کے بڑے بڑے مطابع میں شمار ہونے لگا۔

منشی صاحب نے زر کثیر صرف کر کے عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور ہندی وغیرہ کی کمیاب اور نادر کتابیں اور ان کے ترجمے اور شرحیں وغیرہ چھپوائیں۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ ہندوستان کی علمی ترقی کا باعث انہی کی ذات تھی۔ ۱۸۵۸ء میں انہوں نے اخبار اودھ نکالا۔ جو نہایت کامیاب پرچوں میں شمار ہوتا ہے۔

۱۸۹۵ء میں منشی صاحب نے انتقال کیا۔ اور تقریباً ایک کروڑ کا کاروبار چھوڑا۔ ان کے لائق فرزند رائے بہادر منشی پراگ نرائن نے بھی اپنے والد کی طرح خوب علمی خدمات کیں۔ اور اب ان کے فرزند منشی بشن نرائن نہایت کامیابی سے علم و ادب کی خدمات کر رہے ہیں۔

داستان امیر حمزہ صاحبقران یہ کتاب بہت ضخیم جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں فیضی نے اکبر اعظم کی تفریح طبع کے لئے لکھی تھی۔ اس کے آٹھ دفتر ہیں۔ اور ہر دفتر میں صد ہا صفحات کی کئی کئی جلدیں۔ جن کی مجموعی تعداد سترہ ہے۔ سب سے مشہور دفتر اوّل یعنی نوشیروان نامہ دو جلدوں میں اور دفتر پنجم یعنی طلسم ہوش ربا سات جلدوں میں ہے۔ طلسم ہوش ربا کی اوّل چار جلدوں کا ترجمہ میر محمد حسین جاہ اور آخر تین جلدوں کا احمد حسین قمر نے کیا تھا۔ ایک منظوم ترجمہ طوطا رام شایاں نے بھی کیا تھا۔ نوشیروان نامہ کا ترجمہ منشی نولکشور نے شیخ تصدق حسین داستان گو

سے کرایا تھا۔ اس کتاب میں حضرت امیر حمزہ (جو پیغمبر اسلام کے عم بزرگوار تھے) کا فرضی افسانہ لکھا ہے۔ اور اس سے ہزاروں قصّے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔

بوستان خیال یہ کتاب نو ضخیم جلدوں میں چار ہزار صفحات پر ہے۔ اس کے مصنّف میر تقی خیال سمجھے جاتے ہیں۔ جو گجرات کے رہنے والے تھے۔ مگر آخر میں دہلی میں آ رہے تھے۔ یہ قصّہ انہوں نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لئے داستان امیر حمزہ کی طرز پر لکھا تھا۔ اس کتاب کو محمّد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا تھا۔ اور انہی کے حکم سے اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ پانچ جلدوں کا ترجمہ اُردو خواجہ بدرالدین المعروف خواجہ امان دہلوی نے اور دو جلدوں کا لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا۔ اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی۔

افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب سے لوگوں کے دلوں میں افسانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے۔ اگرچہ اس کو ناول نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ناول کی آفرینش میں اس سے بہت مدد ملی۔

مولوی نذیر احمد کے بعض قصّے موجودہ ناول کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ان میں بھی ناول نویسی کے پورے قواعد کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ وہ اوّل سے آخر تک نصیحت آمیز اور ایک وعظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کا یہ بڑا کمال ہے۔ کہ انہوں نے گذشتہ زمانے کی طرز کو چھوڑ کر واقعات زندگی کو اپنے پلاٹ میں بیان کیا۔ زبان پر ان کو پوری قدرت حاصل ہے۔ اور سلسلہ واقعات بھی خوب قائم رکھتے ہیں۔ ان کے کیریکٹر دلچسپ ہیں۔ مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز ہیں۔ اور زبان میں بھی کہیں کہیں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے بعض اوقات دل اکتا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی سلاست اور روانی ان . . . . میں خوب ہوتی ہے۔

اودھ پنچ اور اس کی ادبی خدمات منشی سجاد حسین مرحوم نے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ جاری کر کے ہندوستانی اخبار نویسی اور اُردو ادب میں ظرافت کی بنیاد ڈالی۔ زبان میں نہایت عمدہ الفاظ شامل کئے۔ ناول نویسی کو ترقّی دی۔ اور نہایت بلند نقطہ نظر سے ادبی کتابوں پر تنقیدیں لکھیں اودھ پنچ

سب سے پہلا ترجمہ ہے۔ جس نے پبلک۔ اور گورنمنٹ پر آزاد نکتہ چینی شروع کی وہ ہندوستانی رؤساء کا ناصح اور محتسب۔ سوشل معاملات میں قدامت پسند۔ سر سید کا مخالف۔ تعلیم نسواں اور ترک پردہ کا دشمن۔ اور کانگریس کے اُصولوں کا حامی تھا۔

اودھ پنچ کی ظرافت جب ذاتیات پر آجاتی تھی۔ تو اکثر غیر مہذب ہو جاتی تھی۔ حالی۔ داغ۔ گلزار نسیم اور فسانہ آزاد کے متعلق اکثر مضامین تہذیب سے گرے ہوئے تھے۔ لیکن لکھنؤ کی طرز معاشرت اور سیر تماشے کے مضمون نہایت شاندار اور مزیدار ہوتے تھے۔

منشی سجاد حسین کے بعد اودھ پنچ مُردہ ہو گیا تھا لیکن اس کی عنان ادارت حکیم ممتاز حسین عثمانی نے خود سنبھال کر ایک دفعہ پھر اس کی پُرانی روایات کو زندہ کر دیا۔ اسوقت بھی ہندوستان بھر میں وہ عدیم المثال پرچہ ہے۔

قدیم اور جدید اودھ پنچ کے نامہ نگاروں میں منشی سجاد حسین۔ مرزا مچھو بیگ عاشق (جو ستم ظریف کے نام سے لکھتے تھے) سرشار۔ تربھون ناتھ ہجر۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ اکبر الہ آبادی۔ نواب سید محمد آزاد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ

منشی صاحب کے والد منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر گورنمنٹ سے پنشن لے کر حیدر آباد میں سول جج ہو گئے تھے۔ سجاد حسین کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے انٹرنس پاس کر کے مختلف ملازمتیں کیں۔ آخر ۱۸۷۷ء میں اپنا مشہور اخبار اودھ پنچ لکھنؤ سے نکالا۔ سجاد حسین صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے ظریفانہ اخبار نویسی کی ہندوستان میں بنیاد ڈالی۔ وہ نہایت نیک دل اور غیر متعصب شخص تھے۔ انہوں نے مذہبیت کو اپنے اخبار میں کبھی جگہ نہیں دی۔

ان کی تحریریں معلومات عامہ اور لطیف ظرافت سے مملو ہوتی تھیں۔ عبارت میں شستگی اور بیساختگی ہمیشہ نمایاں رہتی تھی۔ ان کے ناول حاجی بغلول۔ طرحدار لونڈی۔ پیاری دنیا احمق الذین۔ میٹھی چھری۔ کایا پلٹ۔ حیات شیخ چلی بہت مشہور ہیں۔ اور ان کی کامیاب ناول

نگاری کی شہادت دیتے ہیں۔

منشی صاحب ۱۹۱۰ء میں فالج میں مبتلا ہو کر بہت تکالیف کی زندگی بسر کر کے ۱۹۱۵ء میں فوت ہوئے۔ اور ان کا اخبار ۱۹۱۲ء میں بند ہو گیا تھا۔

مرزا چھوبیگ عاشق مرزا محمد مرتضیٰ نام تھا۔ عاشق تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد مرزا اصغر علی شرفائے لکھنؤ میں بہت ممتاز تھے۔ بچپن میں ان کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ شاعری میں نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ وہ رنگین طبع شاعر تھے۔ مگر ادبی دنیا میں اپنی نثر کی بدولت مشہور ہیں۔ ستم ظریف کے نام سے اودھ پنچ میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ ان کے مضامین کی زبان نہایت صاف شستہ اور بذلہ سنجی نہایت لطیف ہوتی تھی۔ وہ خود بھی نہایت ظریف متواضع خلیق اور وسیع الاحباب تھے۔ خود داری اور آزادی کی وجہ سے ملازمت نہیں کرتے تھے۔ سیاسیات میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دفعہ کانگریس کے ڈیلی گیٹ بھی منتخب ہوئے تھے۔ منشی گپتا ان کے مشہور شاگرد تھے۔

تصانیف منظوم۔ گلزار نجات۔ میلاد شریف۔ آفتاب قیامت (لکچر کے انداز میں ظریفانہ نظم) بہار ہند۔ اُردو محاورات کی ناتمام لغات۔ مثنوی نیرنگ خیال۔ چشم بصیرت یعنی مجموعۂ مضامین۔ ان کا دیوان ابھی شائع نہیں ہوا۔

تربھون ناتھ ہجر پنڈت بشمبر ناتھ سپرو کے بیٹے تھے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے کیننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی تعلیم پا کر اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں وکالت بھی کی تھی۔ نہایت شریف اور ملنسار اور ہردلعزیز انسان تھے۔

نواب سید محمد آزاد نواب صاحب ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ وہ مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دولت مند خاندان کے رکن تھے۔ ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی۔ یہ اصفہانی وہی شخص ہیں۔ جن سے مرزا غالب کے ساتھ برہان قاطع کے متعلق معرکے ہوئے تھے نواب صاحب نے انگریزی بھی پرائیویٹ طور پر پڑھی تھی۔ پہلے وہ سب رجسٹرار ہوئے۔ پھر ترقی

کر کے انسپکٹر جنرل ہو گئے۔ دو دفعہ بنگال کونسل کے ممبر ہوئے۔ اور آئی۔ ایس۔ او (امپیریل سروس آرڈر) کا اعزازی نشان ملا۔ ۱۹۱۲ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔

نواب صاحب فارسی اخبار میں مضامین لکھتے تھے۔ اس کے بعد اودھ پنچ۔ اودھ اخبار وغیرہ میں اُردو میں مضامین لکھنے لگے۔ ۱۸۷۶ء میں ان کا مشہور ناول "نوابی دربار" شائع ہوا۔ جس میں فاقہ مست نوابوں کا بڑے ظریفانہ انداز میں خاکہ اُڑایا تھا۔ "نئی لغات" ان کی ظریفانہ رنگ کی مقفیٰ عبارت کی کتاب ہے۔ جو خطوط انہوں نے انگلستان جا کر بھیجے تھے۔ وہ بھی نہایت دلچسپ ہیں۔

جوالا پرشاد برق | برق ۱۸۶۳ء میں سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ کھیری سے انٹرنس اور ۱۸۸۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کر کے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۸۵ء میں منصف ہوئے اور پھر ترقی کر کے قائم مقام ڈسٹرکٹ جج اور سشن جج ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں گریفن کمیٹی کے ممبر ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں پلیگ میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔

وہ نہایت قابل شاعر اور نثار تھے۔ فسانۂ آزاد کی طرز کے بہت دلدادہ تھے۔ انکی مثنوی بہار سر سید مرحوم کو بہت پسند تھی۔ بنگالی دُلہن۔ پرتاب۔ روہنی۔ مرنالنی اور مار آستین وغیرہ بنکم چیٹرجی کے ناولوں کے ایسے ترجمے ہیں۔ جو ترجمہ معلوم نہیں ہوتے۔ شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کے بھی ترجمے کئے تھے۔ مگر وہ شائع نہیں ہو سکے۔

احمد علی شوق قدوائی | شوق مرحوم اسیر کے شاگردوں میں سے تھے۔ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے چند ناٹک نظم و نثر بھی ان کی یادگار ہیں۔ جن میں سے "قاسم و زہرہ" اور "میکفرسن ولوسی" بہت مشہور ہیں۔ مثنوی لکھنے میں وہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ زہر عشق اور مثنوی عالم خیال ان کی بہت مقبول مثنویاں ہیں۔ عالم خیال ایک ستم رسیدہ عورت کی دُکھ بھری داستان ہے۔ جو اپنے شوہر کے انتظار میں بے چین ہے۔ ان کا دیوان بھی شائع ہو گیا ہے۔ فن عروض سے پوری طرح واقف تھے۔ نظم و نثر میں صفائی اور صحت زبان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آخر عمر میں ریاست رامپور سے

تعلق ہو گیا تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار | سرشار ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں ایک معزز کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے چار برس کے تھے۔ کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹے بھائی پنڈت بشمبر ناتھ در ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور بیٹے پنڈت نرنجن ناتھ در سرکاری خزانے میں ملازم تھے۔ وہ جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔

سرشار اپنے زمانہ میں نہایت باکمال اور زندہ دل شخص تھے۔ انگریزی۔ عربی فارسی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ انگریزی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں پائی تھی۔ سب سے پہلے ڈسٹرکٹ سکول کھیری میں ٹیچر ہوئے۔ اسوقت بھی وہ اودھ پنچ اور "مراسلہ کشمیری" میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ سرشار ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ڈائرکٹر تعلیم ان کے تراجم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ انہیں کی معرفت وہ منشی نولکشور کے اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ انہوں نے سائنس کی کسی کتاب کا ترجمہ شمس الضحیٰ کے نام سے کیا ہے جس میں بعض اصطلاحات کا ترجمہ نہایت سلیس اُردو میں ہے۔ اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے زمانہ میں انہوں نے فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع کیا۔ جو ۱۸۸۰ء میں کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ اسی عرصے میں اودھ اخبار اور اودھ پنچ کی اخباری جنگ شروع ہو گئی۔ جس میں سرشار نے ترکی بہ ترکی خوب جواب دیئے۔ آخر دوستوں کی کوشش سے مصالحت ہو گئی۔

سرشار کی تصانیف۔ سیر کہسار۔ جام سرشار۔ کامنی۔ اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں کڑم دھڑم۔ بچھڑی دلہن۔ طوفانِ بے تمیزی۔ پی کہاں وغیرہ میں ان کا زورِ بیان کم ہے۔

حیدر آباد جانے سے کچھ دنوں پہلے الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم ہو گئے تھے۔ لیکن قواعد کی سختی سے تنگ آ کر ملازمت ترک کر دی۔ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدر آباد گئے۔ جہاں حضور نظام نے ان کو معزز درباریوں میں شامل کر لیا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ان کا دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور اپنا کلام نظم و نثر اصلاح کے لئے دیا۔

حیدر آباد میں وہ کچھ عرصے تک دبدبۂ آصفیہ کے ایڈیٹر رہے۔ اس زمانے کی تصانیف

گور غریباں اور چنچل کوئی خاص وقعت نہیں رکھتیں۔ آخر عمر میں مے نوشی بہت بڑھ گئی تھی۔ اسی کی بدولت قبل از وقت ۱۹۰۳ء میں حیدر آباد ہی میں انتقال کیا۔

سرشار شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے۔ اور شعر خوب کہتے تھے۔ ان کی مثنوی تحفۂ سرشار جو انہوں نے پنڈت بشن نرائن در کی انگلستان سے واپسی پر لکھی تھی۔ بہت مشہور ہے۔ اس مثنوی کے ذریعہ انہوں نے قدامت پرست پنڈتوں کے دلوں سے، اس برہمی کو دور کر دیا تھا۔ جو ان کے انگلستان جانے سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک زوردار قصیدہ بھی ۱۸۹۷ء میں کشمیری کانفرنس میں پڑھا تھا۔

اخلاق و عادات سرشار نہایت آزاد مزاج اور ظریف طبع تھے۔ حافظہ بہت اچھا پایا تھا۔ باتیں بڑے مزے مزے کی کیا کرتے تھے افسوس شراب خوری نے ان کی زندگی کا خاتمہ بہت جلد کر دیا۔

انگریزی طرز کے اُردو ناول سب سے پہلے انہی نے لکھنے شروع کئے تھے وہ مشہور مصنّف زبردست جرنلسٹ اور نہایت عمدہ زبان داں تھے۔ اور ایک خاص طرز کے موجد بھی تھے سکسینا صاحب کا خیال ہے انکی شُہرت کو کچھ لوگوں کے تعصب نے اور کچھ انکی بے پروائی نے کم کر دیا۔ انکی تصانیف میں جس قدر رطب و یابس اور گری ہوئی باتیں ہیں۔ وہ ان کے مزاج کی جلد بازی۔ بے پروائی اور شراب نوشی کی وجہ سے ہیں لیکن جہاں شراب ان کا دماغ معطّل اور بیکار کرتی ہے۔ وہاں ان کے تخیئل میں قوت بلند پروازی بھی پیدا کرتی ہے۔ وہ کبھی اپنے مسودہ کو دوبارہ نہیں دیکھتے تھے۔ ہمیشہ برجستہ مضامین لکھتے تھے۔ اگر کبھی قلم نہ ملتا تو تنکے ہی سے کام چلا لیتے تھے۔

مالک مطابع شراب کی بوتل پیش کر کے ان سے جس قسم کا چاہتے فوراً مضمون لکھو لیتے تھے۔ اسی بے اصولی کی وجہ سے اکثر ان کے پلاٹ اور کیرکٹر بے ربط اور غیر مسلسل ہو گئے ہیں۔ باوجود ان کمزوریوں کے وہ خوددار اس قدر تھے۔ کہ کسی امیر و رئیس کی خوشامد نہیں کی۔ اور اپنی شہرت اپنے کمالات سے پیدا کی۔

تصانیف فسانہ آزاد۔ سیر کوہسار۔ جام سرشار۔ کامنی۔ خدائی فوجدار۔ کڑم دھم۔ بچھڑی دلہن۔

ہشو۔ طوفان بے تمیزی۔ رنگے سیار۔ پی کہاں شمس الضحیٰ۔ والیس کی رشیا کا اُردو ترجمہ اور لارڈ فرن کی "لیٹر فرام لیٹی ٹوڈس" کا اردو ترجمہ وغیرہ انکی مقبول تصانیف ہیں ٭

فسانہ آزاد | جب فسانۂ آزاد اودھ اخبار میں نکلتا تھا۔ تو لوگ ہر دوسرے پرچے کیلئے بیتاب رہتے تھے۔ اور اُردو دان حلقوں میں اس کتاب نے ایک عجیب ہلچل ڈال دی تھی۔

قصہ کا پلاٹ بہت بے ربط ہے لیکن عبارت آرائی اس غضب کی ہے۔ کہ ہر سطر پر بے تحاشا ہنسی آتی ہے۔ اور مطالعہ کا شوق مشتعل ہوتا جاتا ہے۔ یہ قصہ ڈھائی ہزار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ لیکن کیا مجال جو کہیں پڑھنے والا بے لطف ہو جائے۔

اصل قصہ کا ہیرو آزاد ہے۔ وہ بہت رنگین مزاج شخص ہے۔ بھٹیاری کا عاشق ہے۔ پھر ایک دولتمند حسینہ پر بھی عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ اس شرط پر عقد کرنے کو طیار ہوتی ہے۔ کہ میاں آزاد رُوسیوں کے خلاف لڑنے کے لئے ٹرکی جائیں۔ آزاد وہاں جاتا ہے اور زندہ واپس آکر اپنی معشوقہ سے نکاح کرتا ہے۔

اس معمولی سے قصّے کو سرشار نے نگار خانۂ چین بنا دیا ہے۔ اس میں ساری دلچسپی اور عمدگی افراد قصہ کی باتوں میں ہے۔ نہ کہ قصہ میں۔ سرشار مکالمہ کے اُستاد ہیں۔ اور کیریکٹر بھی اشخاص کی گفتگو سے دکھاتے ہیں ؛

سرشار کی مرقع نگاری | سرشار نہ تو رجب علی بیگ سرور کی طرح پُر تکلف اور مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں۔ اور نہ سوتی ہوئی دُنیا کی سیر کراتے ہیں۔ ان کے اشخاص قصہ سائے کی طرح ہمارے سامنے سے نہیں گذرتے بلکہ وہ ہماری تمہاری طرح بولتے چالتے اور چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ نہ بُرائیوں کو چھپاتے ہیں اور نہ اچھائیوں کو چمکاتے ہیں۔ بلکہ ہو بہو تصویریں کھینچتے ہیں اور جُزئیات تک بیان کرتے ہیں۔ لکھنؤ کی اعلےٰ و ادنےٰ سوسائٹی کی انہوں نے صحیح ترین تصویریں کھینچی ہیں۔ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ کہ حرم سراؤں کے اندرونی حالات کا مطالعہ انہوں نے کس طرح کیا۔ پھر شوخی اور ظرافت ان کا کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی۔ غرض لکھنؤ کے

مٹتے ہوئے آخری تمدن کے صحیح مرقعے انہوں نے ایسی عمدگی سے کھینچے ہیں۔ کہ اسقدر جزئیات کے ساتھ آجتک کسی نے نہیں لکھے ؎

سرشار کی شوخی اور ظرافت عام طور پر ان کا مذاق مہذب ہے۔ لیکن مضمون کے زور میں اور محاکات کے شوق میں وہ اس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں کہ فواحش کی بھی پروا نہیں کرتے۔ مکالمات لکھنے میں ان کو خاص کمال حاصل ہے۔ ادنیٰ اور اعلےٰ شخص کی بولیاں صاف الگ معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ نہیں کو اپنے دل سے بنا کر کچھ لکھیں۔ واقعی اسوقت سوسائٹی کا یہی حال تھا۔ سرشار پُرانے رسم و رواج کے مخالف اور آزادانہ تحریک کے حامی تھے۔ ان کی نصیحت کا یہ خاص طریقہ ہے کہ وہ پُرانے لوگوں پر خود بھی ہنستے ہیں۔ اور اوروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ اور فتحیاب ہوتے ہیں ؎

سرشار کی کیریکٹر نگاری سرشار کیریکٹر نگاری کے اُستاد ہیں۔ وہ ہو بہو نقشے نہیں کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مبالغہ کو ملا لیتے ہیں۔ وہ اپنے کیریکٹروں کی خصوصیات چُن لیتے ہیں۔ اور انہی میں لطف و ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ بیکینا صاحب کہتے ہیں کہ ان کیریکٹروں کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل نیچر کے مطابق ہیں بلکہ ان کو پڑھو اور ہنسو۔

سرشار کا خاص ہنسنے ہنسانے والا کیریکٹر خوجی ہے۔ حق یہ ہے۔ اُردو ادب اب تک اس کا مدمقابل پیدا نہیں کرسکا۔ وہ ظرافت کی دُنیا کی عجیب ترین مخلوق ہے ؎

سرشار نے اپنے ناولوں سے ان نیچرل چیزوں کو خارج کر دیا سرشار کی تصانیف کی یہ خاص صفت ہے۔ کہ اس میں انسانی زندگی کے اصلی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اور غیر فطری واقعات سے قطعی احتراز کیا گیا ہے۔ مولوی نذیر احمد میں اور سرشار میں یہ فرق ہے کہ مولوی صاحب کے قصّے محض اخلاقی ہیں۔ اسوجہ سے ان میں دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ لیکن سرشار کے قصے محض دل کو بہلانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اور یہی زمانۂ حال کے ناولوں کی اصلی غرض ہے جس کو سرشار نے سب سے پہلے عملی جامہ پہنایا ہے ؎

نقائص سرشار (۱) پلاٹ مربوط اور منظم نہیں۔ اس کی وجہ ان کی بے پروائی اور بے قاعدگی

معلوم ہوتی ہے۔

(۲) واقعات میں عدم تسلسل ہے کیریکٹروں میں ہمواری اور یک رنگی نہیں۔ وہ وقتی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اور کیریکٹروں کے خصائص ان کے دماغ میں نہیں رہتے۔ اسوجہ سے ان کو نباہ نہیں سکتے۔

(۳) کبھی ان کا تخیئل بہت بلند ہوتا ہے۔ اور کبھی بہت پست۔ یہ خرابی شراب نوشی۔ فطری بے پروائی۔ اور بہت زیادہ لکھنے کا نتیجہ ہے۔

(۴) فلسفہ اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ بحیثیت واعظ کے ان کی تحریریں بے مزہ ہیں جب اس کوچہ میں وہ قدم رکھتے ہیں۔ تو سرشار معلوم نہیں ہوتے۔

(۵) جذبات نگاری کی کمی ہے۔ اور جہاں کہیں ہوتی ہے۔ مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

(۶) بعض جگہ فحش اور اخلاق سے گرے ہوئے بیانات بھی ہیں۔ اس کے دو جواب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُس سوسائٹی کا رنگ یہی تھا۔ دوسرے جب تک کسی کی خوبیاں اور عیوب نہ دکھائیں جائیں اس کی اصلیت ظاہر نہیں ہوسکتی۔

(۷) ان کے قصوں میں کیریکٹر بہت ہیں۔ جن کی وجہ سے واقعات کا تسلسل پڑھنے والیکے دماغ میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی انکی تصانیف سے اُردو ادب میں بے انتہا ترقی ہوئی ہے۔

سرشار بحیثیت صاحب طرز سرشار بحیثیت ماہر زبان اور صاحب طرز کے بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ صاف سلیس۔ بامحاورہ اور زوردار عبارت لکھنے میں وہ اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اور بہ حیثیت صاحب طرز کے گو وہ مولانا آزاد سے دوسرے نمبر پر ہوں۔ مگر اور سب سے وہ ضرور بڑھے ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسی طرز اختیار کی جو افسانہ نویسی کے واسطے نہایت موزوں تھی۔ ان کی تصانیف میں لوگ نفس قصہ سے زیادہ عبارت میں دلچسپی لیتے ہیں کبھی کبھی وہ ضرورت سے زیادہ محاورات اور اصطلاحات صرف کرتے ہیں۔ لیکن اسکی وجہ وفور خیالات اور قدرت زبان کہی جاسکتی ہے۔

سرشار اور سرور کا مقابلہ مرزا رجب علی بیگ سرور کے ہاں تکلف اور آورد بہت ہے۔ اور سرشار کی عبارت بالکل بے تکلّف اور نیچرل ہے۔ سرور چیزوں کا بیان کرتے ہیں۔ اور سرشار آدمیوں کا۔ سرور خیالی تصویریں کھینچتے ہیں تصویروں کے محاسن کو اُبھارتے ہیں! ور معائب کو چھپاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سرشار بالکل سچّی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اور اچھّائیاں بُرائیاں سب ظاہر کر دیتے ہیں۔

سرور کے مرقعے اسوجہ سے دلچسپ اور حسین ہیں۔ کہ وہ جن چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔ ان سے خود اس قدر محبّت رکھتے ہیں۔ کہ ان میں کوئی عیب نہیں دیکھتے۔ اور سرشار جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچتے ہیں اس کو پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنی محبّت اور ناراضگی کو کہیں نہیں چھپاتے۔ سرور قدامت پسند ہیں۔ اور زمانۂ قدیم سے تعلّق رکھتے ہیں۔ سرشار زمانۂ حال اور مستقبل دونوں سے تعلّق رکھتے ہیں، اور فنونِ لطیفہ کو قدامت سے چھُڑانا چاہتے ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انکے خاندان کو واجد علی شاہ کے خاندان سے بہت وابستگی تھی۔ انکے والد حکیم تفضل حسین بادشاہ کے ساتھ مٹیابرج کلکتہ میں جا رہے تھے۔

شرر نو برس کی عمر میں لکھنؤ میں کچھ ابتدائی تعلیم پاکر کلکتہ گئے۔ مٹیابرج میں اپنے والد اور مختلف اساتذہ سے معقولی ادبی منطقی اور طبّی عربی فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ اور کچھ انگریزی بھی پڑھی۔ بچپن ہی سے ان کو اخباروں کا شوق تھا۔ اخبار اودھ کو نامہ نگار کی حیثیت سے خبریں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ۱۹ سال کی عُمر میں کلکتہ سے لکھنؤ آ گئے۔ اور مولوی عبدالحی سے کتب درسیہ ختم کیں۔ ۲۰ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ اسوقت ان کو حدیث کا کچھ ایسا شوق ہوا کہ دہلی آکر مولوی محمّد نذیر حسین محدّث دہلوی سے ان کے مدرسے میں حدیث کی تکمیل کی۔ پھر انگریزی شروع کی اور پرائیویٹ طور پر بہایت محنت سے اس میں بھی بقدر ضرورت دستگاہ پیدا کرلی۔

اسی زمانے میں منشی احمد علی کسمنڈوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اودھ پنچ وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ انکے شوق دلانے سے شرر بھی بعض اخبارات میں مضمون بھیجنے لگے۔ جن میں بجائے

سیاسیات کے انشاپردازی کا مذاق زیادہ ہوتا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے ان کو اپنے اخبار میں لے لیا۔ یہ ان کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ انہوں نے نہایت زور شور سے مضامین لکھنے شروع کئے۔ جن میں فلسفہ کے ساتھ معنیٰ آفرینی اور ادبی مذاق خوب ہوتا تھا۔ ان مضامین سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ حیدر آباد اور مختلف ریاستوں نے ان کو بلایا لیکن انہوں نے ریاستی ملازمت پسند نہیں کی۔ انہی دنوں انہوں نے رُوح پر ایک عالمانہ مضمون لکھا جسکا کچھ حصہ اخذ کرنے کے لئے سر سیّد نے منشی نولکشور کے ذریعے اُن سے اجازت مانگی تھی

اسی زمانے میں انہوں نے اپنے دوست مولوی عبد الباسط کے نام سے محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا۔ اسکا رنگ عبارت اس قدر دلکش تھا۔ کہ ہر طرف دُھوم مچ گئی۔ انہوں نے اٹھارہ انیس نمبروں میں محض صبح کا سماں دکھایا۔ اس نئی طرز سے ادبی دُنیا حیرت میں پڑ گئی۔ یہ رنگ پہلے اُردو میں نہیں تھا۔ اس میں فارسی کی تشبیہیں اور استعارے تھے۔ لیکن بندشیں انگریزی تھیں۔ گویا انگریزی خیالات کو اُردو فارسی کا لباس پہنایا تھا۔ انہوں نے قافیہ بندی رعایت لفظی اور جا بجا اشعار چسپاں کرنے سے بھی پرہیز کیا۔ شروع میں اس طرز عبارت کو نباہنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ لیکن تھوڑی مدت میں انکی عبارت نے ایک خاص طرز اختیار کر لی۔ اور یہ طرز ایسی مقبول ہوئی۔ کہ ساری اخباری دُنیا اور انشا پردازی پر چھا گئی۔ شرر کے وہ مضامین جو اودھ اور محشر میں نکلے دستیاب نہیں ہوئے۔ ورنہ ہندوستان ان کی اُسوقت سے زیادہ اب قدر کرتا۔

منشی نولکشور نے نامہ نگار کی حیثیت سے مولانا کو حیدر آباد بھیجا۔ وہ چھ مہینے بعد وہاں سے واپس آنا چاہتے تھے۔ لیکن منشی صاحب اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لئے ۱۸۸۲ء میں انہوں نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ اور وہاں سے چلے آئے۔

اس زمانے میں ان کا سب سے پہلا ناول دلچسپ نکلا۔ جس میں وقتوں اور حالتوں کا سماں باندھا ہے۔ چونکہ یہ رنگ بالکل نیا تھا۔ اس لئے اکثر جگہ پیچیدہ اور اُلجھا ہُوا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے برباد ہوتے ہیں۔ سال بھر بعد اس کا

دوسرا حصہ نکلا جو پہلے حصے کے عیوب سے پاک تھا۔ اور اس کے رنگ میں پختگی آگئی تھی۔

اس کے دو سال بعد مولانا نے بنکم چیٹرجی کے ناول درگیش نندنی کا انگریزی ترجمے سے ترجمہ کیا۔ اور اس میں بہت سی خوبیاں پیدا کیں۔

اب اُردو دان طبقہ مولانا کے مضامین کا بیحد مشتاق ہو گیا تھا مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر اور منشی نثار حسین نثار مالک پیام یار کے اصرار سے ۱۸۸۷ء سے مولانا نے دلگداز نکالا۔ اس ماہوار رسالے میں خاص طور پر ان کے اپنے مضامین نہایت عمدہ ہوتے تھے کسی خیال کو بغیر قافیہ بندی تشبیہ اور استعارے کے دلچسپ بنانا شرر ہی کا حصہ تھا۔ اُردو کا خزانہ اسوقت تک ایسے مضامین سے خالی تھا۔

۱۸۸۷ء سے دلگداز میں ان کے مسلسل ناول نکلنے لگے۔ ملک العزیز ورجنا۔ حسن انجلینا منصور موہنا وغیرہ میں انہوں نے مورخانہ شان سے قدیم واقعات کو ناول کے رنگ میں دکھایا۔ یہ ناول اس قدر مقبول ہیں کہ بیسیوں ایڈیشن چھپتے ہیں اور بک جاتے ہیں۔

شرر کے ناولوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلامی تاریخ کو انہوں نے بہت گہری نظروں سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کے تاریخی ناولوں میں واقعات کی تحقیق کے ساتھ سیدھے سادے الفاظ میں خیال آرائی غضب کی ہے۔ انہوں نے اپنے آخری ناولوں (ایام عرب اور فلورا فلورنڈا) میں جاہلیت کے زمانہ کی عرب کی سوسائٹی اور اسپین کے اسلامی دَور کو ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے۔ کہ پڑھتے پڑھتے جی سیر نہیں ہوتا۔ فردوس بریں میں بھی ایران کے باطنی فرقے کی جنت اور ان کی فریب کاریوں کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی ہیں۔

۱۸۹۰ء میں مولانا نے "مہذب" اخبار نکالا جس میں علمائے اسلام کے سوانح عمری مسلسل لکھے جاتے تھے۔ یہ پرچہ بھی مسلمانوں میں بہت مقبول تھا۔ ۱۸۹۱ء میں وہ دلگداز اور مہذب کو بند کر کے حیدر آباد گئے اور وہاں سے دو سو روپے پانے لگے۔ ۱۸۹۵ء میں نواب وقار الامرا بہادر نے اپنے چھوٹے لڑکے کو مذہبی تعلیم دینے کے لئے مولانا کو

انگلستان بھیج دیا۔ شرر وہاں تقریباً چودہ پندرہ مہینے رہے۔ اس مدت میں انہوں نے وہاں فرانسیسی زبان اس قدر سیکھ لی کہ ڈکشنری کی مدد سے ترجمے کر لیتے تھے۔

۱۸۹۸ء میں انہوں نے حیدر آباد سے دلگداز پھر جاری کیا۔ اور اس میں سکینہ بنت حسینؑ کے حالات تاریخی تحقیقات کے بعد لکھنے شروع کئے۔ جس سے مسلمانوں میں شورش پیدا ہوگئی۔ نظام گورنمنٹ کے عہدے داروں نے ان کو ہدایت کی کہ اس سلسلہ کو بند کر دیں۔ لیکن اس مضمون کو بند کرنے کی بجائے انہوں نے رسالہ ہی بند کر دیا۔ جس کو جاری کئے ہوئے گیارہ ماہ ہوئے تھے۔

۱۹۰۰ء میں لکھنؤ آکر انہوں نے پھر دلگداز جاری کیا۔ اور سکینہ بنت حسینؑ کا بقیہ حصہ پورا کیا۔

شرر حیدر آباد سے اجازت لے کر لکھنؤ آرہے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ان کو واپس بلا لیا گیا۔ وہ دلگداز بند کر کے حیدر آباد چلے گئے۔ اب ان کے ہمدرد وقار الامرا ریاست سے علیحدہ ہو کر انتقال کر چکے تھے۔ اور ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کہیں اور تعینات ہوگئے تھے۔ مسٹر واکر منتظم فنانس ریاست میں مولانا کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اور نئے مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد ان سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ آکر ادب اُردو کی خدمت میں مصروف ہوگئے اور دلگداز کو پھر جاری کر دیا۔ جو ان کی تمام زندگی جاری رہا۔

شرر کی طرزِ تحریر اُردو کے مجددوں میں سرسید نہایت سادہ اور زوردار عبارت لکھنے والوں میں تھے۔ وہ مشکل سے مشکل مضمون ایسی نفاست سے ادا کرتے تھے۔ کہ عالم و عامی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔ مولانا آزاد کی زبان میں بے تکلفی۔ روانی اور اس کے ساتھ شاعرانہ تشبیہیں اور استعارے نہایت اعتدال کے ساتھ ہوتے تھے۔ مولوی نذیر احمد کے ہاں روانی اور بے تکلفی خوب ہے۔ لیکن متانت پیدا کرنے کے لئے اس میں جا بجا انگریزی عربی فارسی ثقیل الفاظ نظر آتے ہیں۔ سرشار کی تحریروں میں کوئی جدت نہیں۔ ہاں ظرافت خوب ہے۔ وہ لکھنؤ کی اعلیٰ اور ادنےٰ طبقے کی زبان بڑی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔

شرر نے ان سب سے علیحدہ ہو کر ایک جداگانہ طرز اختیار کی۔ انہوں نے انگریزی انشاپردازی

کی خوبصورت بندشوں کو اُردو میں داخل کیا۔ لیکن تشبیہات اور استعارات وہی ایشیائی رکھے خیالی مضامین میں انگریزی جادو نگاروں کی سی آفرینیاں کیں۔ اور انشا پردازی کے لئے ایک نیا راستہ تیار کر دیا۔ ایسے ایسے مضامین لکھ دیئے کہ ان پر کوئی شخص قلم اُٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ "غریب کا چراغ" "لالہ خودرو" "دیہات کی لڑکی" وغیرہ سے ان کے زورِ طبع کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کی طرزِ تحریر سادہ حیثیت میں متین محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ خیال آفرینی کے لحاظ سے وہ تخیلات کا دریا ہے۔ انسانی جذبات پر وہ اس قدر قادر ہیں۔ کہ ہر قسم کے خیالات بہت آسانی سے پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ہر چیز کی تصویر کو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ÷

تاریخی ناول لکھ کر مولانا نے عام پبلک کو تاریخ سکھا دی۔ تاریخی مضامین وہ گہری تحقیق اور کاوش کے بعد لکھتے تھے۔ ان کی اسلامی عہد کی "تاریخ سندھ" اور "تاریخ ارض مقدس" بڑی تحقیق اور تدقیق کی کتابیں ہیں۔

مولانا رسم ورواج کے خلاف اور تقلید سے گریزاں تھے۔ اہلحدیث کی طرف مائل تھے آزادی خیال اور تحقیق کی بنا پر بعض مسائل میں اہلحدیث سے بھی علیحدہ تھے۔ علما ان کے اکثر خلاف تھے۔ کیونکہ مستند تاریخوں سے انہوں نے ثابت کیا تھا۔ کہ امام حسینؑ کے صاحبزادے امام زین العابدین نے حضرت شہر بانو کا عقد اپنے غلام زبید سے کر دیا تھا۔ اور دوسرا واقعہ وہی سکینہ بنت حسینؑ کی لائف کا تھا۔ پھر انہوں نے پردے کی مخالفت میں ۱۹۰۰ء میں "پردۂ عصمت" نام رسالہ نکالا۔ جس سے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے "اتحاد" پندرہ روزہ جاری کیا۔ جس کا مقصد ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنا تھا ÷

۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۶ء تک	(۱) اس مدت میں دلگداز کئی دفعہ بند ہو کر جاری ہوا۔

(۲) ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے اخبار ہمدرد کی ادارت کے لئے ان کو دو سو روپے ماہوار پر دہلی بُلایا۔ لیکن وہ چند مہینے دہلی میں رہ کر اخبار نکلنے سے پہلے لکھنؤ

چلے گئے۔

(۳) ۱۹۱۸ء میں حضور نظام نے اپنی سوانح عمری لکھنے کو حیدر آباد بلایا۔ لیکن بعد میں سوانح عمری کی بجائے تاریخ اسلام لکھنے کو کہا۔ اس کام کے لئے ان کو لکھنؤ میں ایک معقول رقم ماہ بماہ بھیج دی جاتی تھی۔ یہ تاریخ تین حصّوں میں لکھی گئی۔ اس کی پہلی جلد شائع ہوکر عثمانیہ یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہوگئی ہے۔

مولنا شرر نے تقریباً آٹھ نو رسالے اور اخبار نکالے۔ اور ایک سو دو کتابیں لکھیں۔ ان کے مضامین جو دلگداز میں چھپا کرتے تھے۔ آٹھ جلدوں میں مضامین شرر کے نام سے لاہور میں شائع ہوگئے ہیں۔

مرزا محمد ہادی رسوا	مرزا صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی ہیں۔ شعر گوئی میں مرزا اوج مرحوم

کے شاگرد ہیں۔ جوانی میں ان کو مرزا غالب کا رنگ مرغوب تھا۔ مگر اب وہ نازک خیالیاں اور عبارت آرائیاں پسند نہیں رہیں۔ ان کا کلام صاف سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ہوتا ہے۔ اس لئے اب ان کو مومن کا پیرو کہا جا سکتا ہے۔ آجکل مرزا صاحب دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

مرزا صاحب کا ناول "امراؤ جان ادا" نہایت اعلےٰ درجے کا ناول ہے۔ اس میں سب سے بڑی صفت یہ ہے۔ کہ پلاٹ اور کیریکٹر نہایت منظم اور نمایاں ہیں۔ کسی بیان میں مبالغہ نہیں۔ ہر چیز کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ اس کو لکھے ہوئے تین برس سے زیادہ ہوگئے لیکن وہ اب بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

مثنوی نوبہار۔ صبح امید۔ مرقع لیلیٰ مجنوں (ڈرامہ) ذات شریف (ناول) بھی انہی کی تصانیف ہیں۔

حکیم محمد علی	حکیم صاحب طبیب تخلّص کرتے تھے۔ وہ ایک مشہور ناول نگار تھے۔ لیکن ان کو

اعلیٰ درجے کا ناول نگار نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اپنے زمانہ کے رنگ سے بیخبر ہونے کے علاوہ اس

سوسائٹی کے جذبات سے بھی واقف نہیں تھے۔ جس کو وہ اپنے ناولوں میں بیان کرتے ہیں۔ فطرت انسانی اور جذبات لطیف سے پوری طرح واقف نہیں معلوم ہوتے۔ ان کی عبارت میں یکرنگی ہے۔ مگر پند و نصائح سے غیر دلچسپ اور بے اثر بنا دیتے ہیں۔

عبرت۔ حسن سرور۔ دیول دیوی۔ گورا۔ رام پیاری۔ جعفر و عباسیہ۔ اختر حسینہ۔ نیل کا سانپ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ جن میں سے بعض انگریزی ناولوں کے ترجمے ہیں۔

راشد الخیری ناول نویسی میں ان کو مولوی نذیر احمد مرحوم کا جانشین کہنا چاہیئے۔ انکے مضامین عموماً عورتوں کی تعلیم و ترقی اور اُن کی دُکھوں بھری زندگی کے متعلق ہوتے ہیں۔ چونکہ عبارت نہایت دردانگیز لکھتے ہیں۔ اس لئے مُصورِ غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کی تصانیف بکثرت ہیں۔ جن میں صبح زندگی۔ شام زندگی۔ نوحہ زندگی۔ عروسِ کربلا۔ زہرہ۔ سراب مغرب وغیرہ مشہور ہیں۔

ان کی عبارت تصنع سے پُر ہوتی ہے۔ اور جب پڑھنے والا ان کی طرز تحریر سے ایک دفعہ واقف ہو جاتا ہے۔ تو ان کی دوسری تصانیف پڑھنے میں کوئی خاص لطف نہیں آتا۔ کیونکہ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ محدود معلوم ہوتا ہے اس لئے ہر کتاب میں ہر پھر کر انہی الفاظ اور محاورات وغیرہ کا اعادہ ہوتا ہے۔

نیاز فتحپوری نیاز محمد خاں فتحپور میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کر کے اسلامیہ فتحپور۔ مدرسہ عالیہ رام پور۔ اور ندوۃ العلماء کے دار العلوم میں تعلیم پائی۔ حدیث مولنا عین القضاۃ لکھنوی سے پڑھی۔ ایف۔ اے تک پرائیویٹ تعلیم حاصل کی۔ اور ترکی زبان کسی تُرک سے سیکھی۔

نیاز مختلف روزانہ اخباروں میں کام کرتے رہے ہیں۔ اب تقریباً دس سال سے سالہ نگار نکالتے ہیں۔ نگار پہلے بھوپال سے جاری کیا تھا۔ آجکل اسکا دار الاشاعت لکھنؤ میں منتقل کر لیا ہے۔

نیاز کی طرز تحریر سب سے علیحدہ ہے۔ وہ نظم نما نثر کو پسند کرتے ہیں۔ جب یہ رنگ اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ تو پڑھنے والا بہت بے لطف ہوتا ہے۔ انہوں نے ٹیگور کی گیتان جلی کا

نہایت شاندار ترجمہ کیا ہے۔ "کیوپڈ اور سائیکی" اور "مریخی سیاح کی ڈائری" انکی طبع زاد کتابیں ہیں۔ گہوارۂ تمدّن اور شاعر کا انجام بھی نہایت دلچسپ اور عمدہ تصانیف ہیں۔ گہوارہ تمدّن میں ترقی تمدّن میں عورتوں کے حصّہ لینے کی بحث ہے۔ ان کا رسالہ نگار نہایت عمدہ ادبی رسالہ ہے۔ لیکن ذاتیات کی بحث اور مذہبیات کا مضحکہ اُڑانے سے اب اس کی پہلی سی قدر نہیں رہی۔

خواجہ حسن نظامی خواجہ حسن نظامی دِلّی میں ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین اولیاء کے خواہر زادے ہیں۔ وہ اکثر ابتدا ہی سے اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصے تک گورنمنٹ کو ان پر شکوک رہے۔ اور مدتوں ان کی نگرانی ہوتی رہی۔

خواجہ صاحب ہندوستان کے بہت بڑے صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کا حلقۂ اثر بہت زیادہ وسیع ہے۔ ان کی تصانیف بے شمار ہیں۔ اور ان کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ نہایت معمولی معمولی مضامین کو نہایت دلکش اور مؤثر طریقے سے نبھاتے ہیں۔ اور نئے نئے الفاظ وضع کرتے ہیں۔ عبارت نہایت سادہ اور دلکش ہوتی ہے۔ فقرے بالکل چھوٹے چھوٹے اور عام فہم ہوتے ہیں۔ لیکن خیالات میں گہرائی نہیں ہوتی۔ ان کے اس قسم کے مضامین پڑھ کر لطف خوب آتا ہے۔ لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

خواجہ صاحب کی کرشن بیتی۔ یزید نامہ۔ محرّم نامہ اور غدر دہلی کے افسانے بہت مشہور ہیں۔

منشی پریم چند منشی صاحب کا اصلی نام دھنپت رائے ہے۔ لیکن منشی پریم چند کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ ۱۹۳۷ سمت (۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال بنارس کے قریب موضع پانڈے پور میں رہتے تھے۔ سات برس کے تھے۔ کہ ماں کا انتقال ہوا اور پندرھویں برس میں باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ سات آٹھ سال فارسی پڑھ کر بنارس سے انٹرنیس پاس کیا۔ اور محکمہ تعلیم میں ملازمت کر لی۔

منشی صاحب نے ۱۹۰۱ء سے "زمانہ" میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ۱۹۰۴ء میں ایک

ہندی ناول پریما لکھا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار اور ۱۹۱۸ء میں بازار حسن کے دونوں حصے تصنیف کئے۔ اردو کی طرح ہندی میں بھی ان کو کمال حاصل ہے۔ سیوا سدن۔ پریم آشرم۔ رنگ بھوم اور کایا کلپ ان کے ہندی مشہور ناول ہیں۔ جن کے اردو میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں۔

منشی صاحب کو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ وہ ہندوستانی دیہاتوں کے ہو بہو نقشے اور کسانوں کے سچے واقعات نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مبالغہ بالکل نہیں ہوتا۔ عبارت میں زور۔ استعاروں اور تشبیہوں میں لطافت ہوتی ہے۔ وہ جذبات اور نفسیات کے زبردست ماہر معلوم ہوتے ہیں حقیقی ظرافت اور درد ان کے کیریکٹروں کو جیتی جاگتی تصویریں بنا دیتا ہے۔

تھوڑی مدت سے منشی صاحب ہندی کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ اس لئے اردو دانوں تک ان کے خیالات ترجمہ ہو کر پہنچتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں پریم پچیسی (۲ حصے) پریم بتیسی (۲ حصے) جن میں چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں۔ بہت مقبول ہیں۔ وفات ۸ راکتوبر ۱۹۳۶ء۔

سدرشن موجودہ زمانہ میں سدرشن بھی بہت اچھا لکھنے والوں میں ہیں۔ وہ لاہور میں رہتے ہیں اور ہندی اردو رسالوں کے ایڈیٹر ہیں۔ منشی پریم چند کی بہت سی خصوصیات ان میں بھی موجود ہیں۔ لیکن ان سے کم درجے پر ہیں۔ ان میں منشی پریم چند کا سا کمال ابھی پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی عبارت میں صحت اور ادبیت بھی ابھی کمال کو نہیں پہنچی۔

سدرشن بے شمار کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ جو پنجاب میں عام طور پر مقبول ہیں "محبت کا انتقام" پہلے ہندی میں لکھا تھا۔ پھر اردو میں ترجمہ کیا۔ اس پر پنجاب گورنمنٹ نے پانسو روپیہ انعام دیا تھا۔ وہ آجکل "چندن" نام اردو رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ جس کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

دیگر ناول نگار ناول نگاروں کی بیحد کثرت ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل لوگ مشہور ہیں۔

(۱) حامد اللہ افسر میرٹھی۔ عمدہ شاعر اور نقاد ہیں۔ افسانے بھی بڑی مہارت سے لکھنے

ہیں۔ ان کی اکثر کتابیں سرشتہ تعلیم میں منظور ہو چکی ہیں۔

(۲) مجنوں گورکھپوری۔

(۳) احمد حسین خاں ایڈیٹر شباب اُردو۔

(۴) ایم۔ اسلم۔

(۵) حکیم احمد شجاع۔

(۶) مولوی ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ممالک اودھ جاسوسی قصّے لکھنے میں خاص طور پر مشّاق ہیں۔ نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری ان کے مقبول عام ناول ہیں۔

(۷) پنجاب کے رسائل میں اکثر خواتین کے لکھے ہوئے دلچسپ افسانے اور قصّے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

باب ۱۸

اُردو ڈراما

اُردو ڈراما غیر ملکی صنف ہے۔ یہ اُنیسویں صدی میں اُردو میں داخل ہُوا۔ اور اب خوب ترقّی کر گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

ڈرامے کی عمومیّت نقالی کا شوق انسان میں فطری ہے۔ خواہ کوئی قوم مہذّب ہو یا غیر مہذّب نقالی کا جذبہ اس میں ضرور ہوتا ہے۔ اسلام نے اس جوش کو بدعت کے خوفناک لفظ سے دبا دیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ فارسی اور عربی سے اِس قسم کے نمونے اُردو میں نہیں آئے۔ کیونکہ یہ زبانیں اہل اسلام کے زیرِ اثر تھیں۔ اہل فارس اس جذبے کو زیادہ مدّت تک نہیں روک سکے۔ ان کے ہاں ڈراما مذہبی صورت میں آ ہی گیا۔ یعنی واقعات کربلا کی نقالی جس کو پیشن پلے کہتے ہیں ان کے ہاں

رائج ہوگئی۔ انگلستان اور یورپ والوں نے ڈرامے کو تبلیغ کا ذریعہ قرار دیا۔ اور مریکل پلے اور مسٹری پلے کے ذریعے اپنے پیغمبروں کے معجزے اور قدیم مسیحی رسوم کی تبلیغ کرنی شروع کی۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی میں بھی مذہبی ڈرامے موجود ہیں۔ جو اب تک کیف آور موسیقی اور عمدہ اخلاقی نتائج کی وجہ سے لوگوں کی تفریح کا باعث ہوتے ہیں ⁂

سنسکرت اور ہندی ڈرامے نے اُردو پر کیوں اثر کیا

یہ نہایت تعجب خیز بات نظر آتی ہے۔ کہ اُردو پر سنسکرت ڈراموں کا کیوں اثر نہیں پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ سنسکرت ڈرامے کا عملی دور گذر چکا تھا۔ اور اب وہ محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ شروع میں بُدھ مت اور جین مت والے ڈراموں کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ڈرامے کو تبلیغ کا کامیاب طریقہ دیکھ کر انہوں نے اس کو اختیار کیا۔ بُدھ مت کا ڈرامہ راجہ ہرش اور اشوک کے زمانے میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ لیکن جب بودھ مت کو زوال اور برہمنوں کو عروج ہوا تو ملک میں غیر اقوام کے حملوں سے مفلسی اور بے اطمینانی پھیل چکی تھی۔ اس لئے ڈرامے کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوتی گئی جب ادنیٰ لوگوں نے ڈرامے کی کمپنیاں کھولیں تو ڈرامے کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی بلکہ ایکٹروں کو بھی ذلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اس کام کے نااہل ہاتھوں میں پڑنے سے ڈرامے کے مضمون بعض اوقات فحش کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔

اس زمانے میں اُردو جنم لے رہی تھی۔ سنسکرت ڈرامہ محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ اور ہندی ڈرامہ بہت ذلیل حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو پہلے ہی سے فارسی کے آغوش محبت میں آ گئی تھی۔ اور سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور فارسی دان مسلمانوں کے سنسکرت نہ جاننے سے اُردو شروع ہی سے سنسکرت نظم اور ڈرامے سے بے اثر رہی ⁂

اُردو ڈرامے کے عناصر خمسہ

مسٹر عبداللہ یوسف علی (آئی۔ سی۔ ایس) نے اُردو ڈرامے کے مندرجہ ذیل عناصر قرار دیئے ہیں۔

(۱) قدیم سنسکرت ڈراما۔

(۲) ہنود کے خالص مذہبی ناٹک یا مریکل پلے اور دیوتاؤں کے حالات۔

(۳) سوانگ اور نقلیں وغیرہ جو ادنےٰ قسم کے لوگوں میں رائج ہیں۔

(۴) اسلامی نظمیں اور قدیمی روایات۔

(۵) زمانۂ حال کا انگریزی ڈرامہ اور یورپین سٹیج کی ترقیاں۔

(۱) سنسکرت ڈرامہ اگرچہ سنسکرت ڈرامے کا اُردو پر بہت کم اثر پڑا۔ لیکن اب بعض مشہور ناٹکو ترجمہ اُردو میں ہوگیا ہے۔ اور ان کو سٹیج پر بھی دکھایا جاتا ہے۔ تھوڑی مدّت سے سنسکرت ڈرامے کے پُرانے قواعد بھی استعمال میں آنے لگے ہیں۔ مثلاً ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے ایک شخص معہ اپنی بیوی کے سٹیج پر آتا ہے۔ اور ڈرامہ کا مختصر پلاٹ بیان کرتا ہے۔ مسخرے کا پارٹ بھی ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اچھے ڈراموں میں اصل کھیل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(۲) ہندو مریکل پلے اس قسم کے ناٹکوں نے موجودہ اُردو ڈرامے کے لئے بہت کچھ مواد فراہم کیا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو اُردو ڈراما کی ابتدا انہی ہندی ناٹکوں سے ہوئی ہے۔ قدیم زمانے سے ہندو رام اور کرشن کے مشہور واقعات کو ناٹک کی صورت میں دکھایا کرتے تھے۔ تاکہ عوام اپنی مذہبی روایات کو بھول نہ جائیں۔ اور حقیقتاً یہ ناٹک لوگوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر کرتے تھے۔ اس طرح کرشن اور رادھا کے عاشقانہ واقعات بھی اُردو ڈرامے کا جزو ہیں۔ بلکہ بنگالی اور ہندی شاعری تو اسی رنگ سے رنگین ہے۔ عوام کی دلچسپی کے لئے بہت سی دیسی کمپنیاں گاؤں میں اسی قسم کے مذہبی کھیل دکھاتی پھرتی تھیں۔ غالباً انہی جماعتوں سے واجد علی شاہ بادشاہ نے ناٹک کا پہلا سبق سیکھا تھا۔ اپنے محل میں وہ خود کنہیا اور ان کی محلیں گوپیاں بنا کرتی تھیں۔ سکسینا صاحب کے نزدیک یہ ناچ اور گانا جو اُردو ڈرامے کا جزو لاینفک ہے۔ انہی منڈلیو کی نقل ہے۔ اور ممکن ہے۔ کہ فرنچ اوپیرا کا بھی اس پر اثر ہو۔ کیونکہ واجد علی شاہ کے زمانے میں ان کے انگریز دوستوں کی وجہ سے یہ وہاں مروج تھا۔

لے سکسینا صاحب کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے۔

سوانگ اور نقلیں وغیرہ سوانگ بہت قدیم زمانے سے ہندوؤں کے تہواروں اور شادیوں کے موقعہ پر جلوس اور باجوں کے ساتھ نکلتے تھے۔ ان کو ابتدائی بھدّی نقالی سمجھنا چاہیئے۔ مگر عنصر ظرافت (کومک) ان میں ضرور پایا جاتا ہے۔ پُرانے زمانے میں اکثر نقال مسخرے امیروں کا دل خوش کرنے کے لئے ان کی ملازمت میں رہتے تھے۔ نقالی اس زمانہ میں ایک مشکل فن تھا جس کی تکمیل کے لئے ناچنا اور گانا بھی ضروری تھا۔ ملکہ ایلزبیتھ کے زمانہ میں انگلستان میں بھی یہی رسم تھی۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ ملکہ ایلزبیتھ کے زمانے کے مسخرے ہی ترقّی یافتہ ڈرامے کے اصلی پیشرو ہیں۔

ہندوستان میں نقالوں کی جماعتیں "طائفہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اپنے گانوں اور نقلوں وغیرہ سے سامعین کو محظوظ کرتی ہیں۔ اور انہی نقلوں سے آجکل کے کامک ڈرامے ماخوذ ہیں۔

اسلامی نظمیں اور روایات یہ اُردو ڈرامے کا عنصر غالب ہیں۔ نظم اُردو عاشقانہ رنگ اور ڈرامانگاری کے لئے خاص موزونیت رکھتی ہے۔ اور نثر بھی رزم بزم جذبات نگاری اور ہر موقعہ پر نہایت پُرزور طریقے سے کام دے سکتی ہے۔

انگریزی سٹیج اُردو سٹیج آجکل انگریزی ڈراموں کے ترجموں سے بھری ہوئی ہے۔ انگریزی سٹیج کا اُردو ڈرامے پر بہت زیادہ اثر ہے۔ تھیٹر کی ساخت۔ پردے۔ لباس۔ نشستوں کا انتظام۔ تماشے کی تقسیم۔ وغیرہ سب انگریزی ڈرامے کے اُصولوں پر عمل میں آتے ہیں۔

اُردو ڈرامے کی دو قسمیں (۱) طبع زاد ڈرامے بہت کم ہیں۔ اور جس قدر ہیں۔ سیاسی یا معاشی مبحث پر ہیں۔

(۲) ترجمے بکثرت ہیں۔ اور ان میں اندھا دُھند مغربی تقلید ہے۔

تراجم کے ماخذ (۱) سنسکرت۔ (۲) یورپین ڈراموں کے ترجمے۔ (۳) فارسی قصّے۔ (۴) دیسی زبانیں خاص کر بنگلہ۔ مرہٹی۔ اور زیادہ تر ہندی۔

قصوں کے مضامین حسب ذیل چیزوں سے ماخوذ ہیں۔

(۱) پوران اور ہندو دیو مالا۔

(۲) فارسی عربی قصے۔

(۳) ہندوستان کی مشہور روائتیں اور قصے۔

(۴) انگریزی قصے۔

(۵) مسائل حاضرہ مثلاً سیاسی یا معاشرتی اصلاح۔

اُردو ڈرامے پر شاہی درباروں کا اثر سب سے پہلا اُردو ڈراما "اندر سبھا" ہے۔ جس کو امانت شاگرد ناسخ نے تصنیف کیا ہے۔ سیکسینا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ یہ کتاب واجد علی شاہ بادشاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ لیکن امانت کی اپنی تحریر برآمد ہوگئی ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے۔ کہ یہ ڈراما کسی شاگرد کی فرمائش پر تصنیف ہوا ہے۔

ایک ہندی شاعر "نواز" نے فرخ سیر کے زمانے میں شکنتلا ناٹک کا برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ مگر اس کو ڈرامہ سمجھنا غلطی ہے۔ کیونکہ وہ دوہوں کی صُورت میں ہے۔ اور صحیح ترجمہ بھی نہیں۔ کیریکٹر اور ایکشن جو ڈرامے کی جان ہے۔ اس میں کہیں نام کو نہیں پائے جاتے۔

شاہی زمانے میں نقالوں اور بہروپیوں کا بہت زور تھا مشہور ہے۔ جب محمد شاہ بادشاہ دہلی (محمد شاہ رنگیلے) پر نادر شاہ نے حملہ کیا۔ تو بادشاہ سلامت اسوقت راگ رنگ میں مصروف تھے۔ کسی شخص کی ہمت نہ تھی۔ کہ ان کے عیش میں خلل انداز ہو۔ آخر ایک نقال نے نقل کے ذریعے سے اس خطرے سے ان کو آگاہ کیا۔ اس زمانے کے نقال اپنے ہُنر میں بڑے مشّاق ہوتے تھے۔ وہ ہر بات کو نہایت خُوبصورت طریقے سے ایکٹنگ کے ذریعہ پیش کرتے تھے۔ یہی حالت واجد علی شاہ بادشاہ کے دربار کی تھی۔ ان بادشاہوں کے دربار عیش و عشرت سے کوہ قاف کا سماں پیش کرتے تھے۔ اُردو ڈرامے نے ایسے درباروں میں جنم لیا۔ عیش پرست اُمرا مسرت اندوزیوں کے نئے نئے طریقے سوچتے تھے۔ چنانچہ ایک

فرانسیسی نے "اپیرا" کی تجویز پیش کی جو منظور کرلی گئی۔ اس کے لئے ہندوستان کے حسین ترین آدمی دربار میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ انہی عیش کوشیوں سے متاثر ہوکر امانت نے اندرسبھا لکھی تھی۔

یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوسکا کہ یورپ والوں نے اُردو ڈرامہ کی ترقی میں کوئی حصّہ لیا یا نہیں۔ مولانا شررؔ کا خیال تھا۔ کہ کسی یورپین نے اُردو ڈرامے کی ترقی میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ ہندوستان کے مشہور نامہ نویس محمّد عمر نورالٰہی نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ کہ یورپین لوگوں نے ڈرامہ کو ترقّی دی۔ قرائن سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ڈرامے کو زمانۂ حال کے مطابق بنانے میں یورپ والوں نے کچھ نہ کچھ ضرور مدد دی ہوگی۔ لیکن مولانا شررؔ اور پروفیسر مسعود حسن کی قطعی رائے ہے۔ کہ فرانسیسیوں نے اس میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

اندرسبھا امانت

امانت نے ۱۸۵۲ء میں اندرسبھا لکھی۔ جو کامیڈی ہے۔ چونکہ اس میں گانا اور ناچ بھی ہے۔ اس لئے موسیقی دار کامیڈی ہے۔ جو اوپیرا کی ایک قسم ہے۔

سیکینا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ قیصر باغ میں اس کے لئے سٹیج تیار ہوئی۔ بادشاہ خود راجہ اندر بنے اور حسین لڑکیوں نے پریوں کا پارٹ ادا کیا۔ لیکن یہ بیان غلط ہے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ کہ واقعی واجد علی شاہ کو رہسوں کا بڑا شوق تھا۔ لیکن وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں میں تقسیم کردیتے تھے۔ اور کنہیا کا پارٹ بجائے مرد کے ہمیشہ عورتوں کو دیتے تھے۔ اور خود کبھی کنہیا نہیں بنتے تھے اسلئے یہ بھی بعید از عقل ہے کہ وہ کبھی راجہ اندر خود بنتے ہوں گے۔

اندرسبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے۔ وہ شائع ہوتے ہی بیحد مقبول ہُوا۔ اس کی دھنیں اور گیتیں بڑے بڑے اُستادوں نے قائم کی تھیں۔ لباس اور پردے بھی نہایت پُرتکلف تھے۔ اس کی کامیابی دیکھ کر مداری لعل نے بھی ایک اندرسبھا لکھی۔ جو ادبی حیثیت سے

امانت کی اندر سبھا سے بہتر نہیں۔ ہمیشہ سے لوگ اندر سبھا کو اور تماشوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہوا۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کے چالیس نسخے موجود ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں جرمنی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا تھا۔

اُردو ڈراما اور پارسی ہندوانی تماشوں کو دیکھ کر چند نوجوان پارسیوں کے دل میں خیال آیا کہ رُستم اور سہراب وغیرہ کے قدیمی ایرانی قصے بھی سٹیج پر دکھائے جائیں۔ چنانچہ چند امیر کاروباری پارسیوں نے دہلی۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی تھیٹروں کی نقل پر چند کمپنیاں قائم کیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پیسٹن جی فرام جی کی تھی۔ سیٹھ صاحب اُردو میں خوب شعر کہتے تھے۔ اور رنگ اور پروین تخلص کرتے تھے۔ یورپ کی کمپنیاں دیکھے ہوئے لوگ بھی ان کمپنیوں کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔

اوریجنل تھیٹریکل کمپنی اس کمپنی کے بانی فرام جی تھے۔ وہ خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کرتے تھے خورشید جی بالی والہ کاؤس جی کھٹاؤ۔ سہراب جی۔ اور جہانگیر جی ان کے مشہور ایکٹر تھے۔ اسوقت تماشے ایسی اُردو میں ہوتے تھے۔ جو ہندوستان کے تمام لوگ سمجھ سکیں۔ اور اندر سبھا کی تقلید میں نظم میں ہوتے تھے۔ تاکہ کانوں کو خوش آیند معلوم ہوں۔

اس کمپنی میں رونق بنارسی اور میاں حسینی ظریف ڈراما نگار تھے۔ رونق بمبئی میں رہتے تھے۔ وہ انگریزی سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ "انصاف محمود شاہ" انہوں نے ۱۸۸۲ء میں گجراتی میں لکھا تھا۔ ظریف کے بہت سے ڈرامے ہیں۔ جن میں نتیجۂ عصمت۔ خداد وست چاند بی بی بلبل بیمار بہت مشہور رہیں۔

جب فرام جی کا انتقال ہو گیا۔ تو بالی والہ اور کاؤس جی نے اپنی اپنی کمپنیاں علیحدہ قائم کر لیں۔

وکٹوریہ ناٹک کمپنی یہ کمپنی خورشید جی بالی والہ نے قائم کی تھی۔ جو ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں بھی موجود تھی۔ خورشید جی خود بہت مشہور اور صاحب کمال ایکٹر تھے۔ وہ کامک پارٹ بہت خوب ادا

کرتے تھے۔ ان کو سٹیج پر دیکھ کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹ ہو جاتے تھے۔ رُستم جی۔ مس خورشید۔ مس مہتاب۔ مس میری فنٹن ان کے مشہور ایکٹر تھے۔ مس میری یورپین تھیں۔ لیکن ہندوستانی چیزیں خوب گاتی تھیں۔ یہ کمپنی انگلستان بھی گئی تھی۔ مگر وہاں بہت نقصان پہنچا جو بمبئی میں پورا ہُوا۔

طالب بنارسی منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی وکٹوریہ کمپنی کے ڈرامہ نویس تھے۔ وہ شعر گوئی میں راسخ دہلوی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ڈرامہ کی زبان اور مضامین کو بہت ترقی دی۔ لیل و نہار (ترجمہ)، وکرم ولاس۔ دلیر دل شیر۔ نازاں۔ نگاہ غفلت۔ ہریشچندر۔ گوپی چند وغیرہ ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہُوا۔

الفرڈ تھیئٹریکل کمپنی وکٹوریا کمپنی کے مقابلے میں کاؤس جی کھٹاؤ نے الفرڈ کمپنی قائم کی۔ برخلاف خورشید جی کے کاؤس جی رنج و غم کا پارٹ کرنے میں کامل الفن تھے۔ ان کو لوگ ہندوستان کا ارونگ کہتے تھے۔ مرض ذیابیطس میں انہوں نے ۱۹۱۴ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ منچیر شاہ گُلزار خاں۔ مادھورام۔ ماسٹر موہن۔ ماسٹر منچیر جی۔ مس زہرہ۔ اور مس گوہر ان کی کمپنی کی مشہور ایکٹریس تھیں۔ کاؤس جی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر جی نے چار پانچ سال کمپنی چلا کر کلکتہ کے تاجر مسٹر میڈن کے ہاتھ بیچ دی۔ میڈن کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہُوا۔

احسن لکھنوی الفرڈ کمپنی کے سب سے پہلے ڈرامہ نگار احسن لکھنوی تھے۔ جن کا نام سیّد مہدی حسن تھا۔ وہ نواب مرزا شوق مصنّف مثنوی زہر عشق کے نواسے تھے۔ احسن کامل ڈرامہ نگار خوش گو شاعر اور نہایت عمدہ موسیقی داں تھے۔ ان کے ڈراموں کی زبان نہایت با محاورہ اور صاف ہے۔ فیروز گلنار۔ چندراولی۔ دلفروش۔ بھُول بھلیاں۔ بکاؤلی۔ چلتا پُرزہ ان کی ڈرامیٹک تصانیف ہیں۔ واقعاتِ انیس ان کی ادبی تصنیف ہے۔ جس میں میر انیس کے سوانح عمری نہایت عمدگی سے لکھے ہیں۔

بیتاب دہلوی | احسن کے بعد کمپنی کی ڈرامانگاری پنڈت نرائن پرشاد بےتاب کے سپرد ہوئی جو فنِ شعر میں سردار محمد خاں طالب شاگرد غالب کے شاگرد تھے کبھی کبھی اپنا کلام نظیر حسین سخا کو بھی دکھاتے تھے۔ یہ کمپنی کے باقاعدہ ملازم تھے۔ اور بمبئی میں رہتے تھے۔ ایک رسالہ "شیکسپیر" بھی نکالتے تھے۔ جس میں مشہور ڈراموں کے ترجمے چھپتے تھے۔ قتل بے نظیر۔ مہابھارت۔ زہری سانپ۔ فریب محبت۔ رامائن۔ گورکھ دھندا۔ پتنی پرتاب۔ کرشن سداما ان کے مشہور ڈرامے تھے۔ قتل بے نظیر ان کا سب سے پہلا اور بہت مقبول ڈرامہ ہے۔

بیتاب ڈرامہ نویسی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مہابھارت میں انہوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے دلچسپ واقعات نہایت عمدگی سے دکھائے ہیں۔ ان کے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیریں ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات عمیق اور کیرکٹر زبردست ہیں اور وہ اُصول ڈرامہ نگاری کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے تماشوں کی شُہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ حسین ترین مشہور عورتیں ان میں کام کرتی تھیں۔

اعتراضات | (۱) دروپدی کا سری کرشن کی خون آلود اُنگلی کے لئے اپنی ساڑھی پھاڑنا خلاف تہذیب ہے۔ لیکن یہ عمل محبت اور اعتقاد کا بھی ثبوت ہوسکتا ہے۔

(۲) جنت اور دوزخ نہایت بھونڈے طریقے سے دکھائے ہیں۔

(۳) نثر مقفیٰ کی بہتات ہے۔ جو بعض وقت پر بُری معلوم ہوتی ہے۔

(۴) ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی بکثرت ہیں۔ جو کانوں پر گراں گذرتے ہیں۔

(۵) اشعار کا استعمال بہت ہے۔ مثلاً غصے کے وقت شعر پڑھنا خلاف فطرت انسانی معلوم ہوتا ہے۔

(۶) بعض ایسی باتیں لکھ دی ہیں۔ جو سناتن دھرمیوں کو ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ آریہ کمپنی کے ملازم تھے۔

نیو الفرڈ کمپنی | یہ کمپنی محمد علی ناخدا نے کھولی۔ مشہور کامک ایکٹر سہراب جی اس کے منیجر تھے۔

جو بعد میں حصہ دار بھی ہو گئے تھے۔ یہ کمپنی ادھر اُدھر پھر کر احمد آباد میں مقیم ہو گئی۔ عباس علی جو بعد میں جوبلی کمپنی میں چلے گئے۔ اور امرت لال کیشو اس کے مشہور ایکٹر تھے۔ امرت لال کا مس گوہر سے تعلق ہو گیا تھا۔ یہ دونو پارسی ناٹک منڈلی مملوکہ فرام جی میں چلے گئے اور امرت لال اس کمپنی کے منیجر ہو گئے۔ اور انہوں نے چند آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈرامہ امرت نکالا ان کا انتقال اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہوا تھا۔

آغا حشر کاشمیری آغا حشر کشمیری الاصل ہیں۔ ان کا خاندان بنارس میں شالوں کی تجارت کرتا ہے۔ حشر امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بہت سے ڈرامے نیو الفرڈ کے لئے تصنیف اور ترجمہ کئے۔ اس کمپنی سے قطع تعلق کے بعد انہوں نے اپنی شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔ جو نقصان اُٹھا کر سیالکوٹ میں بند ہو گئی۔ اس کے بعد حشر کلکتہ میں میڈن کے ہاں معقول تنخواہ پر فلم ایکٹر ہو گئے۔ وہ اس کے لئے آخر تک کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں۔ شہید ناز۔ مرید شک۔ اسیر حرص۔ ترکی حور۔ خوبصورت بلا۔ سفید خون وغیرہ اُردو ڈرامے اور سور داس۔ سیتا بن باس۔ گنگا ترن ان کے ہندی ڈرامے بہت مشہور ہیں۔

آغا حشر کو لوگ اُردو کا مارلو کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں مارلو کی خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے کیریکٹروں میں جذبات بہت کثرت سے دکھاتے ہیں۔ اور نثر و نظم دونوں کے اُستاد ہیں۔ ان کا انداز بیان اس جگہ خوب معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دو مخالف کیریکٹروں کا مکالمہ کراتے ہیں۔

آغا حشر کے ہاں عیب بھی وہی ہیں۔ جو مارلو کے ہاں ہیں۔ یعنی جذبات کی بہت شدت ہوتی ہے۔ رنگوں میں تال میل کا خیال نہیں رکھتے۔ ڈرامے میں دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں۔ جن سے توجہ منتشر ہو جاتی ہے۔ اور خاتمہ میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر جگہ شعر کو ایکٹ پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو اُصول ڈراما کے خلاف ہے۔ کبھی کبھی بازاری مذاق

بھی شامل کر لیتے ہیں۔ جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے۔ بعض اوقات واقعات میں بیجا عجلت کھیل بگاڑ دیتی ہے۔ مگر باوجود ان تمام عیوب کے وہ ہندوستان کے بہترین ڈرامانگار تھے۔ تاریخ وفات ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء

دوسری کمپنیاں | (۱) اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ گذشتہ صدی کے آخر میں قائم ہوئی۔ اور ۱۹۰۱ء میں لاہور میں جل گئی۔ مگر اپنے مالک آردشیر جی کی بدولت پھر قائم ہو گئی۔

(۲) جوبلی کمپنی دہلی کو دہلی کے کسی امیر شخص نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام قائم کیا تھا۔ عباس علی گلرو زرینہ اور جام جہاں نما میں پارٹ کرتے تھے۔

(۳) بھارت دیاکل کمپنی میرٹھ۔ اس میں بدھ بھگوان کا ڈرامہ خوب ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصے بعد احمد آباد میں ٹوٹ گئی۔

(۴) لائٹ آف انڈیا اور

(۵) امپیریل کمپنی ان میں حافظ محمد عبد اللہ اور مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی کام کرتے تھے۔ جشن پرستان۔ انجام ستم۔ ستم ہامان وغیرہ حافظ صاحب نے لکھے۔ مرزا نظیر بیگ نے نلدمن۔ بہار عشق۔ فسانۂ عجائب۔ ماہی گیر وغیرہ تصنیف کئے۔

آخر انیسویں صدی کے مشہور ڈرامانویس | مذکورہ بالا ڈرامانویسوں کے علاوہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں ذیل کے مصنفین کے مذکورہ ناول موجود ہیں۔ غلام حسین ظریف کا انجام سخاوت (۱۸۸۹ء) محمد عبد الوحید قیس کے انجام نیک و بد اور جلسہ پرستان۔ فقیر محمد تیغ کے انجام اُلفت اور بے نظیر و بدر منیر۔ فیروز شاہ خاں کا بھول بھلیاں۔ احمد حسین وافر کا بلبل بیمار۔ میر کرامت اللہ میر۔ عبد الماجد و مقصود علی۔ امراؤ علی کا البرٹ بل (اردو کا سب سے پہلا سیاسی ڈراما) اور جہانگیر ترجمۂ ہیملٹ۔

شروع بیسویں صدی کے بعض ڈرامانویس | (۱) منشی غلام علی دیوانہ مصنف تائید یزدانی۔ مہر جیا الگزنڈر کمپنی میں ہیں۔
(۲) منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی شاگرد آغا حشر۔ آتشیں ناگ۔ نگاہ ناز اور خود پرست کے مصنف ہیں۔

(۳) منشی رحمت علی مصنّف دردِ جگر۔ باوفا قاتل پہلے البرٹ کمپنی کے مینجر تھے۔ اب پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں۔

(۴) دوارکا پرشاد اُفق رام ناٹک جیسے مشہور ڈرامے کے مصنّف ہیں۔

(۵) مرزا عباس مصنّف نورجہاں و شاہی فرمان۔

(۶) آغا شاعر دہلوی مصنّف حورِ جنّت۔

(۷) لالہ کشن چند زیبا اور

(۸) لالہ نانک چند ناز۔ یہ دونوں پنجابی بھائی اکثر ڈراموں کے مصنّف ہیں۔ جن میں غیر مانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔

(۹) لالہ کنور سین ایم۔ اے چیف جسٹس ہائی کورٹ کشمیر سابق پرنسپل لا کالج لاہور ڈراما کے مشہور نقاد اور برہمانڈ ناٹک کے مصنّف ہیں۔ جس میں آسمانی ستاروں کے کیریکٹر دکھائے ہیں۔

(۱۰) بشمبر سہائے بیاکل مصنّف بدھ دیو یہ مشہور ڈراما ان عیبوں سے پاک ہے۔ جو اُردو ڈراموں میں پائے جاتے ہیں۔ مصنّف مذکور بھارت بیاکل کمپنی کے رُوحِ رواں تھے جو میرٹھ میں قائم ہوئی تھی۔ ایک زمانہ میں وہ شمالی ہند میں بہت مشہور تھی۔ اس کے ایکٹر اکثر پڑھے لکھے اور اعلےٰ طبقے کے تھے۔ علی اظہر اس کے مشہور ایکٹر تھے۔ منشی جانیشر پرشاد مائل دہلوی ایڈیٹر رسالہ زبان نے چندر گپت اور تیغ ستم اس کمپنی کے لئے لکھے تھے۔

(۱۱) حکیم احمد شجاع بی۔ اے اسسٹنٹ سکرٹری لیجسلیٹو کونسل پنجاب نے باپ کا گناہ۔ بھارت کا لال۔ جانباز وغیرہ لکھے۔ لیکن وہ سٹیج پر اچھے معلوم نہیں ہوتے۔

(۱۲) سیّد امتیاز علی بی۔ اے مصنّف انارکلی و دُلہن وغیرہ۔

(۱۳) سیّد دلاور علی شاہ مصنّف پنجاب میل۔ یہ معمولی ڈرامہ ہے۔

(۱۴) احمد حسین خاں مُصنّف حُسن کا بازار۔

(۱۵) رادھے شام اکثر مذہبی ڈرامے لکھتے ہیں۔

(۱۶) سدرشن بہت سے ڈراموں کے مصنف ہیں۔

ادبی ڈرامے | اردو میں ادبی ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ لیکن پھر بھی حسب ذیل ڈرامے قابل ذکر ہیں۔ میکفرسن ولوسی۔ اور قاسم وزہرہ مؤلفہ شوق قدوائی۔ شہید وفا مصنفہ شرر۔ وکرم اروسی مترجمہ عزیز مرزا۔ روس وجاپان مؤلفہ مولانا ظفر علیخان۔ تسخیر فرانس اور جولیس سیزر (شیکسپیر) مترجمہ سید تفضل حسین نصیر۔ معشوقہ فرنگ مترجمہ جوالا پرشاد برق۔ بیداری مؤلفہ حکیم اظہر ایڈیٹر تحریک۔ محمد عمر نور الہٰی صاحبان نے ناٹک ساگر میں تمام ملکوں کے ڈرامے کی تاریخ لکھی ہے جو کسی قدر نامکمل ہے۔ ذیل کے دلچسپ ڈرامے ان کی تصنیف ہیں:۔

(۱) روح سیاست (ابراہیم لنکن پریسیڈنٹ امریکہ کے حالات)

(۲) جان ظرافت (ترجمہ مولیر) اس میں کنجوسوں کا خوب خاکہ اڑایا ہے۔

(۳) قزاق (ترجمہ شلر)

(۴) بگڑے دل (ترجمہ مولیر)

(۵) ظفر کی موت (ترجمہ میٹرلنک)

سوشل ڈرامے | (۱) زود پشیمان مصنفہ عبدالماجد دریا آبادی۔ اس میں کم عمری کی شادیوں کی قباحتیں دکھائی ہیں۔

(۲) راج دلاری اور مراری دادا مصنفہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ایم۔ اے یہ ڈرامے اصلاح معاشرت کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان میں مرد عورتوں کے صحیح خیالات اور ان کی کمزوریاں نہایت خوبی سے دکھائی ہیں۔

(۳) میوۂ تلخ مصنفہ شرر اس میں پردے کی سختی کی خرابیوں کو نہایت عمدگی سے دکھایا ہے۔ موجودہ زمانے میں معاشرتی مسائل پر اکثر ڈرامے لکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے اکثر میں مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا جاتا ہے۔

سیاسی ڈرامے

سیاسی ڈراما سب سے پہلے منشی امراؤ علی نے البرٹ بل (۱۸۹۳ء) پر لکھا تھا اور ایک اور ڈرامے میں کانگریس کے مقاصد کو دکھایا تھا۔ ان میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ترک موالات کے زمانے میں بہت سے سیاسی ڈرامے لکھے گئے۔ جن میں سے اکثر ممنوع قرار دیئے گئے۔ ان میں منشی کشن چند زیبا کا زخمی پنجاب خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اُردو ڈرامے کی ترقی میں مختلف لوگوں نے کیا حصّہ لیا

اُردو ڈرامے کی بنیاد اندر سبھا سے پڑی تھی۔ مگر اس میں پلاٹ کی تقسیم اور کیریکٹر کی تنظیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈرامے کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے اپنے ڈرامے محض دلچسپی اور تفریح کے لئے لکھے تھے۔ اور اس مقصد میں وہ پورے کامیاب تھے۔ ان کے پلاٹ کیریکٹر نظم نثر سب ادبی حیثیت سے بے وقعت ہیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ڈرامے کی ترقی اور اشاعت میں بہت کوشش کی۔

حافظ عبداللہ اور نظیر بیگ نے ظریف کی پیروی میں اپنے تماشوں میں دو دو پلاٹ الگ الگ قائم کئے۔ طالب اور احسن نے ڈرامے کی زبان کو درست کیا۔ اور دونو پلاٹوں کو ایک کر دیا۔ اور اسی میں بعض کیریکٹروں سے مسخرے کا کام لیا۔ معمولی گفتگو مقفّٰی نثر میں ہوتی تھی۔ گفتگو کو زور دار کرنے کے لئے شعر بھی استعمال ہوتے تھے۔ اور گیت زیادہ تر ہندی میں تھے۔ اب ڈراما میں کیریکٹر سازی۔ جذبات نمائی اور اختتام قصّہ پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ گویا اب ڈراما اُپیرا کی حد سے نکل کر ڈرامے کی شکل میں آ گیا۔

طالب نے سب سے پہلے ہندی الفاظ کی جگہ فارسی الفاظ استعمال کئے۔ حشر نے پھر وہی دو پلاٹوں کی طرز اختیار کر لی۔ بیتاب کے ڈرامے بہترین کہے جا سکتے ہیں ان کے نقائص کو بشمبر سہائے نے اپنے ڈراما بدھ دیو میں دور کیا۔ ان کی زبان میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔ خیالات پاکیزہ اور انداز بیان دلکش ہے۔ مسٹر کنور سین نے

برہما نڈ ناٹک میں ستاروں کے کیریکٹر دکھائے۔ کیفی نے سوشل مضامین پر ڈرامے لکھے اب سیاسی ڈراموں کا بھی رواج ہو رہا ہے۔ یہ زیادہ تر بنگالی ناٹکوں کے ترجمے ہیں۔ اور ہندوستانی تاریخ بھی بہت کچھ مواد فراہم کر رہی ہے۔

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ بدھ مت کے ساتھ سنسکرت ڈراما بھی زوال میں آ چکا تھا۔ اس کے علاوہ سنسکرت کے ناٹکوں کے جو ترجمے انگریزی میں ولیم پروفیسر ولسن اور مونیر ولیمس وغیرہ نے کئے تھے۔ وہ انگریزی سے ناواقفیت کے باعث اُردو جاننے والوں کے لئے بیکار تھے۔ اس لئے سکسینا صاحب کے نزدیک یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کہ اُردو ڈرامہ کا صحیح وجود اسوقت ہُوا۔ جب اہل مغرب کا اثر اس مُلک پر ہونے لگا۔ اس کے بعد سنسکرت کے انگریزی ترجموں سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ لیکن ان کے اس بیان سے بہت سے محققین کو اتفاق نہیں۔ گذشتہ صفحوں میں مجملاً اس پر بحث ہو چکی ہے۔

ابتدائی ڈراموں کے نقائص ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ تھیٹریکل کمپنیاں شروع میں پارسیوں نے کاروباری حیثیت سے جاری کی تھیں۔ اسوقت تماشے کی عمدگی کا خیال کسی کو نہیں تھا کسی پُرانے قصے یا افسانے کو توڑ مروڑ کر کچھ اشعار اور مذاق کی باتیں شامل کر کے ڈراما بنا لیا جاتا تھا۔ ڈرامانگار بھی کچھ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ وہ عام طور پر اونٰے درجے کے ایکٹر ہی تھے۔ جو عوام کے مذاق کو دیکھ کر تک بندی کر لیتے تھے۔ اس لئے ڈراموں کی عبارت پھس پھسی تھی۔ اشخاص ڈراما بجائے نثر کے ادنےٰ درجے کی نظم میں باتیں کرتے تھے۔ پلاٹ اور کیریکٹر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ ایکشن بالکل ناہموار ہوتا تھا۔ اور ٹریجڈی اور کومیڈی یعنی مذاحیہ اور المیہ یک جا کر دیا جاتا تھا۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی عام طور پر تمام ڈرامے گرے ہوئے ہوتے تھے۔ عورتیں زیادہ تر رنڈیاں ہوتی تھیں۔ اور ناممکن الوقوع باتیں اکثر بے تکلف دکھا دی جاتی تھیں۔ غرض اسوقت ڈراما بہت ہی ابتدائی حالت میں تھا۔

LIBRARY

کچھ عرصے بعد انگریزی ڈراموں کی طرف لوگ متوجہ ہوئے اور شیکسپیئر کے ڈرامے خاص طور پر پسند کئے جانے لگے۔ ان کی مقبولیت اس قدر بڑھی کہ ایک ڈرامے کے چار چار پانچ پانچ ترجمے ہو گئے۔ ان میں انگریزی ناموں کی جگہ ہندوستان کے نام ڈال دیئے جاتے تھے لیکن انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اکثر ترجمے بالکل غلط ہوتے تھے۔

مسٹر عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں۔ کہ اُردو ڈرامے نے انگریزی ڈرامہ کی اندھادھند تقلید کی۔ چنانچہ انگریزی ڈراموں کی طرح وہ بھی پُرانے رسم و رواج پر بڑی بیباکی سے کاری ضرب لگانے لگا۔ اس تقلید کی وجہ سے انگریزی دُھنیں اُردو میں آ گئیں۔ جو بُری معلوم ہوتی تھیں۔ اور اس سے ہندوستانی موسیقی کو سخت نقصان پہنچا۔

انگریزی اثر کے علاوہ ایکٹروں کا غیر تعلیم یافتہ ہونا اور ادنیٰ درجے سے تعلق رکھنا۔ ڈرامہ نویسوں کی معمولی لیاقت۔ تماشائیوں کا اچھے بُرے میں امتیاز نہ کرنا۔ اور تھیٹر کے مالکوں کو انہی کو خوش کرنا جن سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ وغیرہ یہ تمام باتیں اُردو ڈرامہ کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوئیں ۔

موجودہ ڈراموں میں اصلاح اور ترقی

موجودہ زمانہ میں اُردو ڈراما بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ پُرانے قصّوں کے علاوہ اب نہایت دلچسپ اور نئے قصے سٹیج پر آ رہے ہیں۔ پولٹیکل اور سوشل ڈراما بھی ترقی کر رہا ہے۔ ڈراموں کی اخلاق آموزی میں نمایاں فرق ہے۔ نفسیات کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ غرض ڈرامے میں بحیثیت مجموعی پہلا سا بےتکا پن نہیں رہا۔ خیالات الفاظ۔ نظم۔ نثر۔ گیت۔ ابتدا۔ انجام۔ کلامک۔ تنظیم اور تقسیم وغیرہ میں معتدبہ ترقی ہو رہی ہے۔ اب جدید اور قدیم ڈراموں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے ۔

ڈراموں میں اصلاح اور ترقی کی ضرورت

ان تمام ترقیوں کے باوجود ابھی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔ مثلاً الفاظ میں بجائے ڈھینگ کے معنویت اور اصلیت ہونی چاہئے۔ عام طور پر ڈراموں میں مقفّٰی عبارت ہوتی ہے۔ اس کی جگہ اب صاف اور سلیس عبارت کو ملنی چاہئے۔ پلاٹ کی

ترتیب اور تنظیم میں بھی ابھی بہت کچھ اصلاح کی گنجائش ہے۔ مذاق نہایت پاکیزہ اور شائستہ ہونا چاہیئے۔ ڈرامانویسی نااہلوں کے ہاتھ میں خراب ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے۔ کہ وہی لوگ ڈرامے لکھیں۔ جو اس کام کے واقعی اہل ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی ہر طرح ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ ایسے ڈرامے دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے چاہئیں۔ جو ڈرامے کا صحیح معیار قائم کریں۔ پرانے سنسکرت کے اعلےٰ ڈراموں کو ترجمہ کیا جائے۔ جن سے گذشتہ زمانے کی ڈرامانویسی کی حقیقت معلوم ہو۔ کیونکہ ایک زمانہ میں سنسکرت ڈراما ہندوستان میں ترقی کے بلندترین مدارج طے کر گیا تھا۔ دوسری زبان کے ڈراموں سے ہم کو وہی چیزیں اخذ کرنی چاہئیں جو ہماری سوسائٹی سے میل کھائیں۔ اور یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ ترجموں کی بہتات سے طبع زاد تصانیف کو نقصان نہ پہنچے۔ زمانۂ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے دلچسپ سوشل ڈرامے تصنیف کئے جائیں۔ اور ان کا مواد اپنی سوسائٹی سے اخذ کیا جائے۔ اس فن کو اور ایکٹروں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ اور رسماً اور مذہباً نکتہ چینی نہ کی جائے۔ امیر لوگ اس فن کی سرپرستی کریں۔ سیکسینا صاحب کا یہ خیال عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ "کہ ڈرامے کی بعض ذلیل باتیں رسم پردہ اُٹھنے پر دُور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ موجودہ صورت میں سچے جذبات عشق کا اظہار ناممکن ہے"۔

اُردو ڈراما کا مستقبل مسٹر عبداللہ یوسف علی فرماتے ہیں۔ اُردو ڈراما بہت زوردار ترقی کے آثار پیدا کر چکا ہے۔ اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا نظر آتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تاریخی اور سیاسی ڈرامہ نگاری کی بہت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کیونکہ اسی میں ڈرامے کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ڈرامے کی ترقی کے لئے وہ تجویز کرتے ہیں۔ کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کی تقلید کرو۔ کیونکہ انہی کی تقلید سے اُردو ڈراما کا عروج ممکن ہے۔

باب ۱۹

زبان اُردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق قیمتی رائیں

اُردو فصیح اور شیریں زبان ہے اس پر سب کو اتفاق ہے۔ کہ اُردو نہایت فصیح بلیغ اور شیریں زبان ہے اس میں خیالات اور حسیات کے نازک ترین فرق کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس میں دُنیا بھر کی زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہیں۔ اس لئے دوسری زبانوں کا ذریعۂ تعلیم بننے کی قابلیت ہے۔ اور یہ زبان ادب تمدن اور تہذیب کی ضروریات کو نہایت موزونیت اور عمدگی سے پورا کر سکتی ہے ؎

ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے ہندو مسلمانوں نے اپنی قومی زبانوں کو چھوڑ کر اس زبان کو اختیار کیا ہے۔ اس لئے یہ اتحاد کا بہترین عملی ثبوت ہے ؎

ہندوستان کی عام زبان ہے اُردو صحیح معنوں میں تمام ہندوستان کی زبان ہے۔ اکثر علاقوں میں جہاں اُردو نہیں بولی جاتی وہاں سمجھی ضرور جاتی ہے۔ ہندوستان کی کسی اور زبان میں یہ خصوصیت نہیں۔ بلکہ اکثر غیر ممالک میں بھی اُردو کو لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے اُردو کو ہندوستان کی "لنگوا فرانیکا" کہنا بیجا نہیں ؎

ایک وسیع زبان ہے اُردو ایک نہایت وسیع زبان ہے۔ اس میں بے شمار زبانوں کے الفاظ بکثرت شامل ہیں۔ جن سے نئے الفاظ اور محاورات و اصطلاحات بنانے میں آسانی ہوگئی ہے۔ اور آئے دن مناسب تغیر اور تبدل کے بعد دوسری زبانوں کے الفاظ اسمیں شامل ہو رہے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ آجکل عربی سے زیادہ الفاظ لئے جا رہے ہیں۔ جس سے زبان غیر مطبوع ہو جاتی ہے۔ لیکن یہی الزام سنسکرت اور ہندی دانوں پر بھی عائد ہوتا ہے ؎

یوربین محققین کی رائیں (۱) جے بیمس مصنف "انڈین فلالوجی" کی رائے "اردو ایک وسیع فصیح معنی خیز اور جامع زبان ہے وہ نہایت ترقی کرنیوالی ہے اور شائستہ صورت اس وسیع زبان کی ہے جو ہندوستان میں رائج ہے
(ماخوذ از جنرل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳۵ ۱۸۶۶ء)

(۲) گارسن ڈی ٹاسی مشہور فرنچ مستشرق کی رائے میں اردو ہندوستان میں اسی طرح بکثرت استعمال میں آتی ہے جس طرح یورپ میں فرنچ۔ ہندوستان کی عدالتوں میں علمی ادبی تصانیف میں راگ راگنیوں میں اور عام گفتگو میں اردو ہی کام آتی ہے۔ اہل یورپ سے بھی گفتگو اسی میں کی جاتی ہے۔ بعض کا خیال ہے۔ اردو کو ہر مقام کے ہندو نہیں سمجھ سکتے۔ مگر یہی حالت ہر ملک میں ہر زبان کی ہے۔ اردو کو عدالتوں اور دفتروں سے نکالنے کے لئے یہ وجہ معقول معلوم نہیں ہوتی۔

(۳) جارج کیمبل مصنف "انڈیا ایز اٹ مائٹ بی" لکھتے ہیں "میرے نزدیک نہایت ہی مناسب ہے کہ ہندوستانی کو تمام سکولوں کی زبان قرار دیا جائے کیونکہ عام زبان کے بغیر کام چلنا مشکل ہے۔ اور انگریزی کو ہندوستان کی عام زبان بنانا محال ہے۔ اردو ہندوستان بھر کی زبان کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ کیونکہ تمام ہندوستانی اور انگریز اسکو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اسمیں خاص خوبی یہ ہے۔ کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بہ آسانی اپنے میں اسطرح جذب کرلیتی ہے۔ کہ پھر اسی کے اپنے معلوم ہونے لگتے ہیں"

(۴) مسٹر ونسنٹ سمتھ مصنف ہسٹری آف انڈیا لکھتے ہیں "اردو زبان انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی قواعد صرف ونحو کی نرمی اور کثرت الفاظ کے بہت مشابہ ہے۔ اور ضرور اس قابل ہے۔ کہ تمام مطالب عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹفک، اس میں ادا کئے جائیں"۔

اردو کی نام نہاد کم مائگی عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ اردو کے پاس نہ تو کوئی قابل فخر سرمایۂ ادب ہے۔ اور نہ اسکی ترقی اور ارتقا کی کوئی خاص تاریخ ہے۔ جب اسکا مقابلہ کلاسیکل (قدیم) اور متمدن مغربی زبانوں سے کیا جاتا ہے۔ تو اس کی بے مائگی اور بے حقیقتی پوری طرح معلوم ہوجاتی ہے۔

ان اعتراضات کے یہ جواب ہوسکتے ہیں۔ کہ اردو کوئی قدیم چیز نہیں۔ کسی جدید ادب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم زبانوں کی طرح ادبی خزانوں سے مالامال ہو۔ خلاف عقل ہے۔ اسکی ادبی زندگی فارسی سے الگ ہوکر بہت کم گذری ہے۔ بدقسمتی سے یوربین محقق اسکی طرف کم متوجہ ہوئے ہیں۔ اور ہندوستانی ان سے بھی کم۔

اگر اُردو کی یہی رفتار رہی تو تھوڑے عرصے میں وہ دُنیا کی بہترین زبانوں سے مقابلہ کر سکے گی۔ اور اب بھی ہندوستان میں کوئی اور زبان اس کی مدمقابل نہیں ⁂

اقسام ادب اُردو ادب دو قسموں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم ⁂

(۱) مستقل تصانیف مستقل تصانیف نظم و نثر ناول اور ڈرامہ پر مشتمل ہیں۔ نظم اُردو کی بہت سی قسمیں ہیں جو نہایت ہی پُرلطف ہیں۔ اس میں پند و نصائح۔ اخلاق۔ حسن و عشق کے افسانے۔ مرثیے حمد و نعت بادشاہوں اور رئیسوں وغیرہ کی مدح اور ذم۔ زمانۂ حال کی نیچرل نظمیں غرض دُنیا زمانے کے مضامین شامل ہیں۔ زمانہ ماضی اور حال کے شعرا میں میر۔ سودا۔ درد۔ ناسخ۔ آتش۔ مومن۔ ذوق۔ غالب امیر۔ داغ۔ حالی۔ اقبال۔ حسرت اور اکبر وغیرہ کے منظومات نہایت کیف آور ہیں۔

نثاروں میں مرزا رجب علی بیگ سرور۔ سرسید۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا شبلی۔ مولانا آزاد۔ منشی ذکاءاللہ اور مولانا حالی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈرامہ نویسی اور ناول نگاری میں سرشار۔ شرر۔ رسوا۔ راشد الخیری اور منشی پریم چند کے اسمائے گرامی مشہور ہیں ⁂

(۲) تراجم دُنیا کی بہترین نظم و نثر کی کتابیں روزانہ اُردو میں ترجمہ ہو رہی ہیں۔ جس سے اُردو کا سرمایہ بہت بڑھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ذیل کے نام پیش کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی کتابوں میں مہابھارت۔ رامائن۔ شکنتلا۔ میگھ دوت۔ وکرم اروسی۔ رتوسنگھار۔ ٹیگور کی کتابیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شیکسپیئر کے بہت سے ڈرامے۔ شیریڈن۔ ڈینٹی، گوئٹے۔ لانگ فیلو۔ سودے۔ شیلی۔ بائرن۔ ورڈز ورتھ اور ٹینی سن کی مشہور نظمیں اُردو کا جامہ پہن چکی ہیں۔ افسانوں اور ناولوں میں رینالڈز۔ سکاٹ۔ میری کاریلی۔ اور کانن ڈائل کے ترجمے بہت مقبول ہیں۔ تھوڑے عرصے سے سٹیونسن۔ رائڈر ہیگرڈ۔ آسکر وائلڈ۔ برنارڈ شا۔ اور ایچ جی ویلس کو بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں۔ نثاروں میں مکالے۔ کارلائل۔ سمائیلس اور لیک کی تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات میں افلاطون اور ارسطو کی اکثر کتابیں۔ چانکیا کے اقوال سنیکا کے فلسفیانہ خیالات۔ برکلے کے مکالات۔ بیکن۔ ہیوم۔ کینٹ۔ مل۔ سپنسر۔ جیمس۔ سٹاؤٹ کی اکثر تصانیف اُردو میں آ چکی ہیں۔

تاریخ اور سوانحمریوں میں پلوٹارک کی یونانیوں اور رومیوں کی مشہور کتابیں راسن ۔ بیری ۔ ڈوزی ۔ الیس ایبٹ ۔ گرین ۔ ونسنٹ سمتھ ۔ الفنسٹن ۔ مالکم ۔ گبن وغیرہ کی مشہور کتابوں کے ترجمے اردو میں موجود ہیں ۔

سیاسیات اور معاشیات میں ۔ ارسطو ۔ مل ۔ بیل ۔ مورلی ۔ لارڈ کرزن ۔ مزینی ۔ شوسٹر ۔ بلنٹ ۔ سیلی ۔ ولسن ۔ پالک ۔ سجوک ۔ جیونس ۔ مارشل ۔ ماری سن وغیرہ کی تصانیف کے تراجم قابل ذکر ہیں ۔ فلسفیانہ تاریخوں میں گینرو ۔ بکل ۔ لیبان ۔ لیکی ۔ ڈریپر کی کتابیں ترجمہ ہوگئی ہیں ۔ فلسفہ تعلیم میں اسپنسر ۔ بین ۔ فروبیل ۔ پسٹالوزی ۔ ہربرٹ ۔ مانٹی سوری کی کتابیں اور سائنس میں ڈریپر ۔ ڈارون ۔ ہیکل ۔ ہکسلی ۔ لائل ۔ گیکی ۔ ٹنڈل ۔ بوسی ۔ کیلون ۔ میکسول ۔ کروک اور سر آلیور لاج کی جدید تحقیقات اردو میں آچکی ہیں ۔ اور قانون اور طب کی کتابیں بھی حسب ضرورت ترجمہ ہو رہی ہیں ۔

مذہبی لٹریچر اہل عرب اور فارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت اور ہندی کا ایک معتدبہ حصّہ ترجمہ ہوگیا ہے ۔ مذہبی کتابوں میں قرآن ۔ گیتا ۔ پران ۔ مہابھارت اور رامائن کے بے شمار ترجمے ہو چکے ہیں ۔ اسی طرح ہر مذہب کے اکابروں اور بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے مفصّل حالات بھی اردو میں آرہے ہیں ۔

ادب اردو کے سرچشمے یوں تو ہندستان میں سینکڑوں انجمنیں اردو ادب کی ترقی اور اشاعت کیلئے قائم ہیں ۔ لیکن (۱) عثمانیہ یونیورسٹی اور اسکا دار الترجمہ (۲) انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن اور (۳) دار المصنفین اعظم گرھ وغیرہ ادب اردو کے قابل فخر سرچشمے ہیں ۔

ہندوستانی اکیڈیمی قائم شدہ ۱۹۲۷ء گورنمنٹ ممالک متحدہ نے اپنے صوبے میں ایک ہندوستانی اکیڈیمی قائم کی ہے ۔ تاکہ اردو اور ہندی کو خوب ترقی کا موقعہ مل سکے ۔ اسکے خاص مقاصد حسب ذیل ہیں :-

(۱) مفید مضامین پر بہترین کتابوں کے لئے مقابلے کے انعامات تجویز کرنا ۔

(۲) مفید اور اردو ہندی کتابوں کے ترجمے اپنے تنخواہ دار مترجموں سے کرانا اور ان کو اپنی طرف سے چھپوانا ۔

(۳) اردو ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے لئے ۔ انجمنوں ۔ یونیورسٹیوں یا مستحق اشخاص کو مالی امداد دینا ۔

(۴) قابل اہل قلم کو اکیڈیمی کی اعزازی ممبری کے لئے منتخب کرنا۔

اکیڈیمی کے موجودہ نظام میں ایک کونسل اور ایگزیکٹو کمیٹی کا دخل ہے۔ لیکن اصلی اختیارات فیلوز کے ہاتھ میں رہینگے۔ جن کا انتخاب کونسل میں سے ہُوا کریگا۔ کونسل میں بالفعل ایک پریسیڈنٹ۔ چھ اکس آفیشیو ممبر۔ اور تیس معمولی ممبر (سکرٹری سمیت) شامل ہیں۔ ان کو شروع میں گورنمنٹ نے نامزد کیا تھا۔ گورنمنٹ نے ابتدا میں پچیس ہزار روپیہ امداد کے لئے دیا تھا۔ اور سر تیج بہادر سپرو کو اکیڈیمی کا پریسیڈنٹ اور ڈاکٹر تاراچند۔ پی۔ ایچ ڈی کو سکرٹری مقرر کیا تھا۔

ہندوستانی اکیڈیمی کا قیام سر ولیم میرس گورنر ممالک متحدہ کی ادبی دلچسپی کی بدولت عمل میں آیا۔ اور وزیر تعلیم رائے راجیشوربلی صاحب اور منشی دیانرائن نگم نے اس سکیم کو بہت جانفشانی سے تیار کیا۔ یہ اکیڈیمی اپنے سامنے درخشندہ مستقبل رکھتی ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ اور بہت قابل حضرات اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

اُردو کا رسم الخط اورنگ آباد اور حیدر آباد دکن وغیرہ میں اُردو کے رسم الخط کی صلاح کے لئے ایک مدت سے بڑی بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس غرض سے اکثر کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ سُنا جاتا ہے۔ کہ ترمیم شدہ رسم الخط نو آموزوں کے لئے مشکل اور پریشان کن ہے کیونکہ اس سے غلط پڑھنے اور غلط لکھنے کا بہت احتمال ہے۔ اگرچہ ابھی تک کوئی تجویز عمل میں نہیں آئی۔ لیکن اُمید کی جاتی ہے کہ ماہرین کی توجہ ایک نہ ایک دن موجودہ رسم الخط کی خرابیوں کو ضرور رفع کر دے گی۔

نوٹ۔ (۱) اس باب کا مضمون زیادہ تر مولوی عبدالمجید کے اس مضمون سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو ماڈرن ریویو میں چھپا تھا۔